

دل کے راز تحریر کریں • زندگی کی تصویریں

سرائی

سچی کہانیاں

MAY
2012

اندرونی صفحات پر



شہنشاہ جذبات محمد علی

اس شمارے میں

☆ زندہ کہانی: آپ بیٹیاں، جگ بیٹیاں، جیتی جاگتی کہانیاں

☆ ”آتش جیوں“ سلیم فاروقی کے قلم سے

☆ ”مسلمہ یہ“ قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

7
تقدیر
منزہ سہام

29
شبشاہ جذبات
راجہ محمود

46
انکارے بے پھول
رضوان فیوم

77
شہید کی ڈائری
منزہ سہام

83
ایک ٹیس سی ہے شچی
حنّا بشری

95
نخعہ کیا
صدف اصف

109
گردش رنگ چمن
حنیف سحر

9
احوال
منزہ سہام

43
داغدار چہرے.....
ذہنا نسیم

65
آگ کا دریا
جیجیل سیتلو

79
کیا وہاں تھی؟
نہیسہ فضل

88
صراطِ مستقیم
سمیرہ غزالہ شاہ

103
سفر حیات کٹا
لکھن اندرین

121
کارالبیس آسان ہوا
محمد فیوم

130
میری مہریاں.....
مستار احمد

137
وہ ایک نشان
صناب خان

147
انہ سے بہرے لوگ
اروم فہرہ

160
آجالوں کا سفر
رخسانہ سہام سوزا

175
آپ کی ڈائری
قارنہین

191
خیال آرائی
قارنہین

199
ہندیا بی اپنی
قارنہین

221
تاشون
شازلی سعیدہ مغل

144
چالیں دن بھر
منصورین رانا

157
انسان نہیں دہرے
اقبال زمان

167
زندگی گھبراہوں میں
اندور قوسداد

183
مسک رہے
اشادہ

195
کتاب تہمرہ
عکاشہ سحر

202
جن آنکھوں میں
فاطمہ بلکراسی

234
آتش جوں
سلیم فاروقی

258
بازگشت
سہام سوزا



تقدیر

ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ہم بالکل اُن جیسے ہی ہو جاتے ہیں..... آپ کے ارد گرد بھی اکثر ایسے لوگ ہوں گے جو اب بالکل اپنے بڑوں کا پُرتو محسوس ہوتے ہوں گے۔ اصل میں ہماری محبت ہمیں اپنے والدین جیسا بنا دیتی ہے۔ میرے والد بہت اچھی بات کہا کرتے تھے۔

وہ کہتے تھے۔ ”برائی کو کبھی برائی کی طرح مت لو بلکہ اس میں سے بھی مثبت پہلو نکالو۔“

جب انسان کی موجدِ مثبت ہوتی ہے تب سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہم سب کا المیہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے بارے میں سوچتے ہی نہیں..... اگر ہر شخص صرف اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دے تو برسوں کی بگڑی تقدیر دنوں میں تبدیل ہو جائے گی!!

منزہ سہام

اور اب؟ آپ کا..... پچی کہانیاں

ماہ جون 2012ء سے ایک نئے انداز، نئی ترتیب اور کچھ نئے سلسلوں کے ساتھ آپ کی نگاہوں کا مہمان ہوگا۔

نئے سلسلے

✱ سڈک کہانی..... اُن لوگوں کی کہانیاں جن کی زندگی سڑکوں پر سانس لینے لگتی ہے.....
✱ اِس ماہ کی خاص کہانی..... زندگی کے مختلف شعبوں سے جڑی چشم کشا کہانیاں اور واقعات سے انتخاب.....
✱ یاد کر گھرے ساگر میں..... شہر کی چمکتی دکنی دنیا سے جڑی یادوں کا سلسلہ.....
✱ سپی کہانیاں MINI MAG..... پچی کہانیاں کے مقبول سلسلوں آپ کی ڈائری، خیال آرائی، کتاب تیرہ اور پسند اپنی اپنی کے علاوہ کچھ اور نئے دلچسپ سلسلے شامل ہوں گے.....

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال یا اپنے ہا کر سے کاپی بک کرائیں..... پھر نہ کہیں گے ہمیں خبر نہ ہوئی

110- آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی

ہاکرز حضرات کے لیے

پورے پاکستان اور خصوصاً کراچی کے ہاکرز حضرات کے لیے ادارہ ”سچی کہانیاں“ خصوصی گفتِ اسکیم کا

اعلان کر رہا ہے۔

اس اسکیم کے تحت جو ہاکرز حضرات سب سے زیادہ

”سچی کہانیاں“ فروخت کرے گا، وہ انعام

کا مستحق قرار پائے گا..... اس سلسلے

میں ہاکرز مکمل کوائف کے

ساتھ ایجنٹ کے ذریعے

سرکولیشن منیجر سے

رابطہ کریں۔

منیجر سرکولیشن

محمد اقبال زمان

Cell No. 0300-2313256

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

عزیز احوال! خوش رہے اور بٹنے رہے۔ اصل میں سہی و دودھ پزیر ہیں جو ہمارے معاشرے سے مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ بہر حال ہم اور آپ مل کر اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ آپ سب نے مجھے ”احوال“ میں دیکھ کر کہا، اچھا گے! آئندہ ماہ سے سچی کہانیاں میں مجھے نمایاں لٹرائی جاری ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو بھی پس آئے گی۔ ہماری بیماری رضوانہ پرش نے فون کے سچی کہانیاں شمارہ اپریل کی بہت تعریف کی اور زندہ کہانی کے سلسلے کو بہت سراہا۔ شکر یہ رضوانہ! اگر آپ خط لکھتیں تو بہت اچھا لکھا۔ جتنے خطوط اب تک موصول ہوئے تھے ان سب کو شامل ”احوال“ کیا جا چکا ہے۔ دوسرے نے دالہ خط لکھ کر رسید کی جانے کی اور آپ لوگوں سے درخواست کروں گی کہ جلد ہی خط لکھ دیا کریں۔ اس ماہ سے بہترین خط کو 3 ماہ کے لیے سچی کہانیاں کے ساتھ دینے بھی جاری کیا جائے گا۔ ایک گزارش اور ہے کہ آپ لوگ کوہن کے ہمراہ خط لکھیں اور اپنی تصویر بھی ضرور ارسال کریں۔ چلیے اب چلتے ہیں خطوط کی جانب۔

✽ گفتہ شفیق کراچی سے۔ ”بیماری منزه السلام علیکم ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ”احوال“ پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ میرے دل نے بہت زیادہ دنیا کی کائنات پاک، ناصر بھائی کو دراز اور مراد صحت عطا فرمائے، آمین۔ نہیں اپنی سائیکل وہی خوشیاں مبارک ہوں۔ اللہ پاک حسین اور سہی زیادہ کامیابوں سے نوازے۔ ”حسین“ بہت اچھا لگا۔ فائزہ خٹوا کے بہنوئی اور مرز زہرا کی پھولی جان کی سفرت کے لیے دعا میں۔ اب باربران علی امیری کا مختصر اور جامع خط اچھا لگا۔ رفیع محمود صاحب پر فائدہ بہترین تحریر دیتے ہیں۔ ”محبت کا چہرہ“ تسکین نے اپنی خوب صورت یادوں کی چٹاری کو ملی اور انہیں جھگو گئیں۔ مجھے یہ حقا راتے بیمارے باپا دادا گئے۔ ”مے صاحبو سے“ میں ”خوب صورت“ دھسلے منزه کا درجہ خود احوال بے حد اچھا لگا۔ اعلیٰ قضا کا انتظار ہے۔ ہماری سچی کزن 28 مارچ کو لندن گئی ہے۔ اپنے میڈیکل Elective کرنے کے لیے Kings college london میں۔ وہاں وہ سینٹ تھامس اسپتال میں ایک مہینہ تک Elective کرے گی۔ منزه میں نے اپنی ایک خوب صورت ڈائری اس کے حوالے کی ہے کہ اپنے منزه کا احوال اس میں لکھ کر لانا۔ ایک اسٹوڈنٹ کا منزه کا کیا تجربہ ہوتا ہے۔ پڑھ کے مزہ دے گا بشرطیکہ کنٹرول لکھ کے لاوے۔ اگر لکھنے کی تو مجھے یہ یقین ہے کہ بہت اچھا ہو گا اس کا منزه فرما رہا ہے بہت اچھا ہو گا۔ باقی کہانیاں اس کی پڑکی میں ہیں کیونکہ ”سچی کہانیاں“ کل ہی موصول ہوا ہے۔ حسبِ سابق تمام کہانیاں اچھی سی ہوں گی۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔“

✽ بیماری کی شکستہ امید سکرانی رہے۔ پھولوں کا بہت شکر ہے یہ دنیا کا سب سے حسین قند ہے۔ بہت جامع خط لکھا شکر یہ کنٹرول کے لیے دعا میں ہیں۔ بیٹیاں دیکھیں بہت بیماری ہوئی ہیں۔ اس آئے سے پہلے تیار دیا کریں اس بار ملاقات میں ہوئی اچھا لکھا۔ امید ہے کہ جلد ملاقات ہوگی۔

✽ ممتاز احمد مرحوم دعا ہے۔ ”انتہائی قابل احترام“ شیک باڈی، شہرہ السلام علیکم اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ سب کا اپنی امان اور نعمتوں کی چھاؤں تلے رکھے، آمین۔ اپریل کا شمارہ آتوں میں ہے۔ ہمارے شاکر کے بغیر ”احوال“ مونا

سونا لگ رہا ہے۔ آپ نے خطوط کے جواب بہت ہی عمدہ اور شاندار دے کر احوال کی محفل کو خوب سجایا۔ ایک نئی موبائل کہانی اور خیال آرائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ ادارہ بہت ہی شاندار تھا۔ ارم زہر کی پھولی مرحومہ کی بخشش و مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعا گو ہوں۔ راجہ محمود کی "پادوں کے رنگ" پڑھ کر صاف صین کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ محمد سلیم اختر کی "خزاں کے بعد" بہت شاندار کہانی تھی۔ سعید کا کردار واقعی بہت قابل ستائش ہے۔ انسان کا عزم اور حوصلہ جوان ہوتا رہتے کی چٹائیں بھی معمولی ننگر بن جاتی ہیں۔ مینا تاج کی "چکن بریانی" اچھی تھی۔ "شہید کی ڈائری" زیر دست رہی۔ ام عادل کی "دکھوں کے بارے" پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ حنیف محرمی کی "گردش رنگ چمن" کا پہلا حصہ پڑھا۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ عورت کو طوائف بنانے میں غربت، افلاس اور مرد کا ہاتھ ہے۔ کہانی سیدھے انداز سے بھی لکھی جاسکتی تھی مگر اسے بے کار طول دے کر بے رنگ کہانی بنا دیا گیا اور خواہ کالفسفہ بگھار گیا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجدی کی "انسان اور فرشتہ" پڑھ کر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ کا کلمہ نکلا۔ عمر ایہ رمضان کی "کلام حق" ایک مختصر، پُر اثر اور عظمت قرآن کی دلالت کرتی شاندار کہانی تھی۔ موبائل کہانی بہت سبق آموز تھی۔ یہ سچ اور حقیقت ہے کہ انسان دی فصل کا پتا ہے جس کا وہ سچ پوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ "خیال آرائی" میں سب لکھنا پڑے بہت عمدہ لکھا۔ صائمہ محرمی کا تجھ ڈے پر انکس وٹ نہیں کر سکا۔ اس کے لیے دی معذرت۔ سچی کہانیاں کی پوری نییم اور تمام قارئین کرام کے لیے بہت سی دعا کریں۔

☆ بھیا ممتاز اپنی رائے سے ہمیں ضرور نوازہ کریں۔ حنیف محرمی صاحب کی کہانی کے سلسلے میں آپ کی رائے اُن تک پہنچ چکی ہے۔ آپ کو شائع کردہ کہانیاں اچھی لگیں، ہمیں یہ اچھا لگا اور میری تحریر آپ کو پسند آئی اس کا ذاتی طور پر شکریہ۔ احوال میں آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ عبدالعزیز جی آپ کو اہل سے۔ "قابل مہدا احترام بہن منظرہ، السلام علیکم! بہنا از حد دکھ کی بات ہے کہ ہماری نئی نسل کو لگتا ہے اپنے وطن سے کوئی پکار نہیں ذرا محبت نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ میری نظم پر تبصرہ ضرور کرتے۔ خدا را پاکستان کی قدر کرو۔ یہ قائم ہے تو اس کے دم سے ہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہماری عزت و وقار ہے۔ ہماری پہچان ہے، ہمارا نام ہے۔ عزت مآب فہیم انکل، وفا صدام، مازنیہ بٹول، حافظ سون شاہ، ممتاز احمد، شگفتہ شفیق، مینا تاج، عکاشہ سحر، سدرہ انور، بشری سعید، زہیرہ اقبال، ام عادل، صائمہ سحر، سدرہ ارباب، ہما، گڈی اور مور شاہد۔ آپ سب نے بہت اچھے تبصرے بھیجے، جیتے رہو اور خصوصی خط کی اشاعت پر ہمارے بلوچی بھائی ار باب قربان علی ایمری کو ڈیروں مبارک باد۔ زندہ کہانی میں پاکستان کا ایک بڑا نام، صادقین کے حالات زندگی پڑھنے کا موقع ملا۔ جناب راجہ محمود صاحب ویڈیو! مینا تاج! آپ کی کہانی ہمارے لبوں پر لگا رہی۔ جیتی رہو۔ فہیم انکل! آپ کو اللہ عز و جل عطا فرمائے۔ آپ کی نظم "محمد باری تعالیٰ نماز تہجد کے بعد ذکر واذکار میں شامل کر لی ہے۔ دعا ہے آپ کا شفیق سایہ ہمارے اور خصوصاً سچی کہانیاں کے سر پر ہمیشہ قائم و دائم رہے، آمین۔ "شہید کی ڈائری" مختصر مگر زیر دست، مزہ جیتی رہو۔ عایشہ کمال! آپ نے تو کمال کر دیا اور اسی طرح دیکھ لوگوں کے دکھ سمجھتی ہو۔ اگلی کہانی ہماری پیاری راسٹر منگل کی غالباً ذاتی تحریر تھی۔ دنیا میں بہت سے رشتے ہیں جو موتیوں کی طرح ایک مالا میں پروئے ہیں لیکن جو رشتہ اولاد کا والدین سے ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔ "اے جا سوئے مدینہ" جسے میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ بہت عقیدت و احترام کے ساتھ چشم تصور میں ہم بھی زیارت مقدسہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ سب اہل اسلام کو وہ جگہ دکھائے، آمین۔ بہت بہت مبارک ہو بہنا جی اسی حضور کو بھی میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ بہنا ایک چیز کی کمی عرصہ دراز سے کالم "میری کہانی میری زبان" میں محسوس کرتا ہوں اور کسی خط میں اس سے قبل نقطہ اعتراض بھی اٹھایا کہ "میری کہانی میری زبان" ایک قسم کا انٹرویو ہے۔ ساتھ تصویر کا ہونا از حد ضروری ہے۔ بلکہ اصلی پیکر شائع ہونی چاہیے اگر کوئی کرنا چاہے۔ "خیال آرائی"، "بے سبب اداسی" عکاشہ اس کمپلیکس سے باہر نکلیں تو پھر کیوں؟ ار باب قربان علی ایمری صاحب کاش ہم جاگ جائیں، ہوش کے ناخن لیں۔ اب بھی سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ "ماں تو ماں ہے" جس مقدس ہستی پر آپ نے کلم اٹھایا اس کا پوری کائنات میں کوئی بدل نہیں۔ سمیل خان گڈ، وفا صدام علماء دین پر اچھا لکھا۔ غمہ ایک تنہا، ممتاز احمد مخزن اخلاق

سے کشید کر دیا پھر اگر ف بہت پسند آیا۔ ”کیا یہ عذاب ہے؟“ ہاں بالکل سچ ام عا ول آپ نے میرے خیالات چرائیے بے شک ہم نے مجموعی طور پر اپنی روش نہ بدلی تو اللہ معاف فرمائے۔ آخر زندگی ہے کیا یہ بھی عجب سوال ہے۔ عجب منطق عجب منحصہ ہے۔ قلم سرائی خوب رہی۔ جیسی رہو صاحبہ سر آخر پر چلتے چلتے خیال رہے کہ کسی کی دل آزادی نہ ہو۔ نیک تمناؤں کے ساتھ نامہ بند کرنا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلام۔

☆ عزیز بھائی! ہماری نئی سلسل بہت اچھی ہے۔ وہ باتوں پر کم اور عمل پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ھینایا ہے آپ کی محبت ہے کہ آپ ٹائپل سے لے کر کہانیوں تک سب پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں۔ ٹپلے آپ اپنا کام کریں اور میں اپنا یعنی کٹ کٹ..... ٹھیک اس سے پہلای آپ کو جیتے رہیے کہہ رہی ہیں۔

✉ خلیل جبار، حیدرآباد سے۔ ”محترمہ منورہ سہام صلیبہ، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرا ی بخیر ہوں گے۔ ابریل کے شمارے میں مینا تاج کی کہانی ”چکن بریانی“ میں روانی تھی۔ بہت اچھے موضوع کا انتخاب کیا گیا۔ سلیم اختر کی کہانی ”خزاں کے بعد“ ان خواتین سے متعلق تھی جو تیزاب سے جل جاتی ہیں۔ وہ خواتین جو تیزاب سے جل جاتی ہیں ان کے لیے حوصلہ بخش کہانی ہے۔ عائشہ کمال کی کہانی ”بکھی داماں“ یہ کہانی محبت کے حوالے سے عام لڑکی کی کہانی تھی۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کرن محمد فاروق کی کہانی ”نفرت تھی درمیان“ دو بہنوں کے درمیان ہونے والی نفرت کے بارے میں ہے۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ نفرت سے سوائے جہاں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی انسان اور فرشتہ بہت خوب صورت کہانی تھی۔ ”بھوت گھر“ عنوان اچھا تھا لیکن راسٹر کہانی کو سنبھال نہیں پایا۔ جب کہ دوسری کہانی ”کلام حق“ مختصر مگر پراثر تھی۔ اقبال زمان کی ”لبورنگ لانا ہے“ کراچی میں ہونے والے ایک اندوہناک واقعے پر مبنی مگر یہ کہانی کم رپورٹ زیادہ لگی۔ ارم زہرا کی ”آرزو میں دن ہو میں، حسب روایت اچھی تھی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے تخلیق کیا گیا سفر نامہ ”اے صبا سوائے مدینہ“ ساوہ الفاظ میں روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی تحریر تھی۔ خاص کر وہ جملہ..... ”وقت نے کیا رک کر سوچا ہے کہ کون کیا جاتا ہے؟ اس کو تو گزرتا ہے سوچیں کیا، جوانی لگی اور زندگی کی لمبی کہانی گئی..... اور اب میں وہاں کھڑی ہوں جہاں آرزو پہاڑ سر کرنے کی تمنا تو ہوتی ہے مگر تو اتنی دم توڑ رہی ہوئی ہے..... مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب کالج میں پڑھتا تھا اس وقت دو شیئرہ راسٹر کی تقریب میں بھی صدف سائلک اور بھی دوست محمد فیضی مہمان ہوا کرتے تھے اور محترمہ رخسانہ صلیبہ کھڑی ہوئی تھیں۔ آج میں خود کالج میں پڑھا رہا ہوں اور محترمہ رخسانہ صلیبہ کی جگہ ان کی بیٹی منورہ نے لی ہے۔ واقعی دنیا میں ہر چیز عارضی ہے۔ میری محترمہ رخسانہ سہام سے یہی گزارش ہے کہ وہ مشتعل مچی کہانیاں کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ اس طرح جذبے جواں رہتے ہیں۔ انور فرہاد کا ”زندگی لکھ رہا ہوں“ کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا جس سے ان کی بھرپور زندگی کے گوشوں کے بارے میں پتا چلا۔ سلیم فاروقی کے ناول کی پہلی قسط جاندار رہی۔ امید ہے کہ آگے چل کر اس میں مزید سنسنی خیزی پیدا ہوگی۔ سلیم فاروقی کی کہانیاں لوگ پڑھتا جا رہے ہیں۔ ان کے ناول کی قسط کم از کم 35 سے 40 صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والے دلچسپی سے اگلی قسط کا انتظار کریں۔ صادقین کے بارے میں مضمون بہت دلچسپ اور پراثر تھا۔ ایک عدد سوبال کہانی ”خوش نصیب“ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔“

☆ خلیل بھائی! بڑی کوشش کی کہ کچھ لائیں ہی کاٹ دوں مگر آپ بھی بڑے ذہین ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ناکام ہی رہی۔ سلیم فاروقی صاحب کی کہانی کے صفحات پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازتے رہیے گا۔

✉ کرن محمد فاروق، حیدرآباد سے۔ ”میں نے اپنی دوسری کوشش ایک کہانی کی صورت اور ”خیال آرائی“ ارسال کی تھی، اگر وہ ناقابل اشاعت ہے تو پلیز بتادیجئے اور اگر اشاعت ہو چکی ہے، تو پلیز یہ خوشی بھی سنا دیجئے کیونکہ میں نے دیکھنا اور سنواری کا کچی کہانیاں نہیں پڑھا ہے۔ مارچ کا کچی کہانیاں بھی آج حاصل کر پائی ہوں۔ سو پلیز مہربانی فرما کر میرا خط ضرور شامل کر کے جواب دیجئے گا، ممنون رہوں گی۔ میں اس خط کے ساتھ بھی ایک تحریر بھیج رہی ہوں۔ اپنی اس تحریر کو بھیجتے ہوئے، میں بہت کنفیڈر اور ڈری ہوئی ہوں۔ آپ کی اصلاح کی طلب گار رہوں گی۔ خط کا اختتام وعائے خیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کی جائز حاجات اور خواہشات اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔“

☆ کرن! میں نے تمہارے خط کا پورا پہلا پیرا گراف حذف کر دیا ہے۔ اس قدر سوری کہنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی، خط لکھنے میں تو دیر سویر ہو ہی جایا کرتی ہے۔ تمہارے استاد کے انتقال کے بارے میں پڑھا، دکھ ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بھئی تمہاری دوسری کہانی تو شمارہ اپریل میں شائع ہو چکی، تمہیں شمارہ نہیں ملا؟ یہ بتاؤ حیدر آباد کی شامیں کیسی ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں اور یاد آتی ہیں۔

✉ محمد رضوان قیوم، راولپنڈی سے۔ ”دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک مزید دلچسپ، منفرد پلاٹ پر مشتمل کہانی ”جرم کسی کا سزا کبھی“ یا اس کا عنوان ”کرب پییم“ بھی رکھا جاسکتا ہے، روانہ کر رہا ہوں۔ دراصل یہ کہانی مجھے ایک بزرگ عورت نے سنائی تھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کہانی قارئین کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوگی۔ (اس کہانی میں جہاں آپ بہتر سمجھیں قلم چلا لیجئے گا) آپ کے پاس میری دو کہانیاں پہلے ہی موجود ہیں اور ہاں! ابھی تک گزشتہ کہانی کا انعام نہیں ملا۔ اب میں بات کرتا ہوں شمارہ اپریل کی۔ سچی بات ہے سرورق اتنا خاص نہیں تھا۔ جب کہ کہانیوں میں ”خزاں کے بعد“ محمد سلیم اختر کی اچھی، نئے پلاٹ کی حامل کہانی تھی۔ جب کہ ”تمی واسن“ عائشہ کمال کی تحریر بھی ادبی معیار کے گراف کو چھو رہی تھی۔ جب کہ عارف مین روہیلا کی کہانی ”سوئے کی بالیاں“ کا انداز تحریر قابل ستائش ہے۔ مینا تاج کی کہانی ”پچکن بریانی“ مجھے ہر لحاظ سے پسند آئی۔ خاص طور پر اس میں جو موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بڑا اچھوتا اور ادبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔“

☆ بھیا رضوان قیوم! ناصر بھائی سے کہہ دیا ہے کہ رائلز کو بذریعہ خط ان کی کہانیوں کی اشاعت کے بارے میں ضرور بتایا کریں۔ دیئے زیر نظر شمارے میں آپ کی کہانی موجود ہے۔ مائیکل آپ کو اچھا نہیں لگا اس بارے میں متعلقہ شعبے سے کہہ دیا گیا ہے کہ توجہ دے۔ جلد ڈاک کیا انعامی رقم کے ساتھ آپ کے دروازے پر ہوگا، انشاء اللہ۔

✉ جاوید عثمان زندانی، کراچی سے۔ ”محترمہ منزہ سہام صاحبہ، نگہبائے عقیدت! اسد ازیت کے پھول جنمیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اپریل کا شمارہ شہر کے حالات کی وجہ سے کچھ تاخیر سے ملا۔ مائیکل بس واجبی ساتھ تھا۔ حسب عادت سب سے پہلے ادارہ پڑھا۔ ادارے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ”شہید کی ڈائری“ واقعی دلگذاڑی۔ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ چینی کہانیاں اب تک بڑھ چکا ہوں پھر پورا اور پرتا شیر میں۔ خاص طور پر سنبل صاحبہ کی ”محبت کا چہرہ“ مینا تاج کی ”پچکن بریانی“ کرن محمد فاروقی کی ”نفرت بھی درسیان“ محمد سلیم اختر کی ”خزاں کے بعد“ اور رملہ محمود کی تو ہر تحریر ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ میں یہاں بطور خاص مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی کا ذکر کروں گا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ دل موہ لیا مرزا شبیر بیگ ساجد کا نام آپ کے ڈائجسٹ میں دیکھ کر کافی پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ منزہ صاحبہ میں آپ کا اور ناصر بھائی کا بھی شکر گزار رہوں گا اگر میرا سلام ان تک پہنچ جائے۔ سفر کہانی میں ”اے مباسوئے مدینہ“ رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کی تحریر دل میں اتر گئی۔ دوسرے حصے کا انتظار رہے گا۔ اللہ ہمیں بھی اس مقدس مقام کی زیارت کرائے۔ سلیم فاروقی کی ”آنش جنوں“ کے پہلے حصے ہی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ”ناشون“ اور ”جن آنکھوں میں خواب لیے تھے“ بہت اچھی جاری ہیں۔ منظومات بہت کم ہوتی ہیں۔ نگہ رہ جاتی ہے کچھ تو بڑھائی جائیں کہ شاعری کے شوقین بھی سچی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب اجازت دیجئے ناصر صاحب نے کہانی سمجھنے کا حکم دیا ہے۔ انشاء اللہ اب کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میری طرف سے تمام قارئین، اسلاف اور آپ کو پر غلطی سلام۔“

☆ جاوید بھائی! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا سلام مرزا شبیر بیگ صاحب تک پہنچا دیا جائے گا اور ہاں کہانیاں ضرور ارسال کرتے رہے۔

✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ”قابل احترام آنی جان منزہ السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ انگل نامصر کی بیماری کا پڑھا، بہت دکھ ہوا۔ ان کو خصوصی سلام اور دعائیں۔ آپ کا ”احوال“ میں آنا بھی ہمیں اچھا لگا اور بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ سے بات کر کے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور سب قارئین کو زندگی کی سچی خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ اپریل کا شمارہ ملا۔ مائیکل گرل تو گزارے لائق ہی ہے۔ آپ کا ادارہ ”محسن“ پسند آیا۔ ”احوال“ میں تمام بہنوں بھائیوں کے خطوط اور آپ کے جوابات پسند آئے۔ زندہ کہانی میں ”یادوں کے رنگ“ پڑھی، بہت پسند آئی۔

ویلزڈن راجہ محمود۔ خصوصی کہانیاں میں محمد سلیم اختر کی ”خزاں کے بعد“ ایک ایسی کہانی ہے کہ انسان اس سے بہت سے سبق سیکھ سکتا ہے، اگر چاہے تو!! مینا تاج کی ”چکن بریانی“ اگر انسان اپنے اندر ہمت پیدا کرے تو وہ تقدیر بدل سکتا ہے جس کی ایک مثال سب کے سامنے ہے۔ شہید کی کہانی میں ”شہید کی ڈائری“ شہادت ساری دنیا کا مالک اور حکمران بننے سے زیادہ افضل ہے اور ہمارے شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ عاصیہ کمال کی تحریر ”جی داماں“ محبت کچھ کھونے کا نام ہی تو ہے۔ سنبل کی ”محبت کا چہرہ“ پڑھی جو دل کو دھکی کر گی۔ ہمیشہ کے لیے تو کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ عارف روہیلا کی تحریر سونے کی بالیاں پڑھی۔ معصوم بچپن پر ظلم کرنے والے خود سکون سے رہ سکیں۔ یہ نہیں سکتا۔ کرن محمد فاروق کی ”نفرت تھی درمیان“ وہ ایک مشہور محاورہ ہے نہ کہ کپڑا بٹھے ہاتھوں، دل بٹھے باتوں، اک ذرا سی غلطی اور بدگمانی گھر اجاڑ دیتی ہے۔ ام عادل کی ”دکھوں کے مارے“ اور حنیف سحر کی ”گردش رنگ چمن“ پسند آئیں۔ مرزا شبیر بیگ کی ”انسان نما فرشتہ“ اچھی لگی۔ آج کے جوان اس سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ موبائل کہانیاں طویل جبار کی ماضی میرے سامنے، اگر اس کہانی سے بھی کوئی سبق نہ لے تو یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ پراسرار کہانیاں ٹھیک تھیں۔ میرے شہر کی کہانی میں ارم زہرا ”آرزو میں دفن ہویں“ دولت کی خاطر کل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اقبال زمان کی ”لہور رنگ لاتا ہے“ اجتماعی کل کی اس داروات نے لہور کا مادیات سفر کہانی میں آنٹی رخسانہ سہام مرزا کی ”اے صبا سوئے مدینہ“ پڑھی، بہت پسند آئی۔ مسجد نبوی اور دوسرے مقامات کی بھی زیارت ہوئی بہت خوشی ہوئی۔ ”لکھ رہا ہوں زندگی میں“ انور فریدانے دوسری قسط میں بھی زیادہ تر فلوں کا ذکر کیا۔ آخری قسط میں خدا خیر کرے۔ ”ناشون“ میں دھچی حد سے سوا ہوئی جا رہی ہے۔ ویلزڈن شازلی سعید۔ انکل سلیم فاروقی کی ”آتش جنوں“ پہلی قسط تو پسند آئی۔ ”جن آنکھوں میں خواب لیے تھے“ کی تو کیا ہی بات ہے۔ شاعری میں انکل محمد نعیم کی حمد باری تعالیٰ اور رضوانہ کوثر کی ”جھوٹے رشتے“ پسند آئی۔ خیال آرائی میں ”بے سبب اداسی“ اگر عکاشہ سسٹر سب کے ساتھ اپنا دکھ شئیر کریں تو شاید ہم ان کا دکھ بانٹ سکیں۔ رمزی آفتم کی کتاب ”کوئی تو خواب ہو“ پر عکاشہ کا تبصرہ لا جواب ہے۔ ”پسند اپنی اپنی“ میں روبینہ شاہین کا شعر پسند آیا۔ ”بازگشت“ میں انکل سہام ”مقدار کو رونا کب تک؟“ جب تک ہر انسان اپنے آپ کو درست نہ کرے تب تک آنٹی جی انکل نامر سے پوچھ کر بتائیے کہ میری کوئی کہانی کب تک منظر عام پر آئے گی۔ مزید انتظار نہیں ہوتا۔ سب پڑھنے والوں کو ڈھیروں سلام۔ پاکستان کو ہم نے اللہ کے سپرد کیا۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک اللہ تم نبھان۔“

☆ سویت سی صدر!! بڑا سیدھا سچا سا خط لکھا۔ تحریریں پسند کرنے کا شکریہ۔ ناصر بھائی سے کہانیوں کے سلسلے میں خط کے ذریعے اطلاع دینے کی بات کی ہے، جیسے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گا تو پھر تم سب کی شکایت دور ہو جائے گی۔

✉ صفیہ سلطانہ، جبک آباد سے۔ ”السلام علیکم اللہ کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور سنائیے کیسے مزاج ہیں۔ یہ جبری خط ہے..... ارے..... ارے..... آپ غلط سمجھے کیونکہ تین ماہ کے بعد میں نے 28 کو راج کا شمارہ ملتے ہی، دن شمار کیے بنا بہت فاصل اور دیر پور تبصرے کے ساتھ۔ شعروں کا تذکار کا کہ خط لکھا تھا، مگر جب آپ سے فون پر بات ہوئی تو پتہ چلا کہ خط آپ کو نہیں ملا۔ وہ خط اس لیے بھی بے حد اہم تھا کہ اس کے ہمراہ محمد نعیم صاحب کی شاعری پر میں نے بہ قطر غائر تبصرہ لکھا تھا اور اس کی عکسی نقل بھی اپنے پاس نہیں رکھی، جس کا قلق ہے۔ اللہ کرے کہ وہ خط آپ کو مل جائے۔“ وہ درخشاں ستارہ کے نام سے ارفع کریم کے حالات زندگی (مختصر ترین حالات زندگی) پڑھ کر بہت اچھا چھی لگا اور دکھ بھی ہوا۔

عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے پہلے جانیں دیں

یہ بچے ہیں انہیں جلد سو جانے کی عادت ہے

اور اس منہی گڑبائی کی شاعری نے بھی بے حد متاثر کیا۔ اللہ کے حکم کے آگے ہماری کیا مجال ہے۔ فیضان عثمانی کی ”یقین کامل“ بہت اچھی لگی، ویلزڈن بھیا۔ صرف آصف کی کہانی ”اے جذبہ دلی“ پاکستان سے محبت پر بہت دلگداز و امتنان بھی جس نے بے حد متاثر کیا۔ امر منصور کی کہانی بھی ایک نیا رنگ سمیٹے ہوئے گی۔

دیگر کہانیاں بھی بے حد اچھی تھیں۔ ان پر تبصرہ چونکہ کر دیا تھا پھر اس وقت سامنے نہیں ہے۔ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے رات کے باقی چادلوں پر تذکار کا لگا..... اب انشاء اللہ اگلے ماہ زندگی بخیر، خط لکھوں گی اور اللہ کرے کہ وہ مل بھی جائے۔“

☆ صفحہ جی! آپ کا مفصل خط لگتا ہے ذاک خانے والوں نے رکھ لیا۔ آپ لکھتی ہی اتنا اچھا ہیں۔ اب ان کا کیا تصور چلیں آئندہ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور سے۔ ”مارچ 2012ء چچی کہانیاں کی کہانیوں پر تھرے سے قبل ایک چھوٹی سی شکایت ملاحظہ فرمائیں۔ دسمبر 2011ء میں ”احوال“ میں خط اور خط کے ہمراہ کہانی ”اللہ کی عدالت“ آپ کو ارسال کی۔ جنوری 2012ء کے شمارے میں آپ نے لیٹ پیچنے والے خطوط میں میرا نام شائع کیا۔ میرا خیال ہے بیچ جانے والے خطوط کو آپ کھولتے نہیں۔ اوپر سے نام دیکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ کہانی اپنے نمبر کی منتظر ہے یا ردی کی نوکری، ختم کر گئی؟ اس بارے میں ضرور مطلع کریں تاکہ میں مزید کہانیاں ارسال کر سکوں۔ اب آئیے مارچ کے چچی کہانیاں کی جانب۔ معصوم ارفع کریم کی تصویر ”حسرت ان غنوں پر“ نامی نکل پر موجود ہے۔ وہ درخشاں ستارہ عنوان سے معصوم ارفع کریم کا ”احوال“ نامہ شائع کر کے آپ نے (ادب) کا حق ادا کر دیا۔ ارفع کریم کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا بیٹا محمد احسان اللہ عمر میں برس۔ ایس ای کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ 4 ستمبر 2010ء رمضان شریف کا چوبیسواں روزہ رات بارہ بجے دکنوریہ اسپتال سی سی یو میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ یہ ایسا صدمہ تھا جو میں نہیں بھلا سکا۔ سوچتا ہوں۔ اولاد کا دکھ بھی کیا دکھ ہوتا ہے۔ اللہ پاک ارفع کریم مرحومہ کو میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو اور ان جیسے تمام ان پھولوں کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ جنت الفردوس عطا کرے۔ والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ارفع کریم کے والدین سے استعا کرتا ہوں کہ مرحومہ کی لحد پہ زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ اس عمل سے بھی دل کو سکون ملتا ہے۔ میرا بھی جب دل گھبراتا ہے۔ بیٹا شدت سے یاد آتا ہے تو دعاؤں کی کتابیں لے کر بیٹے کی لحد پر چلا جاتا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ قرآن کریم کی تلاوت اور دعاؤں سے رحمت کے فرشتے مرحومین کی قبروں پر رحمت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ بلاشبہ ہم دفن مرحومین کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمیں اللہ کی قدرت و کرم سے دیکھ لیتے ہیں۔ ارفع کریم تو جنت کا گلاب بھی۔ انشاء اللہ جنت الفردوس میں خوش و خرم ہوگی۔ اللہ میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو بھی جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین ثم آمین۔ ”زبردست چاکن“ اور ”جنونی محبت“ دونوں کہانیاں اچھی کاوش ہیں۔ مختصر کہانیوں میں شہید کی ڈائری، جی علی الفلاح، وہ انجینیئر سا بھی، جگہ جیتی، میں دیار سنگ نے ستر کیا۔ سلیطہ دار کہانی ”ناشون“ دلچسپ رہی مگر صفحات ذرا کم ہیں۔ پراسرار کہانیوں میں وہ ”عجیب بیٹی“ دو صفحہ کی کہانی سبق آموز ہے۔ واقعی راستے میں بڑی ہوئی کسی بھی چیز کو اٹھانا اچھی بات نہیں مگر ہمارے ہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ ”گھائل آتما“ اپنے اختتام کو پہنچی۔ ابھی مزید کہانیوں کا مطالعہ جاری ہے۔ اس شمارے میں کوپن وغیرہ کا صفحہ غائب ہے۔ کیا یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے؟ یا یہ صرف کچھ عرصہ کے لیے ہے۔ کوپن کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس طرح قارئین کو خطوط جلدی بھیجنے کا شغف رہتا ہے۔“

☆ بھاشا شہر! بیٹے احسان کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو آپ کے دکھ کو کچھ لمحوں کے لیے ہی تم کر سکیں۔ شاید اولاد کو واسی لیے آزمائش کہا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمام والدین کو اس دکھ سے محفوظ رکھے جس نے بھائی بشیر کے دل میں گھر کر لیا ہے، آمین۔ کہانیاں آپ کو اچھی لگیں، شکریہ یقیناً کتبے خطوط ہمیشہ سے میں ہی کھولتی ہوں لہذا بنا پڑھے نتائج کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کی کہانی ہمارے پاس ہے، بہت جلد شائع ہوگی۔ امید ہے کہ آپ کی شکایت دور ہوگئی ہوگی۔

✉ اے آر رضوی، راولپنڈی سے۔ ”السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے ادارے سے پرانا تعلق ہے تاہم آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام اے آر رضوی ہے اور سن اسی کی دہائی میں اسی نام سے ماہنامہ دو شیزہ میں لکھتا رہا ہوں۔ سہام مرزا احیات تھے اور عرفان فاروقی دو شیزہ کی ایڈیٹر تھیں۔ میں اس دور میں کراچی میں تھا۔ لہذا کئی بار ملاقات بھی ہوئی اور دو دفعہ دو شیزہ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت بھی کی، معروف رٹائرڈ سے ملاقات بھی رہی۔ پھر گردش ایام اور زندگی کی مصروفیات کے رابطہ نہ رہا۔ اب ایک طویل عرصے بعد ماہنامہ چچی کہانیاں دیکھا تو آپ کی محنت کو داد دینے اور ایک دفعہ پھر آپ کی محنت میں آنے کو دل چاہا چنانچہ آپ کی خدمت میں موبائل کہانی ”قاتل موبائل“ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اسے کسی قریبی اشاعت میں لگا دیجئے گا۔ امید ہے کہ اس چچی تحریر کو قارئین پسند فرمائیں گے۔ آپ نے حوصلہ

افزائی فرمائی تو آپ سے رابطہ اور قارئین سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کو میرا سلام دیجئے گا۔ بہت سی نیک دعاؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ اجازت چاہوں گا، اللہ حافظ۔“

☆ رضوی صاحب! آپ ”احوال“ میں تشریف لائے، بہت اچھا لگا۔ کہانی ناصر صاحب کی ٹیبل پر پہنچا دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اب آپ کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ضرور تشریف لاتے رہیں گے۔

✉ مور شاہد وفا، کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک اور صحت یاب ہوں گے۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ خطوط کی محفل میں اب کچھ زیادہ سی روشنی تھی۔ آئی منزہ سہام نے خطوط کے جوابات دے کر محفل کو شاندار کر دیا۔ آئی منزہ سہام نے محسن کے عنوان سے بہت اچھا لکھا۔ ان ہی کے قلم سے ”شہید کی ڈائری“ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کچھ دن پہلے ہم نے بھی کچھ پودے اور بہت اقسام کے پھول لگائے ہیں۔ عارف حسین روہلا کے قلم سے ”سونے کی بالیاں“ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ام عادل کے قلم سے ”دکھوں کے مارے“ پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور آج صبحیں غم ہوئیں۔ غلیل جبار کے قلم سے ”ماضی میرے سامنے“ دل دہلانے والی کہانی تھی جیسی کہنی ویسی بھرنی انجیان کے قلم سے ”بھوت گھر“ بہت دلچسپ کہانی تھی۔ عمرانہ رمضان کے قلم سے ”کلام حق“ پڑھ کر بہت خوش ہوئی۔ سبحان اللہ واقعی قرآن مجید جیسے ہر دلوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اقبال زمان کے قلم سے ”ہورنگ لاتا ہے“ پڑھ کر اس سنگین حادثے پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ ستر کہانی اسی رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے ”اے ماسوئے مدینہ“ بہت دلچسپ تھی۔ اسی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین۔ انکل سلیم فاروقی کے قلم سے ”آتش جنوں“ کی پہلی قسط حد سے زیادہ دلچسپ تھی۔ کچھ معروضات کے باعث شمارہ اتنا ہی پڑھا ہے۔ اللہ تمام اہل وطن کو دشمنوں کی بری نظر سے بچائے، آمین۔ اور اب اس شاعری کے ساتھ اجازت

سنو اے جاناں
تمہیں بھول جاؤں یہ ممکن نہیں
جیسے دریاؤں کا الٹا بہنا ممکن نہیں
یہ ٹوٹا ہوا دل تمہیں یاد کرتا ہے
ہر گھڑی ہر پل تمہیں یاد کرتا ہے

☆ بھائی مور شاہد وفا! آپ کی شاعری ”احوال“ میں شائع کروں۔ اب تو خوش ہیں۔ میرے پاس اتنی ہی مختصر تھی کہانیاں آپ کو اچھی لگیں شکر یہ۔ سلیم فاروقی صاحب تو پھولے نہیں سارے ہیں۔ ابھی آخر پچی کہانیاں کے ایڈیٹر تھے..... آپ سب کے درمیان رہنا انہیں بھی اچھا لگتا ہے۔

✉ محمد راشد مغل، سکھر سے۔ ”میرا تعلق سکھر سے ہے اور میں درس و تدریس سے وابستہ ہوں۔ آپ کا ڈائجسٹ ماہنامہ بھی کہانیاں میں ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں، میں شاعر بھی ہوں۔ شعر، شاعری سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ نثر پر مجھے کم اثر نہیں ہے۔ اگر میں کوشش کروں تو نثر لکھ سکتا ہوں۔ خیر آپ کے ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے جگہ نہیں ہے جس طرح دیگر ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی کچھ غزلیں ارسال کر دوں اگر آپ کو اور آپ کے ادارے کو پسند آئیں تو ضرور پچی کہانیاں میں شامل کریں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ اور زیادہ ترقی کرے۔“

☆ بھائی راشد مغل! شاعری ضرور ارسال کریں اور اس کے ہمراہ تصویر بھی بھیجیں اگر آپ کی شاعری معیاری ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

✉ شراحہ، کراچی سے۔ ”12-2012-1 کو ایک تحریر ارسال کی تھی جواب تک شائع نہیں ہوئی۔ نہ ہی میری غزل شائع ہوئی ہے۔ پوچھتا ہے کہ کیا وہ تحریر..... غزل معیاری نہیں؟ پچی کہانیاں میں اپنی تحریر پڑھ کر اچھا لگتا ہے شکر یہ آپ کا۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا خدا آپ کو صد خوش رکھے، آمین۔ اپنی غزل اور مضمون ارسال کر رہی ہوں۔ معیاری ہوں تو ضرور جگہ دیجئے گا انتظار رہے گا۔ شکر یہ کے ساتھ اجازت دیں۔“

☆ شمر! اتنا مختصر خط کہ قہقہی چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور بھی تمہاری تحریریں تو اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، جو چیز شائع نہ ہو تو سمجھ جاؤ تم نے پوری محنت نہیں کی۔ رسالے میں کچھ تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، ان کے بارے میں ضرور لکھنا۔

✉ ام عادل، کراچی سے۔ ”محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! کہیے کیسے مزاج ہیں، امید ہے بخیر ہوں گے۔ آپ کی ”نو اے امرد“ تو ہر ماہ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جو وسعت میں کم مکرزون میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے راستے دل میں اتار جاتی ہے۔ رسالے میں آپ کا طرزِ مخاطب دیکھ کر دل خوش ہوا اور آپ سے مخاطب ہونا بھی دلی مسرت دے رہا ہے۔ آپ کی آمد ایک معطر جھونکے جیسی گل کی مرہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی آپ کی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے ”احوال“ کی ذمہ داری آپ پر ایک اضافی بوجھ ہے۔ منزہ صاحبہ میں آپ کے روزنامہ ”فلک ناگزین“ کے حوالے سے کچھ وضاحت چاہتی ہوں پلیز رہنمائی کیجئے۔ آپ کی کاوش ”فلک ناگزین“ کی صورت کب تک منظر عام پر آ رہی ہے؟ میں اس روزنامے میں کالم نگاری کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا کیا طریقہ کار ہوگا۔ محترمہ قاطعہ شراب یا بجایا صاحبہ ہماری بزرگ، صاحبِ علم اور کزنہ مشقِ رائٹر ہیں۔ آپ کے اور ان کے اشتراک سے لکھنا ایک بہترین اور مکمل روزنامہ ہمیں پڑھنے کو ملے گا۔ فلک ناگزین کے اشتہار کے ساتھ ہی آپ کی آواز ”محسن“ پڑھی۔ سو فیصد صحیح کہا آپ نے وہ دو میں ہمیشہ تنزیل کا شکار ہی ہوتی ہیں جو اپنے محسنوں کے احسانات فراموش کر کے ان سے بدسلوکی کے جرم کی مرکب ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر خوش ہوئی۔ اس کی خبر پہلے ہی محترم ناصر رضا بیانون پر وے چکے تھے۔ کہانی کے علاوہ میری خیال آرائی نے بھی رسالے میں جگہ پائی، اتنی جگہ دینے اور میری تحاریر کو پذیرائی دینے پر تہ دل سے شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے میرے پسندیدہ ترین رائٹر جناب سلیم فاروقی صاحب کی سلسلہ ”دور سرگزشت“ ”آتش جنوں“ لگا کر نہ صرف مجھے بلکہ ان کے تمام چاہنے والوں کو بہت بڑا سر براہِ نژدیا ہے۔ شاید اس کے لیے شکریے کا لفظ چھوٹا ہے۔ منزہ صاحبہ یقین مایے میری اپنی کہانی لکھنے کی خوشی سلیم فاروقی کی تحریر کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ اب تو ہر ماہ رسالے کا انتظار اور زیادہ شدت سے رہے گا۔ منزہ صاحبہ میرے بیٹے کی صحت اکثر خراب رہتی ہے اس کی بحالی صحت کی دعا کیجئے گا۔ وہ میری واحد اولاد ہے۔ اس کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے دل ہمہ وقت پریشان رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ اجازت دیجئے خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو، آمین اللہ تمہارا۔“

☆ ڈیڑ ام عادل! سب سے پہلے تو بیٹے کی صحت یابی کے لیے نیک تمنائیں اور بے شمار دعائیں۔ ایک ماں ہی یہ بات جان سکتی ہے کہ اولاد کی محبت کیا معنی رکھتی ہے۔ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو بے شک وہ نہایت مہربان ہے۔ سلیم فاروقی صاحب تک تمہاری تعریف پہنچادی۔ وہ شکریہ کہہ رہے ہیں۔ دفتر جب آنا چاہا تو جاؤ میں اُس ہی میں ہوتی ہوں۔ فلک ناگزین باندی سے شائع ہو رہا ہے ابھی کیونکہ ابتدائی مراحل میں ہے اس لیے کچھ دشواریاں ہیں۔ تم ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔

✉ ارشد بخاری لکھتے ہیں۔ ”شاید آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے فروری 2012ء کے شمارے میں میرے کچھ احساسات شائع کر کے وعدہ کیا تھا کہ میری تحریر کردہ سچی داستان ”انسان اور شیطاں“ جو ملک دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے، مارچ 2012ء کے شمارے میں شائع کر دی جائے گی مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی مارچ اور اپریل کے شماروں میں شائع نہ ہوئی شاید آپ حکومتِ وقت کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور وعدہ خلافی کی روش اختیار کر رہے ہیں۔ میں نے ساری عمر صحافت، وکالت اور سیاست بیانی سے گزار دی ہے اور عمر کے اس حصے میں بھی میرے لاتعداد تجربات، مشاہدات، واقعات شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی فہرست آپ دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ آپ کی طرف سے پذیرائی کی بجائے بائوسی ملی ہے لیکن پھر بھی میری دعا ہے کہ یہی کہانیاں ڈائجسٹِ قوم اور معاشرے کا صحیح ترجمان بنے اور کامیاب رہے۔“

☆ ارشد بخاری! آپ کی کہانی کی اشاعت میں دیر صرف ناصر بخاری کی ناسازی طبع ہے اور کچھ بھی نہیں مگر آپ کا یہ جملہ سہا گیا کہ ”آپ حکومتِ وقت کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں“ یقین کیجئے ایسا بالکل نہیں ہے۔ برے سے برے انسان بھی حکومت کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکتا ہماری بھی اتنی مجال کہاں۔ بہر حال غصہ چھوڑیے اور ”احوال“ میں آتے رہیے،

✍ حافظہ منور شاہ، سرگودھا سے۔ "احوال" میں اپنا خط دیکھ کر اور نظم پڑھ کر خوشی ہوئی اور یہ خوشی اس وقت مزید بڑھ گئی جب اپنی کہانی کو انعام یافتہ لسٹ میں پایا۔ آپ کا بہت بہت شکر یہ اور ان احوالیوں کا بھی شکر یہ جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا لیکن آپ نے میری سلسلہ وار کہانی کے بارے میں نہیں بتایا وہ کب شائع ہوگی؟ "بچی کہانیاں" تو ہر بار شائع رہی ہوتا ہے اور اس میں شائع ہونے والی ہر کہانی شائع ہی نہیں لا جواب ہوتی ہے۔ ماہ اپریل کا شمار بہت پیارا اور اس پر موجود ماڈل نہایت خوب صورت تھی۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا ادارہ ہمیشہ کی طرح بہترین اور اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے تھا۔ "احوال" میں ان کے شگفتہ گفتگو جواہرات دل کو بھائے۔ رخسانہ سہام صاحبہ کی سفر کہانی "اے مہاب سوئے مدینہ" بہت شائع رہی، دل کو تڑپاتی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنا اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا در دکھائے، آمین۔ راجہ محمود صاحب کے قلم سے زندہ کہانی سید صادقین نقوی "یادوں کے رنگ" بہت اچھی لگی۔ کہانیوں میں سونے کی بالیاں، چکن بریانی، محبت کا چہرہ، بہت بھائیں۔ "گردش رنگ چمن" اور "آتش جنوں" بھی اچھے سسلے ہیں جب کہ اس وقت میری پسندیدہ کہانی "جن آنکھوں میں خواب بے تھے" ہے۔ "خیال آرائی" میں دو قاصداں حسین عازمی اور ممتاز احمد کی خیال آرائی بہت پسند آئیں۔ راجہ محمود صاحب سے فرمائش ہے کہ وہ ادکارشان اور ادکارہ ریماکس کے بارے میں بھی لکھیں اور اگر مناسب سمجھیں تو کبھی کبھار کسی عالم دین کے حالات زندگی پر بھی تفصیلی مضمون لکھا کریں۔ اللہ کرے ہوزور قلم اور زور کرم اور روزیادہ پھر آئیں۔

☆ حافظہ منور! ناراض مت ہو جانا تمہارے خط سے بس کچھ لائنیں حذف کر دی ہیں۔ تمہاری رائے اچھی لگی۔ اس لیے فوراً راجہ صاحب تک پہنچا دی ہے۔ ای کی تحریر اچھی لگی وہ شکر یہ کہہ رہی ہیں۔ امید ہے محفل میں آتی رہو گی۔

✍ دو قاصداں حسین عازمی، حیدرآباد سے۔ "السلام علیکم! پیاری، بہن منزہ سہام باجی آپ کو "احوال" میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کا "احوال" میں آنا ہمیں اچھا لگا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ باجی! کچھ دن پہلے میرا بیٹا بیٹن دن کے لیے جانا ہوا۔ یقیناً چاہے بڑا دی سکون ملا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام والا کردہ، اپنے نبی کے طریقوں پر چلنے والا کردہ ہر سنت کو زندہ کرنے والا کردہ۔ جس میں سندھی بھی ہیں، پنجاب بھی ہیں، پنجابی بھی اور بلوچ بھی اور مہاجر بھی سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ کاش پاکستان ایسا ہو جائے کاش سارے پاکستانی ایسے ہو جائیں پھر ہر طرف محبت ہی محبت ہوگی۔ اپریل کا پرچم۔ "احوال" میں آپ کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ "احوال" میں ساتھیوں کے خط پڑھے جن دوستوں کو میری کہانی پسند آئی ان کا شکریہ۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ راجہ محمود کے قلم سے "یادوں کے رنگ" پڑھ کر اچھا لگا۔ محمد سلیم اختر کے قلم سے "خزاں کے بعد" اچھی لگی۔ مینا تاج کے قلم سے "چکن بریانی" اچھی لگی۔ آپ کے قلم سے "شہید کی ڈائری" اچھی لگی۔ بے شک شہید زندہ ہوتے ہیں۔ عاکشہ کمال کے قلم سے "نئی داناں" دیکھ بھری کہانی تھی۔ سنبل کے قلم سے "محبت کا چہرہ" اچھی کہانی تھی۔ عارف حسین کے قلم سے "سونے کی بالیاں" دیکھ بھری کہانی تھی۔ کرن محمد فاروق کے قلم سے "نفرت مٹی درمیاں" عبرت انگیز کہانی تھی حنفی سحر کے قلم سے "گردش رنگ چمن" عجیب کہانی تھی اور سلیم فاروقی کے قلم سے "آتش جنوں" پڑھی۔ اچھی کہانی ہے اچھی قسط کا انتظار ہے۔ بہن بس اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ آپ سے التجا ہے خط کے پہلے جسے پر پتھی نہ چلائی جائے پلیر اور عاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✍ بھائی دو قاصداں حسین! بے شک نبی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے ہی میں عافیت ہے۔ اللہ کرے یہ بات تمام مسلمانوں کو سمجھ میں آجائے آپ کو کہانیاں اچھی لگیں تو ہماری محنت بھی ٹھکانے لگی۔ جہاں تک بیٹن نہ چلانے کا سوال ہے تو بھیا گھوڑا گھاس سے کیسے دوستی کر سکتا ہے۔ آپ سب کے خطوط دیکھ کر تو بیٹنی صاحبہ ویسے ہی لپکانے لگتی ہے۔ دیے یہ زیادتی ہے احوال اور بیٹنی کا ساتھ اتنا پرانا ہے اور آپ لوگ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔

✍ نجمہ شعیب و فاکرم! انجمنی سے۔ "خادم" نے کچھ عرصہ پہلے دو عدد کہانی بعنوان "تہائی سی تہائی ہے" اور "زندگی ٹھہر ڈرا" آپ کے رسالے کے لیے بھیجی تھیں لیکن نامعلوم کس وجہ سے وہ اب تک رسالے کے ادراک پر آنے سے قاصر ہیں اور اب ایک نئی کہانی "جینے کی حسرت" اور "خیال آرائی" کے ساتھ آپ کے "احوال" میں شرکت کر رہا ہوں اگر

رسالے کے معیار اور قارئین کی پسند کے مطابق ہوں تو ضرور شامل اشاعت کیجئے اگر مجھے جلدی جھپنے کا موقع ملا تو وعدہ رہا ہر ماہ ایک کہانی آپ کو ضرور بھیجوں گا، انشاء اللہ، تبصرہ ضرور کرنا مگر اس ماہ کا شمارہ مجھے لیٹ موصول ہوا ورنہ پرانے اور نئے لکھاریوں کو ضرور سراہتا کہ یہ ان کی محنت کا حق ہے مگر کیا کروں اب صرف دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ امید ہے کہ میرے کہانی اور خط رسالے میں شامل فرمائیں گے اور شکریہ کا موقع دیں گے۔“

☆ بھائی شعیب! آپ کی کہانیوں پر کام ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ رسالے کے بارے میں کچھ تو لکھتے! پتلیں اٹلی ہار سکی۔

✉ روینہ منور کراچی سے۔ ”ایڈیٹر صاحب! آداب! میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری چھوٹی سی تحریر بھی کہانیاں کے مقبول سلسلے ”خیال آرائی“ میں شائع کر کے میری ہمت افزائی کی ہے۔ میں تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور آپ کے لیے دعا گو ہوں، اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اور آپ کو دن دوئی اور رات چوٹی ترقی عطا فرمائے، ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

☆ روینہ! کچی کہانیاں تو آپ لوگوں کا اپنا پرچہ ہے۔ لکھتی رہیے، ہمیں انتظار رہے گا۔

✉ غزالہ شاہین عبدالقیوم، حیدرآباد سے۔ ”قابل احترام ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا کرے اور آپ کا رسالہ ”کچی کہانیاں“ ترقی کے راستوں پر گامزن رہے، آمین۔ پراسرار کہانی کے سلسلے کی ایک کہانی ”مہرباں ایسے“ ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کسی قریبی اشاعت کا حصہ بنائیں گی۔“

☆ ڈیر غزالہ! آپ کی کہانی ناصر رضا صاحب کو بھجوا دی ہے اور جلد آپ کا انعام آپ تک پہنچے گا۔

اس ماہ کا خصوصی خط

شفیق فیکس، سیالکوٹ سے۔ ”خوبصورت سرورق اور موٹا تازہ شمارہ اپریل 2012ء دل کو بہت بھایا۔ اس بار ”احوال“ بے حد طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مزیداریا توں سے بھرا ہوا تھا۔ اس بار سب سے خوب صورت خط دعا کا شجی کا تھا۔ ”کچی کہانیاں“ کی کہانیاں ہر ماہ اپنی خوب صورتی اور نئے پن کے ساتھ ساتھ دل کے اندر گھر کر جاتی ہیں۔ ”محبت کا چہرہ“ دل میں محبت کے جذبات کو بہت زیادہ بھار گئی۔ بے حد عمدہ تحریر تھی۔ ”دکھوں کے مارے“ سخت دکھی کر گئی۔ ”آرزو میں دفن ہو میں“ دل کو چیر دینے کی حد تک سفاک سچائی تھی اس تحریر میں۔ ”سونے کی بالیاں“ اور ”جی داماں“ بھی شاندار رہی تھیں۔ فی الحال اتنا ہی مطالعہ کر پائی ہوں اسی لیے یہ چھوٹا تبصرہ قبول نہ کریں۔ ہمیں اقبال میں ابھی موسم میں کچھ ٹھنڈک باقی ہے۔ پیارے کراچی میں موسم کس جوں پر ہے؟ ضرور بتائیے گا۔ سب نے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ میرے پرچے ہو رہے ہیں دعا گو رہے گا۔ اک شاعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

سفر زندگی تمام ہوتا ہی نہیں ہے

کہ ہر ایک رستے آبلہ پائی کا شکار ہیں بہت

☆ شفیق! تمہارا خط مجھے بہت اچھا لگا۔ مختصر بھی اور کچھ کچھ طویل بھی۔ بہر حال اب صرف اپنے امتحانوں پر توجہ دو

رزلٹ بہت اچھا آنا چاہیے۔ مٹھائی ہماری طرف سے ہوگی ٹھیک ہے نا؟

نوٹ: ان قارئین کے خطوط تاخیر سے ملنے کے باعث شامل ”احوال“ نہ ہو سکے۔ سہیل خان، کورنگی کراچی۔

توہیر خالد، دوکوٹ۔ عائشہ خورشید، کراچی۔

پھر پتلیں گے گر خدا لایا

منزلہ سہام

زندہ کہانی مشہور و معروف شخصیات کی زندگی سے اخذ کردہ واقعات اور ان سے جڑی کہانیاں

راجہ محمود



شہنشاہ جذبات

تاتل اجیری کا خیال
جن فضاؤں نے مجھ کو دیکھا ہے
اُن فضاؤں کو یاد آؤں گا

پاکستانی فلمی افق کا جگمگاتا ستارہ اور لیجنڈری فنکار محمد علی کا احوال زیست



مال میں اس نوجوان مقرر کی آواز گونج رہی تھی اور سامعین یوں اس کی تقریر کے سحر میں گتے جیسے نہیں جانتا نگرہ کیا گیا ہو۔ نوجوان کی آواز میں گرج تھی تو جی سمجھ میں ایک حکمت اور انداز میں وقار تھا۔ اس کا تلفظ دلکش تھا اور مملوں کی اداسگی میں قدرت ہی ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس نے اپنی تقریر سے ماحول پر سکتہ سا غاری کر دیا تھا۔ جج صاحبان بھی مبہوت تھے اس نوجوان مقرر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کے تاثرات دیکھ کر یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ اس انٹر کالج تقریر کی مقابلے کا فاتح بھی نوجوان رہے گا۔

نوجوان نے اپنی تقریر کا اختتام کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جج صاحبان بھی داروئے تبسم نہ رہ سکے اور جب مقابلے کے فاتح کا اعلان ہوا تو سب کی توقع کے عین مطابق اسی نوجوان کو بہترین مقرر قرار دیا گیا۔ راز دہ جہات کا نمونہ اس نوجوان کا نام محمد علی تھا جو گورنمنٹ سنی کالج حیدر آباد کی نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ اپنے اس طالب علم تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ محمد علی نامی اس نوجوان نے تقریری مقابلے جیتا ہو بلکہ وہ اپنی زبردست آواز اور دلکش انداز بیان کے باعث متعدد بار تقریری مقابلوں کا فاتح رہ چکا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اپنے اس ہونہار طالب علم پر غرور تھا جو کالج کے وقار میں اضافے کا باعث بنا تھا۔ راز دہ طالب علمی میں اپنی آواز کا جادو بنگانے والے محمد علی کو شاید اور کبھی نہیں ہوگا کہ آنے والے وقت میں کسی کیسی کامیابیاں ہاتھ بامعے اس کی منتظر ہیں اور تقدیر کے چنوں پر اس کے لیے ایسا کونسی لکھا ہے کہ ایک عالم اس کی حق شناسی والی آواز اور اس کی مردانہ وجاہت سے مالا مال شخصیت کا دیوانہ ہو جائے گا۔

19 اپریل 1931ء کو دنیا کے کچھ ہمدرد ہونے

والے محمد علی نے ہندوستان کے صوبے اتر پردیش (یوپی) کے علاقے رام پور کے ایک خالص دین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد مولانا سید مرشد علی حیدر نام دین تھے۔ محمد علی کے آباؤ اجداد کا خیر و نسب سلسلۂ نقشبندیہ کے حیدر احمد حضرت مجدد الف ثانی سے جا ملتا ہے۔ ان کے والد کا تعلق بنیادی طور پر افغانستان کے تاریخی شہر غزنی سے تھا۔ ایک رات ان کے خواب میں حیدر احمد حضرت مجدد الف ثانی آئے اور انہیں غزنی چھوڑ کر ہندوستان ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ مرشد کے حکم پر مولانا سید مرشد علی نے فوراً رنج سفر باغداد اور ہندوستان کے شہر رام پور میں سکونت اختیار کی۔ مگر انہ چونکہ مذہبی تھا اپنا بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ دو ہفتہ ہفتہ ہفتوں میں سب سے چھوٹے محمد علی کو چودہ سال تک اردو عربی اور فارسی زبانوں کے علم سے آراستہ کیا گیا۔ محمد علی کی پیدائش کے فوری بعد ان کے اہل خانہ رام پور سے روہتک آ گئے تھے جو صوبہ ہریانہ کا خاندان تھا اس لیے محمد علی کا بچپن رام پور اور ہٹالی کی گلیوں میں گزارا تھا کہیں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث محمد علی کو سب پیار سے منا کہتے تھے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا کہ والدہ دارغ غفارت دے گئیں یوں اس کی پرورش والدہ بڑے بھائی ارشد علی اور بڑی بہنوں کے زیر سایہ ہوئی کہیں میں دن رات ماحول تھا تو اس کی تربیت بھی اسی گچ پر کی گئی تھی۔ نماز روزے کی پابندی بھی کرانی جاتی تھی۔ اسی ماحول میں محمد علی کے عمر کی چودہ منزلیں طے کی گئیں۔ لڑکپن کے اس دور میں جبکہ ایک بچہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے کی طرف گامزن ہوتا ہے اور اس میں دنیا کو زیر و زبر کرنے کی خاموشیاں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی ہوتی ہیں۔ محمد علی عمر کے اسی تیرے سے گزر رہے

تھے کہ پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست نمودار ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان اپنے اس نئے ملک کی طرف جوق در جوق ہجرت کرنے لگے۔ ملک میں ہونے والے اس سیاسی ہنگام سے محمد علی کا گھرانہ بھی متاثر ہونے لگا۔ شہرہ کا کادیم ہند کے قحطوں سے عمر سے بعد ہی محمد علی کے والد اہل و عیال کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

سندھ کا تاریخی شہر حیدر آباد وہ جگہ تھی جہاں محمد علی کے خاندان نے سکونت اختیار کی لیکن کچھ عرصے یہاں رہنے کے بعد ان کی سنی مکتان منتقل ہو گئی تھی جہاں ملت ہائی اسکول میں محمد علی کو ساتویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ تاہم اس کی فطری ذہانت کو دیکھتے ہوئے قحطوں سے بچنے میں اساتذہ نے اسے ترقی دے کر نویں جماعت میں بھیج دیا۔ ابھی اس نے ملت ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا ہی

تھا کہ گھر والے دوبارہ حیدر آباد میں آئے۔ یہ 1954ء کا زمانہ تھا۔ سندھ کا تاریخی شہر حیدر آباد جو کلہوڑا خاندان کے عہد میں سندھ کا دارالخلافہ تھا اس وقت اپنی آب و ہوا کے حوالے سے بہت مشہور تھا خصوصاً حیدر آباد کی فرحت بخش شاہیں ملک بھر میں بے حد مقبول تھیں۔ اس وقت یہ بات زبان زد عام تھی کہ کراچی کے اکثر رزماء یا سینئر لوگ

حیدر آباد کی شاہوں کا لطف اٹھانے کے لیے اپنا ہر ایک اینڈر حیدر آباد میں گزارنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں کی شاہوں کی ہی وجہ سے اس شہر کے قدیم مکانات اس طرح بنائے جاتے تھے کہ ان میں ہوادان ضرور ہوتا تھا۔ اسی نسبت سے حیدر آباد کو ہوادانوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ افسوس! اب جدید طرز تعمیر نے حیدر آباد کی یہ شناخت ختم کر دی ہے۔

ان ہی فرحت بخش شاہوں کے شہر میں محمد علی کی نوجوانی کا دور گزرنے لگا۔ ان کا گھر فروزی سیمیا کی گلی میں تھا۔ حیدر آباد میں محمد علی کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ گورنمنٹ سنی کالج حیدر آباد سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ مذکورہ کالج شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ کالھہ رانیٹ ہے۔ جبکہ دور درسی پنجاب حیدر آباد کا تاریخی بازار ہے جسے فقیر کاڑہ کہا جاتا ہے۔ محمد علی کی زندگی کے سنہرے دن اسی کالج سے وابستہ ہیں۔ محمد علی پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر تصانیب سرگرمیوں میں بھی نمایاں تھے خصوصاً ان خطابت میں انہیں کمال حاصل تھا اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے کالج کے لیے کئی انعامات جیتے۔

بڑے بھائی ارشد علی ریڈیو پاکستان میں راز دہ آرٹس تھے۔ اس وقت حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن ہوم اسٹیٹ ہال کی تاریخی عمارت میں تھا جو کالھہ چاڑی پر واقع ہے۔ آج اس عمارت میں صرت موبائی



محمد علی زبیر، خوشگوار گھلوں کی ایک یاد

اس انوکھے تجربے کا مذاق اڑایا۔ ہمارے یہاں کی فلمی صنعت کا ہمیشہ سے چلن رہا ہے کہ جس نے فلمی سے تجربات کرنے کی کوشش کی اس کا مذاق اڑا کر حوصلہ شکنی کی گئی۔ فلمی صاحب کے ساتھ یہی کچھ ہوا مگر وہ ان باتوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے

ادو فلم کی موسیقی کا شعبہ کراچی کے ایک گلوکار اور کپڑوں پر نبال عبداللہ کے سپرد کیا گیا۔ اس سے موسیقار کا تعلق بھی ریڈیو سے تھا فلم ”شاہکار“ نام سے شروع کی گئی مگر بعد میں نام بدل کر ”چراغ جلا رہا“ کر دیا گیا۔ اس فلم کی ہیروئن زینبا



تھیں۔ وہ بھی نئی دریافت تھیں۔ محمد علی کوہر دو کا کردار ملا تھا مگر جب انہیں کہانی بتائی گئی تو انہیں دن کا کردار زیادہ پادشہی لگا تو انہوں نے فلمی صاحب سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ”فلمی صاحب! مجھے دن کا کردار نہیں مل سکتا؟“

”کیوں بھی؟ لوگ تو ہیرو کے کردار مانگتے ہیں اور تم ہو کہ ہیرو کو چھوڑ کر دن بننا چاہتے ہو؟“ فلمی صاحب نے حیرت سے کہا۔

”ہاں مجھے دن بننا ہے کیونکہ دن کے کردار میں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ محمد علی نے کہا۔

”سوچ لو بھی! بحر بعد میں ٹھوہ نہیں کرنا۔“

علی زینب فلم ”یادیں“ کا ایک منظر پر دیکھتے ہیں۔ لگے رہے۔ ”چراغ جلا رہا“ کی تمام تر شوٹنگ کراچی میں ہوئی۔ چونکہ تمام فنکار تھے اس لیے دھن کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور شوٹنگ اپنے شیڈول کے مطابق تیزی سے مکمل کے مراحل طے کرتی رہی۔ ”چراغ جلا رہا“ اس حالے سے بھی

خوابیں بولن کا کردار دے دیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو انڈسٹری میں اس فلم کو لے کر چرچے شروع ہو گئے کہ فلمی تمام نئی کاسٹ منصور مار ریڈیو کے فنکاروں کو ساتھ لے کر فلم بنا رہا ہے۔ کچھ نے حیرت کا اظہار کیا تو اکثر نے

موقع ملا۔ بخاری صاحب ریڈیو پاکستان کراچی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر تھے اور ریڈیو کا مستبر تھے۔ ان کی تجربہ شایں نظموں نے جو ان کو محمد علی کے اندر چھپے جو ہر کو دیکھتے ہی پچپان کیا تھا وہ جان گئے تھے کسوں کو جان میں اس کی صلاحیتیں ہیں جو اسے بہت آگے لے جاسکتی ہیں۔

ان ہی دنوں فضل احمد کریم فلمی صاحب کے بارے میں فلمی صاحب فلمی صنعت کے دو عظیم رہنما کاروں حسین فلمی اور سلطان فلمی کے بڑے بھائی تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دنوں بھائیوں کی طرح انہوں نے فلم فن سے وابستہ ہونے کا ارادہ کرتے ہوئے ایک فلم ساز ادارہ ”دہستان محدود“ کے نام سے قائم کر لیا تھا اور اسی ادارے کے تحت ایک فلم کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ فلمی صاحب اپنی پہلی فلم تمام سے چہروں کو لے کر بنانا چاہتے تھے اور اسی لیے نئی کاسٹ کی تلاش میں تھے اور اسی تلاش میں ان کی نظریں ریڈیو کے فنکاروں پر پڑیں کہ تمام سے چہروں کو لے کر فلم بنانا بہت حوصلے کا کام ہوتا ہے اور ایسا تجربہ انڈسٹری میں کم کم لوگ ہی کرتے ہیں مگر جنہیں اپنی صلاحیتوں پر مبرور ہوتا ہے وہی ایسے چیلنج ہیں اور فلمی صاحب کا شمار انڈسٹری کے ان ہی با حوصلہ فلم سازوں میں ہوتا تھا۔ فلمی صاحب نے ریڈیو کے فنکاروں میں فلمی کی چہرے تلاش شروع کیے تو زینبا اے بخاری نے جو جان محمد علی سے انہیں متعارف کروایا۔ محمد علی کی وجہ شخصیت کو دیکھتے ہی فضل احمد کریم فلمی نے اسے فلم میں ہیرو کے کردار کے لیے منتخب کر لیا۔ تھوڑے ہی دن میں فلم کی بقیہ کاسٹ بھی فائنل ہو گئی جو کہ پوری کی پوری سنے چہروں پر مشتمل تھی جس میں سے زیادہ تر ریڈیو کے فنکار تھے۔ فلم کی ہدایت کاری فلمی صاحب نے خود سنہالی

لاہوری کی ہے۔ بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنے ہوئے محمد علی نے بھی 1956ء میں ریڈیو پاکستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ریڈیو پر وہ ڈرامے کرنے گئے اور اپنی صداکاری سے بہت جلد سامعین میں مقبول ہو گئے۔ ڈراموں کے علاوہ وہ بچوں کے مختلف پروگرامز بھی کرتے تھے اس وقت محمد علی کو ایک ڈرامے کا معاوضہ مل روپے کی صورت میں ملا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو پر مصطفیٰ قریشی اور وہید قریشی، قربان جیلانی، بدر باگشی اور حمایت علی شاعر جیسے صداکار کام کرتے تھے۔ ریڈیو پر کام کے دوران انہوں نے حیدر آباد ٹیچر کی ترقی و ترویج کے لیے کئی سخت جدوجہد کی تھی۔ دو تئیس کے مطابق محمد علی ٹیچر کی بھرتی کے لیے دن رات ایک کرتے تھے۔ اسی طرح ٹیچر کے اداکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بہت کوشاں رہتے تھے۔ ان کے احباب انہیں بیمار سے بھورے میاں کہتے تھے۔ ٹیچر کے لیے ان کی کاوشیں جاری تھیں کہ کراچیک براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ان کا تاحولہ بہاول پور ریڈیو کر دیا گیا جہاں انہوں نے کچھ عرصہ کام کیا اور پھر ریڈیو پاکستان کراچی آ گئے۔

کراچی آئے محمد علی کے لیے شہرک ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ اس شہر میں نہ آتے تو شاید تمام عمر براڈ کاسٹر کی حیثیت سے گزار دیتے اور سورا سکرین کو ایسا فنکار نہ بن جاتے جس نے اپنے فن سے ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ کراچی ریڈیو پر محمد علی کو ذوالفقار بخاری کا ساتھ ملا جو ریڈیو بخاری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں بخاری صاحب سے محمد علی کا تعلق اس بچ پر پکچر گیا کہ محمد علی انہیں اپنا روحانی باپ کہنے لگے اور ریڈیو بخاری کو محمد علی کا Mentor of acting کہا جانا لگے گا۔ بخاری صاحب کے زیر سایہ محمد علی کو بہت کچھ سیکھنا

منفرد تھی کہ یہ واحد پاکستانی فلم ہے جس کے لیے معروف ہندوستانی گلوکار طاعت محمود نے گیت گائے تھے۔ فلم مکمل ہو کر 9 مارچ 1962ء میں ریلیز کے لیے پیش ہوئی۔ نئی کاسٹ کے ساتھ فلم بنانا حقیقتاً ایک انوکھا تجربہ تھا اور اب اس تجربے کے نتیجے کا وقت آ پہنچا تھا۔ یہ فلم ایم اے جناح روڈ پر واقع نشاط سینما پر نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اس فلم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس کا افتتاح بالی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا۔

9 مارچ کا وہ دن محمد علی سمیت ان تمام نئے فن کاروں کے لیے بہت اہم تھا۔ ان سب کو خاص طور پر فضل صاحب کو اپنی پہلی کاوش کے نتیجے کا انتظار شدت سے تھا کہ آیا فلم بین ان کی کاوش کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ نوجوان محمد علی کے دل کی حالت بھی اچھل پھل ہو رہی تھی اس نے فلم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا تھا۔ ریڈیو کے حوالے سے تو اس کا ایک نام تھا مگر سلور اسکرین کی کامیابی سے اس کے کیریئر کو ایک راہ مل جاتی۔ فلم کار پریمر شوخم ہوا تو ہر کوئی فلم کی تعریف کر رہا تھا خصوصاً ہیرو سے زیادہ محمد علی کے کام کو سراہا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نہ صرف نوجوان محمد علی کو خاصہ حوصلہ ملا تھا بلکہ ہدایت کار سمیت پوری ٹیم خوشی سے سرشار تھی۔ محمد علی کے لیے وہ دن بہت عجیب تھا جب وہ پریمر شوخم میں شرکت کرنے آئے تھے تو ایک گمنام نوجوان تھے مگر جب وہ سینما سے نکل رہے تھے تو دیکھنے والا بے اختیار پکار اٹتا تھا۔ ”وہ دیکھو.....“ دلن جا رہا ہے۔“ محمد علی نے دلن کے کردار میں اپنی کردار نگاری کے کچھ ایسے رنگ بھرے تھے کہ اس کے آگے ہیرو مانعہ پڑ گیا تھا۔ ہیرو کا کردار عارف نامی ایک نوجوان نے کیا تھا مگر وہ محمد علی کے

سامنے دب کر رہ گیا تھا اور پھر وہ کبھی فلم اسکرین پر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اس امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان محمد علی کو کردار کو پہچاننے کی کیسی غضب کی شدید تھی حالانکہ یہ ان کی پہلی فلم تھی مگر اس نے شخص اسکرپٹ پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ کس کردار میں زیادہ مارجن ہے اور پھر اپنے اس فیصلے کو درست بھی ثابت کر دکھایا۔ ”چراغ جلتا رہا“ کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم نے کراچی میں سلور جوبلی سنائی مگر انڈسٹری کی اندرونی روایتی چچکاش کے باعث ملک کے دوسرے حصوں میں اس کی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کی ایک اور خصوصیت اس حوالے سے بھی رہی کہ فلم جب سنسر کے لیے اسلام آباد گئی تو یہ فلم خصوصی طور پر اس وقت کے صدر جنرل ایوب خان نے دیکھی تھی۔ انہیں بھی یہ فلم پسند آئی تھی۔

”چراغ جلتا رہا“ کے بعد محمد علی نے تین فلمیں کیں جن میں ہدایت کار منور رشید کی فلم ”بہادر“ ہدایت کار اقبال یوسف کی ”دال میں کالا“ اور ہدایت کار جاوید ہاشمی کی ”دل نے تجھے مان لیا“ شامل تھیں۔ ان تینوں فلموں میں محمد علی دلن کے روپ میں ہی نظر آئے۔

سال 1963ء محمد علی کی زندگی میں ایک اور موڑ لے کر آیا۔ اس برس بطور ہیرو ان کی پہلی فلم ”شرارت“ ریلیز ہوئی۔ فردوس بیگم ان کے روبرو ہیروئن کے روپ میں تھیں۔ اس فلم نے بھی اچھا پرنس کیا۔ نوجوان محمد علی نے اب تک جتنی فلمیں کی تھیں وہ سب کی سب کراچی کی تھیں۔ فلموں کا اصل گڑھ یعنی لاہور کے اسٹوڈیوز میں انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا مگر اس کے لیے محمد علی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے برس یعنی 1964ء میں فلم ”خاندان“ میں انہیں بطور ہیرو کاسٹ کیا گیا۔ لاہور کی فلم نگری میں قدم رکھا تو انہوں نے کراچی کو مستقل

نیر باد کہہ دیا اور لاہور میں ایک فلیٹ خرید کر کے رہائش اختیار کر لی۔ 1964ء میں ہی ان کی ایک اور فلم ”خاموش رہو“ ریلیز ہوئی۔ یہ فلم ان کے کیریئر کے لیے بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ ”خاموش رہو“ میں ان کی اداکاری کو ناقدین اور عوام الناس نے بے حد سراہا اور وہ فلمی حلقوں میں موضوع گفتگو بن گئے اور انہیں کے بعد دیگرے فلمیں ملنے لگیں، تاہم محمد علی کو کسی ایسی فلم کی تلاش تھی جو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے۔

خوش قسمتی سے جلد ہی ان کے کیریئر میں وہ فلم آگئی۔ ہمایوں مرزا کی زیر ہدایت فلم ”آگ“ کا



ایک ایوارڈ تقریب میں محمد علی اور زیبا

جوڑی اس قدر مقبول ہوئی کہ حقیقی زندگی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس وقت اس قسم کی افواہیں گردش کرنے لگیں کہ محمد علی شیم آراء

کی منگنی ہو گئی ہے، تاہم اس منگنی کی دونوں نے نہ تو تردید کی اور نہ ہی تصدیق جس سے اس افواہ کی صداقت پر یقین ہونے لگا۔ اب ان کی منگنی ہوئی تھی یا نہیں مگر اس بات میں دورانے نہیں تھیں کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس کی پردہ داری تھی مگر پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ اس بے نام تعلق میں دراڑ پڑ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ شیم آراء کے بعد محمد علی کا تعلق ایرانی اداکارہ شہ بارہ سے جڑ گیا۔ یوں فلمی صحافیوں کے ہاتھ ایک اور کہانی آ گئی مگر اس کہانی کا انجام بھی اس وقت ہو گیا جب محمد علی ایران گئے تو ان پر کھلا کہ مذکورہ اداکارہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد یہ

اعلان ہوا تو کاسٹ میں ہیر و ہیر و کن کے طور پر محمد علی اور شیم آراء تھے۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ اس فلم سے محمد علی کو سپر اسٹار اسٹیٹس حاصل ہوا۔ ”آگ کا دریا“ ہی کی کامیابی کے باعث محمد علی اور شیم آراء کی جوڑی بھی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ 60ء کے عشرے میں یہ جوڑی فلم بینوں کی پسندیدہ ترین فلمی جوڑیوں میں سے ایک تھی۔ اس فلم کی نقید المثل کامیابی سے محمد علی کی زندگی کا رخ یکسر بدل گیا تھا۔ اب ان کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا اور ہر فلم سازی ہدایت کار اپنی فلم میں انہیں کاسٹ کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب وحید مراد جیسا چالکی ہیر و

انگریزی دم توڑ گیا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہدایت کار قبال یوسف اپنی فلم ”تم ملے بارلا“ کی عکس بندی کے لیے اپنے یونٹ کو کراچی کے گئے تھے اور دزد و شب قلم کی شوٹنگ حیزی سے جاری تھی۔ اس قلم کے بہرہ ور محمد علی اورزی تھے۔ ان دونوں نے اپنے قلمی سفر کا آغاز ”چراغ جٹا رہا“ سے کیا تھا۔ ”ہم زبیا“ محمد علی کی ہیروئن تھیں جن میں اورزی اور ایک دوسرے سے دور دور پر تھے مگر اس قلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے چلے گئے اور کیو پڈ کا تھیر ایسا چلا کہ بہت جلد محبت میں بدل اور پھر شادی کے سینے برسوں میں دخل لگی۔

محمد علی نے زبیا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تاہم محمد علی نے شہید کو بھل گئی تھی کی طرح محبت دی۔ وہ اسے اتنا چاہتے تھے کہ اسے یہیں تک کہتے تھے۔ محمد علی کا قلمی سفر تیزی سے عروج کی جانب گامزن تھا۔ ان کی ہر نئی فلم خوب برس کر رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں محمد علی جو جوانوں کا craze بن گئے تھے۔ مراد شاہ جہت سے مالا مال ان کی شخصیت اس پر مبنی تھی کہ بھرپور دلکش آواز چارچاند لگا دیتی تھی۔ وہ کردار کو حقیقی رنگوں سے سجا دیتے تھے۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ لمبے میں چہرے کے تاثرات بدلنے میں کمال رکھتے تھے۔ اس پر جذباتی مکالموں کی ایسی ادائیگی کہ قلم بینوں کی آنکھوں سے واقفانہ آئینہ نگاہ پڑتے تھے۔ نقادوں نے انہیں شہنشاہ جذبات کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے قلم سازوں نے کردار نگہوں نے شروع کر دیئے تھے خاص طور پر ایسے کردار جن میں ہیرو کو ایک وقت تو جوان سے لے کر بوڑھے کا کردار کرنا ہوتا تھا۔ ایسے کرداروں کے لیے محمد علی موزوں ترین ہیرو تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں درسائیل فنکار تھے۔ انہوں نے کھلڈر سے ہیرو کے کردار جتنی آسانی سے کیے اتنی ہی آسانی سے تاریخی کردار بھی ادا کیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخی قومیت کی فلموں میں تاریخی کرداروں کے لیے ان سے بہتر انتخاب کوئی نہ تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ جج نواب ڈاکو کو تاریخی کردار اور باجیت افراد کے کردار ادا کرنے کے لیے وہ انگریز فنکار تھے۔

محمد علی ہمیشہ فن کار تو سب کے سامنے عیاں تھے لیکن یہ بات شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ ان میں وطن کی محبت کو ہمارے کبھی کی فلموں کی 1971ء کی جنگ کے بعد ہمارے کی قید سے رہائی کے لیے والے ہمارے فوجی جوان جب پاکستان آئے تو محمد علی ان کا

استقبال کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ 71ء کی جنگ کے فوری بعد ہونے والے ماسکو کے قلمی سیلے میں محمد علی نے سیاہ لباس زیب تن کیا تھا جو ان کی طرف سے ہمارے خلاف احتجاج تھا۔ اپنے عروج کے دنوں میں ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ بھٹو کے دور حکومت میں اسلامی سربراہ کاٹھنرٹس کا انعقاد لاہور میں ہوا تو سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل نے محمد علی کے کمر



پر ہی قیام کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی کا فراج محمد علی کو اس وقت دینا پڑا جب ضیاء دور حکومت میں انہیں پانچ ماہ کی جیل ہوئی۔ اس سے پہلے 1976ء میں ایک جیلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی حمایت کرنے پر کراچی میں ان کی فلموں کا باجیت بھی ہو چکا تھا جو اس ماہ تک جاری رہا تھا محمد علی کی پانچ ماہ کی قید کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ یہ 1981ء کا ذکر ہے ضیاء الحق نے لاہور کی تقریباً تمام قابل ذکر شخصیات کو جیل میں قید کر دیا تھا۔ ان میں حمید اختر، شعیب ہاشمی، حبیب جالب، محمود علی قصوری، مظہر علی خان، عبداللہ ملک، رضا کاظم اداکار، حبیب کراؤ، رشید

کے لیے سووری بعد یہ نیا جوڑا آج اور صبر سے کی ادائیگی زبیا کی یہ تیسری شادی تھی محمد علی سے پہلے وہ اداکار سید اور عبداللہ صاکی کی عکس کی چوٹی رہ چکی تھیں۔ عبداللہ صاکی نے زبیا کی ایک بیٹی شہینہ بھی جبکہ محمد

دوسری قسم نے جیت لی۔ حبیب جالب اس بار پر اتنے شدید غصے میں تھے کہ انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ تاقین اس قسم کی لڑائیوں اور نا اہلیوں کے باوجود محمد علی اور حبیب جالب میں دوئی اور رشتہ قاتح ناٹنے سے فارغ ہو کر دوبارہ جیت تاش کے کربچہ جاتے اور ہر بازی پر سگریٹ کی ڈبی لگا جاتی۔ ایک بار تاش کھیتے ہوئے حبیب جالب نے بازی میں دوڑیں جیتیں اور دونوں اگلی بازی میں لگا دیں۔ وہ بازی بھی حبیب جالب جیت گئے تو چاروں ڈبیاں بازی میں لگا دیں۔ یہ بازی بھی جالب صاحب کے نام ہی اور وہ آٹھ ڈبوں کے مختار بن گئے۔ پاس بیٹھے میز پر انہیں سمجھا کہ بس اب باز آ جاؤ سگریٹ کی یہ ڈبیاں آٹھ دنوں کے لیے کافی ہیں مگر حبیب صاحب نہیں مانے اور اگلی بازی میں یہ آٹھ ڈبیاں لگا دیں مگر یہ بازی محمد علی جیت گئے۔ اکثر یوں ہوتا کہ محمد علی کو جب یہ چلا کر حبیب صاحب کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں تو وہ جان بوجھ کر بار جاتے اور یوں حبیب جالب کی مگرینڈ کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ جیل میں محمد علی کا کھانا کمرے آتا تھا جسے وہ جیل کے دوستوں کے ساتھ ل کر کھاتے تھے۔ ان کے دراج اکثر مشاوری اور پھلوں کے ٹوکے سے بھرتے تھے جنہیں وہ قیدیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ محمد علی جتنے بڑے فنکار تھے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایسا ہیرا بیاں دل دھڑکتا تھا جو ہر دقت ہر ایک کی پریشانی اور تکلیف دور کرنے کو کچلا رہتا تھا۔ ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب انہوں نے مشکل کے وقت میں اپنے دوستوں اور ساتھی فنکاروں کی اور ایسے لوگوں کی بھی مدد کی جن کا آنے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا شرا ریاض شاہد کی فلم ”اسن“ سنسکر کے

”نوشاد اپارو“ سے بھی نوازا گیا تھا۔

محمد علی نے اپنے کیریئر میں تقریباً پچاس ہیردوں کے ساتھ کام کیا ہے جو خود اپنی جگہ ایک انفرادیت ہے۔ ان کی جوڑی سب سے زیادہ زبانیہ سیک کے ساتھ پسند کی گئی۔ زبیا اور محمد علی نے ایک ساتھ کل 70 فلموں میں کام کیا جن میں 59 فلمیں ایک ہی جیل جن میں وہ ہیرد ہیرد کی حیثیت سے بروہ سیکس پر چلے گئے ہوئے۔ ان میں ایک بھارتی فلم ”کلرک“ بھی شامل ہے۔ یہ جوڑی پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے قابل احترام جوڑی بھی جانی جاتی اور علی زیب کے نام سے مشہور ہے۔ اس جوڑی کی کامیاب فلموں میں ”تم نے ہمارا ملا انسان اور آدمی“ انصاف اور قانون“ انسانہ زندگی کا دامن اور جنگاری“ پھول میرے گلشن کا“ جب پھول کھلے“ تو کرمیت زندگی میں“ شمع“ عورت ایک پھیلی“ بیسی فلمیں شامل ہیں۔ اسی جوڑی کی بطور ہیرد وین فلم ”ہیل کا شیل“ بھی 1964ء میں ریلیز ہوئی۔

سنہ کے ساتھ محمد علی جالب فلموں میں نظر آئے جن میں سے 32 فلموں میں یہ دونوں ہیرد وین تھے محمد علی سنہ کی پہلی فلم ”اسرا“ (1969ء) بھی اور آخری فلم 1987ء میں ریلیز ہوئے والی ”تیری ہاتھوں میں“۔ ان کی جوڑی کی بڑی فلموں میں ”دور باں“ اور ”اس پاس“ شامل ہیں جبکہ ”باورانی“ اچھے مایا آئینہ اور صورت“ انتخاب“ اور ”نصیب“ اس جوڑی کی قابل ذکر فلمیں ہیں۔

دیبا اور محمد علی ”چراغ جلا رہا“ میں متعارف ہوئے جس میں دونوں کے سائیز رول تھے۔ بطور ہیرد وین اس جوڑی کی پہلی فلم ”نول کے گلے“ کی اور آخری فلم ”کمرے کے قاتل“ رہی۔ دونوں 20 فلموں میں اکٹھے نظر آئے جن میں سے 19 فلموں میں مرکزی کردار کیے۔ دیبا محمد علی کی فلم ”آئینہ“

ہے جبکہ اس جوڑی کی قابل ذکر فلموں میں ”دل کے نکلنے“ حقیقت“ شکر“ اور ”مہر“ شامل ہیں۔

رانی اور محمد علی 33 فلموں میں جلوہ گر ہوئے جن میں سے 13 فلموں میں بطور ہیرد وین نظر آئے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ”مسند خان“ اور آخری فلم ”خون اور پانی“ تھی اور قابل ذکر فلموں میں ”شبنم ہزار داستان کاؤ“ سیاتر میں مارگرٹ بنام شامل ہیں۔

محمد علی اور جی آرماء کی جوڑی 60 کے عشرے کی مقبول ترین جوڑی تھی۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ”آگ کا دریا“ ہے یہیں وہ فلم سے جو محمد علی کے کیریئر کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ اس جوڑی کی ایک سربز پر ہٹ فلم ”ساعت“ تھی۔ ”دستی“ بھی اس جوڑی کی بڑی فلموں میں سے ایک ہے۔ اس جوڑی نے کل دس فلمیں کیں جن میں سے 9 میں مرکزی کردار ادا کیے۔ اس جوڑی کی آخری فلم ”خاک اور خون“ تھی۔

گیتیا کے ساتھ محمد علی 18 فلموں میں نظر آئے جن میں سے آٹھ میں وہ گیتیا کے ہیرد وین۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ”انصاف اور قانون“ تھی اور بطور ہیرد وین پہلی فلم ”تیرے میرے سینے“ ہے۔ ”عورت ایک پھیلی تھی میرا ہیام“ اور ”جانے نہیں دوں گی“ اس جوڑی کی سپر ہٹ فلمیں ہیں۔ ممتاز اور محمد علی پہلی بار ”تم سلاطین رو“ میں ایک ساتھ دکھائی دئے تاہم ہیرد وین کی حیثیت سے اس جوڑی کی پہلی فلم ”عورت اور سیرت“ ہے۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ”منزل“ ہے جبکہ قابل سائنس فلموں میں ”آن وانا سنگرام“ اور ”ذریعات“ شامل ہیں۔

فردوس اور محمد علی یوں ”غدار“ نامی فلم میں پہلی بار نظر آئے تاہم ”ناگے ناگے جین“ بطور ہیرد وین اس جوڑی کی پہلی فلم تھی۔ اس جوڑی نے کل

12 فلمیں کیں اور 7 فلموں میں مرکزی کرداروں میں نظر آئے۔ اس جڑوی کی کامیاب فلمیں "جاگ اٹھا انسان" اور "سردک کی گود" ہیں۔

بابر شریف کے ساتھ محمد علی نے یوں تو 33 فلمیں ہی بن کر ان کی شخصیتوں کو روپ میں نظر آئے۔ میں یہ دونوں بیزیر ہون کے بعد ہی سب سے نظر آئے۔

بابر کے چھوٹے بھائی کی وجہ سے محمد علی کے ساتھ سوئٹ نہیں کرتی تھیں۔ "فلم" "ملاحین" میں بابر نے محمد علی کی بیٹی اور دو لڑکیاں کا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

محمد علی نے کل 277 فلموں میں کام کیا جن میں سے 248 اردو 17 پنجابی 9 پشتو 2 ڈبل ڈورن ایک ہندی اور ایک بنگالی فلم ہے جبکہ ایک دستاویزی فلم میں ان کی خوبصورت آواز کو شامل کیا گیا ہے۔

محمد علی نے ایک خاص انداز سے زندگی گزار دی۔ علی زیب کو فلمی دنیا کی شاہانہ جڑوی کہا جاتا تھا۔ محمد علی کا رہن اور نصیب و برخاست کی ہیشہ سے کم نہیں تھا۔ لاہور میں محمد علی کی کوئی ایسی پرستش تھی کہ کسی بادشاہ کا دل لگی تھی۔ ان کا انداز زندگی بھی شاہانہ تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جب وہ ملک سے باہر جاتے تھے تو اعلیٰ ترین ہوٹل کے اعلیٰ کمرہ میں رہاؤں اختیار کرتے تھے حتیٰ کہ امریکہ میں بھی پانچ ستارہ ہیٹ سٹار ہوٹل کے ڈیسک کرے ان کا انتخاب ہوتے تھے۔

یوں تو محمد علی نے 277 فلموں میں کام کیا لیکن انہیں ایک فلم میں کام کرنے کا چھتاوا ہمیشہ رہا اور وہ فلم منوج کار کی ہندوستانی فلم "ملک" تھی محمد علی ان کے کہتے تھے کہ "ملک" میں کام کرنا ان کے کیریئر کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ دراصل "ملک" کے معاملے میں ان کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان گئے تھے تو منوج کار جو ان کے دوستوں

محمد علی کے کیریئر سے بہت سے منفرد اعزازات جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستانی فلموں کا ایسوسی ایٹ ڈسٹری بیوٹر کا خطاب ملا۔ دہلی میں انہیں پاکستان کے یوں فٹ کار کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ پاکستان کے علاوہ برطانیہ امریکہ کویت ترکی سعودی عرب چین اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر مقبول فن کار تھے۔ وہ پاکستان کے واحد اداکار ہیں جنہیں تینہ امتیاز سے نوازا گیا۔ چار مارچ 2010ء کو امریکی نشریاتی ادارے سی این این نے ایک سروے کے تحت ایشیا کے 25 بہترین اداکاروں کی فہرست بنائی تو محمد علی بھی اس میں شامل

اپنے پرانے گھر اور پرانے واقف کاروں سے ملا چائے بس اسی خیال کے تحت ڈرامیٹر کو ساتھ لیا اور حیدر آباد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی گاڑی جب حیدر آباد شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو جیتے نکھوں کی تمام یادیں جیتے جاتے منظر کی صورت اُن کی نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ مٹی کا گج میں غالب علی کے دور کا تو جوان ہوم اسٹیٹ ہال میں واقع سامنے آ گیا۔ منظر بدل گیا تو ہوم اسٹیٹ ہال میں روکشیاں ریڈیو پاکستان کا بائیکر دوکان ان میں سرگوشیاں کرنے لگا اور ریڈیو کے پرانے دوست اور ساتھیوں کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔



تھے۔ ان کے علاوہ ایم اور حیدر ابھی اس فہرست کا حصہ تھے۔ دوں نگار ایوارڈ اور تینہ حسن کارکردگی بھی ان کے فن کا ثبوت ہے۔ یہ تینہ 1984ء میں اُسی فیما مین نے انہیں عطا کیا تھا جس نے ہینڈل پارٹی کی حمایت کرنے پر انہیں جیل میں بند کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے واحد فن کار تھے جن کی ذات کو مد نظر رکھ کر افسانہ لکھا گیا۔ اُس افسانے کا عنوان "محمد علی کا ڈرامیٹر" تھا۔ اس کے مصنف ناصر رضا تھے۔ انہوں نے یہ افسانہ کرشن چندر کے افسانہ "دب لکھنا تانی" سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

یہ زندگی کے آخری ایام کا قصہ ہے۔ ایک روز اچانک اُن کے دل میں خیال آیا کہ حیدر آباد جا کر

سڑک "آر آر کول" رانی باغ کا قیصر اور بھی جانے کیا کچھ ان کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ وہ اسی کی ان ہی سنہری یادوں میں گم تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی محمد علی نے چونک کر نظر س اٹھائیں گاڑی عین اُس گلی کے سامنے ٹھہری تھی جہاں اُن کا پرانا گھر تھا۔ انہوں نے گردن تھا کر سڑک کے اُس بار نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ جس جگہ فردوس سنبھا ہوا کرتا تھا اب وہاں بیڑول پپ دجود میں آ چکا تھا۔ یہ ایک فلم انڈسٹری کے عروج و زوال کی پوری کہانی بیان کر گیا اور اُن کی آنکھیں جھپک گئیں۔ ڈرامیٹر گاڑی کو گلی کے اندر لے جانا چاہتا تھا مگر محمد علی نے اسے روک دیا اور گاڑی سے اتر کر



داعش اور چہرے سپر ہوش نشان

گل جید کا خیال
غلامیں حد سے بڑی ہیں کئی پھوٹے گی کرن؟
اب مقدر میری حرقی کا سنور جائے گا

آسکر ابورڈو یافتہ پہلی پاکستانی شرمین عبید چٹانے کے کیرئیر کی حقیقی کہانی

”سیوینگ فیس“ صرف تیزاب سے جلانے گئے عورت کے چہرے کی تصویر نہیں ہے ان ظالم اور بے رحم مردوں کے خلاف کی جانے والی جدوجہد کا نام بھی ہے جو زندگی خلیصہ ورنی اور روشنی کے دشمن ہیں۔ شرمین عبید چٹانے کی اس دستاویزی فلم نے



مارچ 2006ء کو اختتام پذیر ہوئی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ محمد علی جج گیارہ بجے ہاتھ دھو کر لیے لہسز سے اٹھے مگر انہی چند قدم کر اٹھائے تھے کہ لڑکھڑا کر بینڈروم کے فرش پر ہی گر پڑے۔ آواز سن کر زہرا دھڑکی دوڑی آئیں اور محمد علی کو فرش پر گرا ہوا دیکھ کر اپنے ملازم عباس کو آواز دے کر پکارا۔ ملازم اور زہرا نے سہارا دے کر انہیں کرسی پر بٹھایا مگر ان کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی فوراً ڈاکٹر کو بلوایا گیا مگر

زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ تقریباً دن ڈیڑھ بجے محمد علی نے کلہر شہادت پڑھا اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور ذرا اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اُس وقت بیٹی شمیمہ امریکہ میں تھی۔ باپ کی وفات کی خبر سن کر وہ دوڑی چلی آئی اور اس کی آمد کے بعد محمد علی کا جنازہ آہوں و سسکیوں کے ساتھ اٹھایا گیا۔ نماز جنازہ 21 مارچ بروز منگل کو بعد نماز ظہر گلبرگ کے سامنے واقع میدان میں ادا کی گئی اور پھر ان کا جسدِ خاکی لاہور میں حضرت میاں میر صاحب کے مزار کی چوکھٹ پر سپرد خاک کر دیا گیا۔

محمد علی نے 75 برس دنیا کے سٹیج پر اپنا کردار بخوبی ادا کر کے اپنے مختصر کلام کی صورتِ شیت کر کے اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے اور اپنے لاکھوں پرستاروں کو سو کا کر گئے۔

☆☆☆

پیدل گلی میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر گلی میں شور مچ گیا۔

”ارے..... تو محمد علی ہیں۔“
”دیکھو محمد علی آئے ہیں۔“

گلی میں موجود لوگ خریب آ کر معافہ کرنے لگے اور وہ رواجی مسکراہٹ کے ساتھ سب سے ملنے ملائے اپنی آبا کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ آبا حیدر آباد کے معروف صحافی مسعود جاوید کی والدہ تھیں اور اسی گلی میں برسوں سے رہتی تھیں۔ محمد علی انہیں آبا کہا کرتے تھے وہ بھی شورش کر گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ محمد علی نے انہیں سلام کیا تو آبا نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔

”بہنو نہیں لائے؟“

اس نے نگنا سوال سے ہی اعزاء کیا پاسکا ہے کہ ان کا محمد علی سے کیا تعلق تھا۔
”آبا! جلدی میں آیا ہوں اب آؤں گا تو آپ کی بہنو خیر در لاؤں گا۔“ محمد علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا مگر انہیں دوبارہ حیدر آباد آنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

گھر والوں کا منہ دوستوں کے لیے بھورے سیانہ ساچی ادا کاروں کا علی بھائی اور کٹی سٹائونڈ فتادوں کے اس شہنشاہ و جذباتی میجر پر زندگی 19

جو ایک گورت ہونے کے باوجود انہیں دستاویزی فلم سے وابستہ ہے شمار مردوں سے ممتاز کرتی ہے۔ 2010ء میں شرمین کو ان کی ایک نہایت ہی خوبصورت، باہمی دستاویزی فلم ”چلڈرن آف دی پاکستان“ چنانچہ نیشنل ایچی ایوارڈ دیا گیا تھا۔

شرمین عبید چٹائے نے زندگی کی زمین پر اپنا پہلا قدم شکر کچی میں پیدائش کی صورت 1978ء میں رکھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی صورت Smith College امریکہ سے انکاس میں بیچری ڈگری پھر امریکی یونیورسٹی آکسفورڈ سے انٹرنیشنل ایسی اسٹڈیز کے علاوہ کیونٹی کینن میں ماسٹرز کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ صحافت اور سیاسیات کا علم حاصل کرنے والی شرمین نے فلم میکنگ کے حوالے سے کوئی ڈگری نہیں لی۔ اس حوالے سے وہ گفتگو کے درمیان پوچھے جانے والے ایک سوال کے جواب میں کہتی ہیں۔

”میں دورانِ تعلیم امریکہ سے چھٹیوں پر پاکستان آئی تھی تو یہاں موجود افغان مہاجرین کا ایک کیمپ دیکھنے کی گئی۔ وہاں میں نے ان کی خصوصیات بچوں کی جو حالت دیکھی تھی تو ان کے بارے میں ڈاکیومنٹری بنانے کا سوچا تھا۔ میں ہمیشہ سے اپنی شخصیت ڈاکیومنٹری فلموں کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی جو اپنے دیکھنے والوں تک کوئی بڑا باہمی پیغام پہنچانے کا باعث بنتی ہوں۔“

2002ء میں شرمین نے تعلیم کے حصول کے بعد پاکستان واپسی پر دستاویزی فلم کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اس پہلی فلم میں ان کے ساتھ اسمتھ کالج اور نیویارک ٹائمز نے فنڈز کی صورت تعاون ہی نہیں کیا تھا بلکہ فلم سازی کے equipments کے علاوہ اور دوسری سہولیات بھی فراہم کی تھیں اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ چلتی ہی چلا گیا تھا جس کے نتیجے میں شرمین

اب تک سولہ دستاویزی فلمیں بنا چکی ہیں اور ”چلڈرن آف دی طالبان“ کی لاسٹ جزیئرٹن میوزم چلڈرن پاکستانیڈ بلی ٹیم ڈوئن آف دی ہولی ٹنگ ڈوم“ اور ”افغانان ویلڈ“ فلمیں تیس ایس این این چینل فوژی ٹی وی انجریہ ڈائجسٹ ایس او سے دکھائی جا چکی ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ ”دوئن آف دی ہولی ٹنگ ڈوم“ سعودی عرب کی ایک خاتون کے حوالے سے وہ ڈاکیومنٹری ہے جس کی شوٹنگ کی اجازت شرمین کو سعودی حکومت نے پہلی بار نہایت خصوصی طور پر دی تھی۔

شرمین عبید چٹائے کا تعلق ان لوگوں کے قبیلے سے ہے جو زندگی کو گزارنے نہیں رہتے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے زندگی نامے پر اپنے کام کی صورت ایسے دستخط پر یقین رکھتے ہیں جو وقت کی کتاب پر رشاقت کا باعث ہے۔ سو وہ دستاویزی فلموں کی تخلیق والے کام کے ساتھ سماجی امور اور ”سٹیٹیزز آف آرکائیو آف پاکستان“ نام کے ایک ادارے کی روح رواں بھی ہیں اس ادارے کا بنیادی مقصد اور کام تاریخ پاکستان کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ بنانا ہے۔

”سیونگ فیس“ شرمین کے اس آسکر ایوارڈ یافتہ کام کا خیال ان کے سماجی ڈائریکٹر ڈینیل ریک کے ذہن میں آیا تھا کہ پاکستانی خزاہ برطانوی ڈاکٹر محمد جواد کی زندگی اور ان کے کام یعنی پاکستان میں تیزاب کا شکار عورتوں کا علاج ڈاکیومنٹری کا موضوع بنایا جائے۔

”سیونگ فیس“ کی کہانی جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی دو ایسی عورتوں (رزشانہ اور ذکیہ) کا لوحہ ہے جن کی زندگی تیزاب میں گھول دی گئی۔ اس ڈاکیومنٹری میں ان تیزاب کا شکار ہونے والی عورتوں کا علاج ان کے معالج پاکستانی خزاہ برطانوی ڈاکٹر

محمد جواد کی ان عورتوں کو زمانے کے آئینے کے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش اور ان عورتوں پر تیزاب پھینکنے والے مردوں کے خلاف معاشرے اور عدالت میں آواز اٹھانی، کس لائق راوی لینڈز کی دیکھ کر کی جھو جھوٹی موجود ہے جس کا حاصل جرم کا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ اسلام آباد راوی لینڈز اور جنوبی پنجاب کے بہت سے مضائق مقامات پر کی گئی۔ یہ فلم سب سے پہلے امریکہ میں ریلیز کی گئی تھی اور اکتوبر 2011ء میں آسکر کے لیے نامزد ہوئی۔ اس ایوارڈ والی نامزدگی اور پھر ایوارڈ کے حصول سے پہلے شرمین اور خاے ام ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں انٹرنیشنل ایچی ایوارڈ، لیٹنن ایوارڈ فار بیک جریٹس ساتھ ساتھ انٹین ائیو ایس ایس ایوارڈ، ون ویلڈ میڈیا جریٹس آف دی ایئر ایوارڈ، لیکوڈ ڈیو لپو لپو ٹائٹ ایوارڈ کے علاوہ سنے کو لائن ایگل ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

اپنی اس کامیابی پر شرمین کہتی ہیں۔ ”ایک مرد اپنے غصے نفرت اور تاقام میں غور سے چہرے پر تیزاب پھینکنے میں ایک لمحہ کا گناہ نہیں دے تیزاب کا شکار عورت ساری زندگی اس مذہب کو چھینکتی ہے۔ اس موضوع کو ڈاکیومنٹری ”سیونگ فیس“ کی شکل

دینے میں میں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔ ہم نے اس پر بہت محنت کی، میں اس کام کے حوالے سے یہ امید تو یقینی طور پر تھی کہ ”سیونگ فیس“ کو بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بہت زیادہ Acknowledgement حاصل ہوگی لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ آسکر کے لیے نامزد نہیں ایوارڈ بھی حاصل کرے گی۔“

شرمین ایک اچھی پروڈیوسر اور ڈائریکٹری نہیں ایک مندرجہ اور خیال رکھنے والی کہانی کار بھی ہیں۔ تقریباً چودہ چودہ برس کی عمر میں پہلی کہانی

لکھنے والی شرمین اس کام کے حوالے سے کہتی ہیں۔ ”میں اپنی کہانی کے لیے ان موضوعات کا انتخاب کرتی ہوں جن کی طرف لوگ اوجھلے والوں کی نظر نہیں جاتی ہے۔“

شرمین عبید چٹائے اپنے کام کے حوالے سے ایک خاص نام آسکر کے حصول کے بعد بہت خاص کا درجہ حاصل کرنے والی شرمین عام زندگی میں ایک عام ہی عورت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی پانچ بیٹیاں اور ایک بھائی ہے۔ شادی شدہ زندگی کی حامل شرمین ایک اچھی بیٹی، بہو ہونے کے علاوہ ایک پیاری بیٹی تقریباً ڈیڑھ دو سالہ ایلیا کی ماں بھی ہیں۔ اپنی تمام تر مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر کہہ کا سودا خود لانے اور پکانے کی شوٹیں شرمین کو اس فلم کی دینا سے رشتہ جوڑے تقریباً گیارہ برس کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس دوران میں بہت سے ایسے مقام آئے جس شرمین کے کام کو وہ تمام اور اہمیت دیتی تھی جس کے لیے وہ اور ان کا کام کا deserve کرنا تھا لیکن شرمین نے بہت جلد سے ہی ہمت ذہانت اور مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری رکھا ہے اور یہ ”سیونگ فیس“ کا آسکر حاصل کرنا ہی کارمطل کا Reward ہے۔

موجودہ وقت میں ہمارے پیارے ملک پاکستان کے چہرے کو بے شمار لوگ ہیں جو انداز غرورنے کی کوشش کر رہے ہیں، کرپشن، دہشت گردی، مذہبی انتہاپنڈی اور خواتین کے ساتھ غیر انسانی سلوک..... ان داغوں کے درمیان اس داغدار چہرے پر عزت اور کامیابی کا یہ نشان بہت قیمتم ہے۔ اہمیت کے اس احساس پر دل کی گہرائیوں سے

Thanks to Shameen!

محمد رضوان قیوم

انکسے بچ چکا ہوں

مذہب سلطانہ محل کا خیال

شرکی جب میرے خرابے کا مقدر ٹھہری
میں نے چاند تاروں سے فیاہ ماچی گئی

برہنہ پائستہ کی گر خاراہ پر چلنے والی ایک باجھلا صورت کا قصہ خاص



اماں کے چہرے پر شہنشاہی ڈال کر نہیں ہوش
میں لایا گیا اور ہم روتے بیٹے کھر پینے چھوڑی دیر
بہرا باکی میت کھر کے باہر کاٹھ کی چار پائی پر رکھ دی
گئی کینکڑا آئین میں آئی جگہ نہ گئی۔ کھر کے اندر ہم
بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔
ماں اپنے سر پر پٹی باندھے تین کر رہی تھی کہ اب
ہمارا سہارا کون سنے گا؟ ہمیں کس کے سہارے
چھوڑ گئے ہو؟ اماں کی اس آہ زاری کی وجہ سے ہمارا
دل اور تڑپ جاتا اور دم اور زور زور سے رونے
لگتے۔

ابھی اماں کی میت کھر کے باہر ہی رکھی ہوئی تھی کہ
ہمارے کھر میں پرکاش سنہرا اس کے تین چار نوکر اور
اس کا بیٹا سر کی پرکاش آئے رونے ماں نے ان کا چہرہ
دیکھا تو چلائے ہوئے کہا۔

”کاش میرا مجبور فریب خاوند تمہاری حویلی میں

لے جاتے ہوئے اوپر ہی سڑی پر سے پاؤں پھسل
جانے کی وجہ سے مر گیا تھا۔۔۔۔۔ اماں کی موت کی خبر سن کر
اماں میں اور بھائی روتے بیٹے پرکاش سنہری حویلی
پہنچے تو وہاں ان کی میت حویلی کے باہر خون میں
نشری ہوئی پڑی تھی جس کے گرد گاؤں کے اکثر
دیہاتی ہندو سکھ کھڑے تھے۔ ان میں اکا دکا
مسلمان بھی تھے۔ اماں تو باکی میت دیکھتے ہی کر کر
بے ہوش ہو گئی تھیں جبکہ میں اور تو صیف! اماں کی لاش
سے چمٹ کے رو رو کر ہکان ہونے لگے تھے کہ وہاں
کھڑے گاؤں کے واحد مطب کے عیسائی جی بولے
تھے۔ ”کم از کم ٹھاکر باحویلی کسی کی اور فراد تو اس
موت پر یہاں مرنے والے کی بیوہ اور بچوں کی دلجوئی
کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ ارے! بے یارے لوگ ہیں
انہیں کس کی غریب ضرور سے مرنے کا کیا درد؟ بچو۔۔۔۔۔!
میر کرو۔ اللہ بھرتے کرے گا۔“

سردیوں میں اس کے کام کی ٹھنڈ ہمارے کھر کے
چولے پر بھی پڑتی تھی یعنی کھر میں بھوک بھی بھوک
مٹلائی تھی۔ یہاں بے پناہ ضروری ہے کہ کھر میں
میرے علاوہ ایک بھائی تو صیف بھی تھا۔ ہمیں جب
بھوک ستانی تو مجبوراً ہم بہن بھائی گاؤں کے ہندو
سکھ کھروں میں جا کر کھانے اور پیوے کی بھیک
مانگا کرتے تھے۔ کبھی کسی جگہ سے ایک آدھ پیوے اور
بچا کھیا کھاٹل جاتا تو کسی جگہ سے دھکے ملتے تھے۔
اُس گاؤں میں مسلمانوں کے چند ہی کھرانے
تھے اور چکی بات یہ ہے کہ سارے کے سارے
ہماری طرح کے بھکاری ہی تھے۔ ان میں سے زیادہ
زہ ہندو سکھوں کے ہاں عامی زلت والی نوکریاں کیا
کرتے تھے۔ خیر نصیب تھے یہ کہ ایک تو ہم پہلے ہی
انتہائی غربت کے نہایت تن حالات سے گزر رہے
تھے کہ اچانک میرا ایک ایک ہندو جاگیر دار پرکاش
سنہری حویلی کی چمٹ پر بھاری آغوش میل و مل فین

یہ کہانی مجھے جن چپکای سالہ بزرگ خاتون
شاہتہ بیگم نے سنائی ہے وہ شہید بہاری کے عالم
میں بستر سے لگی ہوئی تھیں۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے
فقاہت کی وجہ سے ان کی آواز خامد ہمیں اس
لئے میں نے اپنے کان ان کے لبوں کے بہت
قریب کر کے کہانی سنی اور گھسی ہے۔ قارئین کرامی
اس کہانی میں بیان کردہ مقامات اور کرداروں کے
نام سننے میں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف
کیجیے۔ شاہتہ بیگم نے اپنی کہانی کا آغاز کچھ یوں
کیا تھا۔

”میں موجودہ بھارت کے شہر امرتسر کے ایک
مضافاتی گاؤں بھوند میں ایک ایسے غریب خاندان
میں پیدا ہوئی جہاں کی معاشی حالت انتہائی پگھلتے ہوئے
تھی۔ میرا پ نور و نس آؤسے پر لیکوں کی ”بجین“
ستور اور منڈ شرویات کی ریڑھی لگا کر تھاقاؤں وہ
گرہیوں میں تو گزارہ لائق ضروری کر لیتا تھا لیکن

آج بھوک پیاس سے مجبور ہو کر سردی کے لیے نہ جاتا۔ دیکھو آج اس کے مرنے سے ہم سب بے آسرا اور میرے بیٹے پیتم ہو گئے ہیں۔

پڑوں کی ایک بوڑھی عورت نے کہا کہ یہ بے چاری بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔

”مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ یہ بے چارہ غریب اپنی دردناک موت مرا لیکن میرے نوکر مودے بھلے نے مجھے بتایا ہے کہ نور دانی کی اچھے سے مر ہے۔ اس نے جانا تو روک دیا تھا کہ وہ اتنا ہماری پچھا کیا کیا نہ اٹھائے لیکن وہ نہ مانا کہنے لگا کہ مجھے جلدی ہے میں نے مزدوری کے چپوں سے یومی بچوں کے لیے کمانے پکانے کا سامان لے کر جانا ہے۔ بہر حال اب ان باتوں کا کیا فائدہ کہ کیسے مرا کیوں مرا؟“ پھر کاش سندھ نے اپنی ہماری وار بار آب آواز میں کہا پھر اس نے اپنے منہ پر کلمہ کے ہاتھوں میں 100 روپے رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس رقم سے نور کی تدفین اور میت میں آنے والوں کی روٹی پانی کا انتظام کر دینا اور ہاں تو اسے اپنا تازہ میں میری موجودگی کا احساس دلانا ہے۔ مجھے آج ضروری کام کے سلسلہ میں لارہ ہو گئی ہاں گریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہے۔“ اس نے بڑے سفر و راجھا میں توصیف اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ بچہ.....! پریشان بالکل نہ ہونا میں دابھن آ کر تمہاری گز رہاں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ یہ میرا تم کو لوں سے وعدہ ہے۔

شام کے وقت ابا کو گاؤں کے مقامی قبرستان میں دفنایا گیا تھا۔

منشی پریم سنگھ نے بڑے اچھے طریقے سے میت میں آنے والوں کو کھانا کھلایا۔ چنی بات ہے کہ اس روز ہم نے زندگی میں پہلی بار اتنا چھا کھا پیٹ کمر کر کھایا تھا۔ ہم نے غیبی منہ بھر کے گوشت اور

زردے سے اپنے آپ کو یہ کیا اس دوران مکے اور پڑوں کے ہندو سنگھ ہمارے کھرتیزیت کے لیے آتے رہے۔ اور پھر پریم سنگھ نے روز تک ہماری خبر گیری کر رہا۔ اس نے جاتے وقت اماں کے ہاتھ پر رکاش سندھ کی جانب سے دیے گئے 100 روپے میں سے بقیہ 40 روپے رکھ دیے اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ کسی مسئلے کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے بلا جھگ جھگ چلی آ سکتی ہے۔

منشی پریم سنگھ کی جانب سے دیے گئے روپے چند دنوں میں ہی کافی طرح خرچ ہو گئے جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ گھر میں ایک بار پھر بھوک افلاس نے اپنا ڈھیر جمایا۔ اب ہمارے گھر میں نہ کڑی روٹی کی صورت میں پلاؤ تو رسم آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی پاس پڑوں سے ہم پر ترس کھا کر دال مہزی کا پیالہ دے رہا تھا۔

”ہائے.....! بھوک لگی ہے اماں.....! بھوک سے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ توصیف نے داو بلا شروع کر دیا تھا۔ اماں پریشان لگا ہوں سے ہونٹوں کی طرح ہمیں دیکھتے ہوئے خاموشی سے روئے جاری تھی۔ بلا جھجھور بھائی میں فوری طور پر میوؤں حکیم الدین کے پاس گئے۔ اسے اپنے خاندان کی بھوک افلاس کے بارے میں بتایا تو اس نے ہمیں اپنے تجربے میں اور گرد کے مسلمانوں کے گھروں سے آئے مختلف کھانوں کے پیالوں میں سے آبا ہوا ایک پیالہ اٹھا کر ہمیں دیا اور کہا۔ ”تم روزانہ آ جایا کرو اور کھانا لے جایا کرو۔“ ہم خوشی خوشی خیرات کا یہ کھانا کھلے آئے اور اس طرح اپنا پیٹ بھرا۔

شام کو میوؤں حاجی حکیم خصوصی طور پر اپنے بالوں اور داڑھی پر خضاب لگائے صاف سترے کپڑے پہن کر ہمارے گھر آیا۔ اس نے پہلے ہم

سب بچوں کو پیسے اور نیاں دیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اے کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”تم سب تک ویر در پھر اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرو گے؟ کسی ایسے شریف انسان سے نکاح کیوں نہیں کر لیتی جو نہ صرف تیرے بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھلائے اور تو سہاگن بھی بن جائے۔ دیکھ“ یہ وہی اس معاشرے میں کی حیثیت نہیں ہے۔“

”مخرم کر میں تیری بیٹی کی طرح ہوں تیری پہلے بھی اس کا ڈن اور شہر میں تین یوں یا موجود اور تو نے انہیں کس عذاب میں رکھا ہوا ہے سب جانتے ہیں۔“ اماں نے اسے لڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں نے تو تیرے فائدے کے لیے ایک مشورہ دیا تھا آگے تیری مرضی سے لیکن سوچ لے اگر تو مجھ سے نکاح کرنے تو انشاء اللہ تیرے بیٹے اور تو بھی بھوکے نہیں رہیں گے کیونکہ اللہ کے کرم سے میرے جگرے میں دیسی گھی کا تڑکا لگی دالوں چھوئے کر کوشت کی بوٹیوں سے بھرے پیالے آتے ہیں اور ساتھ ہی کچھ کے ساتھ میری رہائش بھی ہے۔“ اس کی ان باتوں کے جواب میں اماں نے اسے حق تعالیٰ کے بارے میں لگا دیا تھا۔

دوسرے دن جب ہمیں کسی نے پوچھا تھا کہ ہمیں گھر میں بھوک نے اپنا زیروہ ڈالا تو اس نے مجھے کہا کہ چل منشی پریم سنگھ کے پاس چلی میں چلے ہیں۔ ویسے بھی اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی پریشان ہو یا بھوک ستائے تو آ جانا۔

اماں اور میں جو پہلے پتھو تو اتفاق سے منشی پریم سنگھ نے ہی دروازہ کھولا۔ اس نے اماں اور مجھے دیکھا تو ہمیں اپنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا کر کہا کہ میں ابھی خاکہ پر رکاش سندھ کو بلا کر لاتا ہوں مجھ جیسا حکم کریں گے میں دیا ہی کروں گا کیونکہ میں تو خدا کا ملازم ہوں اور ان کے حکم کے

غیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی جھلا ہوا جوتا کر کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ اپنی رال چٹا ہوا اوٹ چانگ باٹھ کر کھانا کھانے میں لگا گیا۔ وہ پیتم کی طرح اپنی سیدھی کرکٹ کرتا نہ جانتے منہ میں کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ آ رہی تھی اور کچھ نہیں لیکن اس کا مطلب سمجھ آ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد منشی پریم سنگھ آ یا اس نے کہا کہ خاکہ صاحب اس وقت حوی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ ایسا کر کوئی الجھال دور پے مجھ سے لے لو اور پتا دھان پان کرو۔

”منشی صاحب یہ ہمارے مہمان ہیں ان کی کچھ سیدھا کرو۔“ منشی نے ناک میں ہولتے ہوئے چڑھوں کی طرح کہا۔

”توجہ کر اور کل یہاں سے۔“ منشی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”یہ کون ہے؟“ اماں نے منشی سے پوچھا۔

”یہ خاکہ صاحب نے اپنے گلے میں مندر کا گھنٹہ لٹھا ہوا ہے جو ہر وقت بجتا رہتا ہے۔ وہ کمرے سے چلا گیا تو منشی نے مزید بتایا۔

”درحقیقت یہ اس حویلی کا کھلو ہے یہ سب کو ہنساتا ہے۔“

”یہ کیا کہاں سے ہے؟“

اماں نے جب منشی سے سوال پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ وہ مسکراتا رہا۔ اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا تھا پھر اس نے ہمیں کہا کہ تم کل نہیں یہاں آنا میرا وعدہ ہے کہ میں خاکہ پر رکاش سندھ سے کہہ کر تمہاری مالی امداد کا بندوبست کروادوں گا۔

اکلی منشی اور خاکہ خود ہی ہمارے گھر آ گئے۔ خاکہ نے آتے ہی کہا۔ ”ہماری حویلی میں نور کی موت واقع ہوئی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ کرم

تمہیں ہے آسرا بھوکا پیاسا نہ چھوڑیں۔" اس نے
 اماں کو کہا۔ "تو اس سڑی بدبودار گھڑی کو چھوڑ کر
 میری حویلی میں آ جا۔ تجھے صرف رہائش دوں
 گا بلکہ ڈکری کی شکل میں تیرا مستقل روزگار بھی
 دوں گا۔" غما کر 50 روپے اماں کو دیئے۔ "شام
 کو نہادھو کر اچھے کپڑے پہن کر حویلی خالی ہاتھ آ
 جانا۔ وہاں بھگوان کا رہائش سب کچھ ہے۔"

..... کیا نام ہے تیرا؟“
 ”جی شائستہ!“ میں نے شرمناک کہا۔
 ”ارے شرمناکی کیوں ہے؟ زور سے بات کیا
 کر۔“ ہریم کمار نے اپنی منہ بول چوڑی دیکھتے ہوئے
 کہا۔ ”چھو کرے کو کس کے حوالے کریں؟“
 ”اسے فی الحال چھوڑو۔“

استے میں جلا مودا آیا اس نے وہی دیوانہ کا
ظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرا بھی ان سے تعارف
کر دیا کریں۔

”ہاں یہ مودا صاحب ہیں اس حوٹلی کے
چھوٹے ٹھاکر ہیں۔“ کاوش سند نے طنز یہ انداز
میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹے ٹھاکر صاحب“
آپ ایسا کریں کہ فوری طور پر باورچی خانے میں جا
کر ٹٹے کی پورییاں ڈھون میں ڈالیں اور بعد میں
گھوڑے پر کاشی ڈال کر تاجک تیار کریں۔ مجھے

ہم جب حویلی کے دروازے پر پہنچے تو تیشی نے ہمیں اپنے اس کمرے میں بڑی عزت سے بٹھایا جہاں ہم پہلے بھی آئے تھے۔ حویلی در بعد شاکر اندر کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو شرف لگ رہا تھا جبکہ دوسرا آدمی لمبے قد، بڑی بڑی مونچھوں والا اور چہرے ہی سے سخت اور بد معاش لگ رہا تھا۔ شاکر نے آتے ہی کہا۔

ایک لڑکھواں لڑکی موجود تھی۔
 ”یہ چھوٹی ٹھاکرانی سریش دیوی ہیں۔“ ٹھاکر
 نے بتایا۔
 اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی ناک پر دال رکھ لیا۔
 دوسرے کمرے میں ایک آدمی زعفران لپاچ عورت
 موجود تھی جس کی ٹانگیں ایک اپنی اسٹینڈ سے بندھی
 ہوئی تھیں، جس طرح آج کل گلوکار لگانے والا اسٹینڈ
 ہوتا ہے۔ اس کے قریب ٹھاکر کہیں لے کر گئے تو

انہوں نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: ”یہ شائستہ سیرتی خدمت کرے گی۔ اور لڑکی!.....! تو نے بڑی ٹھار کر ان کی روزانہ ٹائیکس دہائی ہیں اور ان کی خدمت کرتی ہے۔“ مودا جملہ ساتھ ساتھ تھا تو اس نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

”ٹھار کر ان کو یہاں پوچھتا کوئی نہیں ہے اور ان کی ٹائیکس چلے گی۔“

”تو چپ کر“ فخر کے اس کو دکھا گئے ہوئے کہا۔ ”نہ ہو یہاں سے“ اس سائین نے توہمیں بہت تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ لگتا ہے اس کا کوئی علاج کرنا پڑے گا۔“

اس حویلی میں بزمِ مکار کی پتیلیں سے بھی تعارف کروایا گیا۔ ان کی تعداد دودھن کے قریب تھی اور اس کے علاوہ دونوں بھائیوں کے ان کی مختلف بیویوں سے چھوٹے بڑے کافی تھے۔ وہ سب تک چڑھتے اور ان کو اپنے پیچھے ہونے کا غرور مٹاتے تھے۔ وہ اپنے نوکرؤں کو کبھی منہ نہ لگاتے تھے۔ حویلی کا کھلوڑا موزا جملہ تھا۔ حویلی کی عورتیں اور بچے اس کی اوٹ چانگہ حرتوں سے بہت محفوظ رہتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسی ایسی ہنسنے والی باتیں کرتا کہ چوبیس خدیجہ کی آنکھیں آ جانی تھیں۔ وہ بھی بندر بن کر راجس لپکھوڑا اور کبھی کھوڑا بن کر بچوں کو پیٹھ پر سوار کر دیتا۔ اس حویلی کے چھوٹے بڑے سارے زیادہ تنگ کر کے تو وہ جل بھن کر گندی گندلی کالیاں دیتا تھا۔

خیال تھا کہ اس حویلی میں سب باسیوں کا مزاج سخت اور سرد ہے۔
 ”بس ششی پرچم سنگھ اور بڑی ٹھاکرائن فورٹی خوش اخلاق ہیں لیکن امی، وہ مجھ سے سارا دن ٹانگیں اور دروہائی رکتی ہیں۔ وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ مجھے وہ سارا کام بھی نہیں کرنے دیتی۔ ان کے کام سے فارغ ہوئی ہوں تو چوٹی ٹھاکرائن مجھ سے اپنا کمرہ صاف کرواتی ہیں۔“
 ”بھئی؟ کیا کہیں؟ جب زہریلے گزرائی ہے تو سخت زہر دیتی ہے؟“
 ”پڑے گا۔“

تھا۔ خاکر صاحب نے بعد میں اسے قتل کر دیا تھا لیکن اس کے سطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمود رکھا گیا جو بعد میں سودا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس کے بارے میں شری یاد پورا م کہتے تھے کہ جب سے یہ چھلایا ہوا ہے اس دن سے ان کے دیرینہ مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اس پر شاید کسی سامنے یہ قید نہ کیا ہوا ہے اس لیے انہوں نے اس کی مسلمان مان کو قتل کر دیا لیکن اسے اپنا کام کا سمجھ کر زندہ رکھا۔ وہ دوسرے تھیں لیکن یہ بڑا ہو کر تمام حویلی کا کھلونہ بن گیا ہے۔ یہ بے چارہ نہ جانتا ہونے کی وجہ سے تو بڑے بھائی کا رتہ پا سا کردار نہی چھوٹے بچوں کی طرف سے اس کو چچا ہونے کا زلف حاصل ہو سکا لیکن یہ باتیں تم اس حویلی میں کسی کو نہ بتانا۔ اگر تم نے میری یہ بات ان کے سامنے کر دی تو تھا کر صاحب میری ہڈیاں توڑ دیں گے۔“

مودہ چھلا سارا دن حویلی کے اندر رہنے والے پاسیوں کا خوشی رشتہ دار ہونے کے باوجود اس کی چاکری کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ حویلی کے رہنے والے اس سے اتنا تذلیل والا کام بھی لیتے تھے کہ دیکھ کر میں بھی غم آنی تھی۔ ہیرم کداس سے اپنے اسٹبل میں بندے کھڑے توں کی لید اور فضلہ اٹھاوا کرتا تھا۔ ان کو بھولا کر لیا تھا۔

حویلی کا ماحول انتہائی بے باک، فحش قسم کا تھا۔ چھوٹی بڑی ٹھاکرائیاں اپنے دیوروں سے نہیں میں انتہائی مٹی اور مردانہ گالیوں سے بات کرتی تھیں۔ یہ بات بھی ہم نے دیکھی تھی کہ یہ لوگ آپس میں ایسی حرکات کرتے کہ انہیں شرم نہ آتی۔ بالخصوص مرلی پرکاش اپنی جوان سوتیلی ماں کے ساتھ اس طرح بات کرتا تھا جیسے وہ اس کا سوتیلایا نہیں کوئی عاشق ہو۔

حویلی کے تمام مرد ہر وقت شراب کے نشے میں

دھت رہتے تھے۔ ہیرم کداس مرلی پرکاش کی نظر سے حویلی میں کام کاج کرنے والی عورتوں کے چسوں کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ وہ بظاہر ہمیں تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن ان کی نگاہوں اور باتوں سے ہمیں ان کے اندر چھپے ہوئے بھروسے شیطان کی بوساٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شری پریم سنگھ جب بھی ہمارے کوارٹر میں آتا تو اس سے بے موقع اپنی سیدی فحش گفتگو کرتا تھا۔ ماں اسے ہوں ہاں کر کے ہر گھنٹے کے گوش کرتی تھی۔ یہ صورت حال ہمارے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔

میں اور ماں سارا دن حویلی کی پاکری کرتے تھے حالانکہ خاکر پرکاش سندر نے مجھے اپنی بڑی بیوی شاکرانی نورنی کی خدمت کے لیے رکھا تھا لیکن سرپرستہ وہی مجھ سے اپنا جنم دیوائی تھی۔ میں جب انہیں دہائی تو وہ بار بار مجھے کبھی کداس روز روز سے دبا کرتا تھا۔ میرے اندر نہیں ہے؟ ان سے فارغ ہوتی تو پھر حویلی کی کوئی نہ کوئی عورت مجھے بلارکھتی خدمت دیتی تھی۔ اگر وہ مرگ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شاکرانی نورنی کو نہ جانے کون کی ایسی بیماری تھی کہ اس کا علاج کوئی حکیم طبیب نہ کر پا رہا تھا۔ وہ ہیشکل چل پاتی تھی۔ اسے خاکر پرکاش سندر بھی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ وہ ہر کاش سندر کی عدم توجہ کے باعث بہت بے زار تھی۔ میں جب ان کی خدمت کرتی تو وہ مجھ سے خوش ہو جاتی تھی اور اکثر کہتی تھیں۔ ”تمہیں بھی موقع ملے تو فوراً یہاں سے بھاگ جانا۔“

میں ان سے پوچھتی۔ ”کیوں؟“ لیکن وہ اس کا جواب نہیں دیا کرتی تھیں۔

ایک دن میں نے ایک بڑی عجیب تبدیلی ماں محسوس کی جس سے مجھے تشویش ہوئی، وہ یہ تھی کہ ماں کا پیٹ معمول سے ہٹ کر پھول رہا تھا۔ اس کو

شاید تو صیغہ نے بھی محسوس کیا تھا۔ ماں سارا دن سبب ہاشانی اورنت سے میرے کھاتی رہتی تھی۔ وہ ہمیں بھی دیتی تھی۔ میں نے ایک بار اس سے تشویش بھرنے اعزاز میں پوچھا تو اس نے مجھے کہا کہ اسے پیٹ کے گولے کی بنیاد لائق ہو گئی ہے اور وہ جلد شری میں بڑے ہسپتال جا کر اسے دکھائے گی۔ اسے منگے فرٹ میو سے نہ چاہئے کون دیتا تھا؟

ایک دن مودہ چھلا ہمارے کوارٹر میں آیا۔ اس اتفاق سے میں اور تو صیغہ موجود تھے۔ ماں کوارٹر میں نہیں تھی۔ میں نے اسے ماں کا لایا ہوا سبب دیا تو اس نے مجھے واپس دے دیے ہوئے کہا کہ میں تم سے اب سبب نہیں لٹو گا۔

”لٹو کس بات کے؟“ میں نے پوچھا۔
”جیسے نے اپنے بچے والے مخصوص انداز میں کہا کہ تمہارا بھائی جو آئے والا ہے۔“
”یہ تو کیا کہو اس کر رہا ہے؟“ اس کی بات سے میرے تن بدن میں ایک گنگ تکی تھی۔ تو صیغہ نے بھی اسے غصے سے ڈانٹا تھا بلکہ اس کے جسم پر دو چار گنگے لگائے تھے مگر جلتا تیز بولنے لگا کہ میں تو تم سے لٹو گا۔ کداس کا تمہارا بھائی آئے والا ہے۔ یہ کہتا ہوا وہ جلا گیا۔

شام ہوئی اور ماں آئی تو میں نے جب ماں کے پیٹ کی جانب دیکھا تو واقعی اس کا پیٹ اس امر کی چٹکی کھار رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی گناہ چنپ رہا ہے۔ اب میرے سامنے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں کس طرح بحیثیت بیٹی ماں سے یہ بات پوچھوں کہ وہ کس سے اپنا نام کداس لگا رہا ہے؟ اور کیوں؟

دوسری جانب حویلی کے پاسیوں کے وہی طور پر جلتے تھے جیسا کہ اس کہانی کے شروع میں بیان کیا تھا کہ وہ لوگ مٹا فحاشی کی زندگی میں کم تھے۔

ایک دن میں نے بڑی شاکرانی کا بدن کوٹنے کے دوران انہیں کر لینے کی کوشش کی۔ ”آپ نے ایک دن مجھے کہا تھا کہ تمہارا بس چلے تو یہاں سے بھاگ جانا۔ آپ نے ایسا کیوں کہا تھا؟“
وہ غامض دیرک خاموش رہیں اور بھر بولیں۔ ”شاکرانی نے حویلی کو نہیں بلکہ ایسا جنگل سے جہاں انسان نہیں جھانکتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کی بیوی نہیں نہیں۔ یہاں کچھ۔۔۔۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے کس کس گھبراہٹ میں نے اور حوا راجل میل کیا۔ ”یہاں رشتے صرف نام کے ہیں۔ چل جا مجھے آرام کرنا ہے۔“ وہ دوسری تھیں لیکن مجھے ان کی اس بات پر اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں تو حویلی کے مردوں نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا اور دوسری جانب ماں نے بھی اس کی کوئی شکایت نہ کی تھی۔ ہاں یہ ضرور سے مرد بڑی عجیب نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ہم لکھتے تھے کہ یہاں کی عادت ہے۔

ایک دن ایسا بھی آیا جب ماں کا پیٹ مکمل طور پر پھول کر داس نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے اور تو صیغہ کو ہر طرف سے طے مل رہے تھے کہ تمہارا بھائی آنے والا ہے۔ حویلی کے تینوں کے طے سن کر حوا ہالے کان کھٹکے تھے۔ بلا خرک ایک جب مجھ سے نہیں رہا گیا تو میں نے ماں کو بھجوز کر کہا کہ بتاؤ۔ یہ کیا ہے تم نے کیوں کیا؟ کون نہیں ایسا کہہ کر بھجوز کر رہا ہے؟

ماں نے اپنی نگاہیں نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ”شاکرانی نہیں ہیں یہ بات کل صبح بتاؤں گی کہ میں نے کس بھجوری کے تحت اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے۔ بیٹی۔۔۔۔۔۔ میں تیری تو صیغہ اور اپنی ضمیر کی مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا اور ہاں جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”پر کیوں؟ ہمیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ یہاں

ہمیں من چاہا کمال رہا ہے نہ کونسا کھاکر صاحب
نے چھت دی ہوئی ہے۔ دیکھا جائے تو ہم جس
جھوپڑی میں رہتے تھے وہاں کے رہنے والے
ہمارے بڑی بد حال زندگی گزار رہے ہیں۔
ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا..... وہ لوگ
بے شک ہم سے برا کھاتے پیتے ہیں اور ہم سے کتر
ہیں لیکن انہوں نے میری طرح اپنی مجبوریوں کا سودا
نہیں کیا ہے۔ شائستہ تم جب بڑی ہوئی تو ہمیں
معلوم ہوگا کہ انسان بے کسی کے عالم میں اپنی
مجبوریوں کیسے پہچانتا ہے؟“

”خدا کے لیے ماں..... مجھے بتا تو نہ کسی کے
آگے اپنی مجبوریوں کا سودا کیا ہے؟ کون ہے اس کا
خریدار؟“ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔
”مج بتاؤں گی تو بھی سوجا اور مجھے بھی نیند آ
رہی ہے۔“

میں نے ہنست پر ہنست پڑے پڑے ماں کی جانب
دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مسلسل
چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ گھٹا گھٹا کئی گہری سوچ
اسے سوئے نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کس پہر
میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میں گہری نیند میں تھی کہ کک کر کے کوٹری کا
دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور پھر اسی لمبی
ٹانگے کے چلنے کی آواز میرے کانوں سے گئی۔
پہلے تو میں گہری نیند میں تھی کہ میرے خواب کا
حصہ ہے تو صبح میں گہری نیند اور تھا وہ بھی اٹھ
گیا۔ اس نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں چلائے
ہوئے کہا کہ اراں میں ٹانگے والے کے ساتھ گئی
ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ میں نے اور تو صیف نے
فوراً حویلی کے باہر آکر کھلے میں دیکھا لیکن وہاں
تاکہ نہ قابل تہاتے کے بھینوں کے نشان گلی کی پی
نمایاں تھیں۔ تو صیف..... ماں.....! چلتا ہوا

دور تک گیا لیکن مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اتنی جلدی
میں ماں پوچھیں کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی
ہی؟ یہ سوال میں اور تو صیف تھرا گئی کے عالم میں
ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ میں خائفہ سوئے
بھلے کے پاس گئی، اس میں نے چنگا کہ ماں نہ جانے
کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی ہے۔

موڈے نے اپنے بھلے پن میں کہا۔ ”روتی
گھبراتی کیوں ہو؟ لگتا ہے وہ تیرا بھائی لینے گئی
ہے۔“

میں اس وقت طوری پراسی پریشان تھی کہ میں
نے غصے میں اس کو پاؤں کے منہ پر زور دیا پھر رسید
کر دیا۔ تو صیف نے بھی بھلے کے یہ الفاظ سن لیے
تھے۔ اس نے بھی دو چار زوردار کتے لائیں اس ہے
چارے کی کمر پر دے مارے لیکن وہ بالکل پاگلوں کی
طرح تالی بجا کر رہنے لگا۔

”شائستہ آئی تو میں تجھ سے سنائی کھاؤں گا۔“
میں نے فیصلہ کیا کہ میں بڑی خاکی لائی لونی کو
جا کر بتائی ہوں کہ ماں کسی کے ساتھ چلی گئی ہے لیکن
تو صیف نے مجھے کہا کہ بڑے بڑے ٹھاکر کو جا کر یہ بات
بتاتے ہیں وہ ہماری مدد کریں گے۔ میں نے اور
تو صیف نے حویلی کا بند بڑا داخل دو دروازہ زور زور
سے بجانا شروع کر دیا۔ صبح کا وقت تھا۔ حویلی
کے تمام مکین بیٹیا گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ گذشتہ رات حویلی میں چھوٹی خاکی لائی مریش
دبوی کے بیچ کی سالگرہ منائی گئی تھی۔ یہ تقریب
رات دیر تک چلی اس لیے حویلی کے مکین رات
درے سوئے تھے۔ باہر بارش دو دروازہ کھٹکھٹانے
باوجود حویلی کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ میرے اور
تو صیف کے ہاتھ اس موڈے دروازے کو کھٹکا کھٹکا
کے کھٹکے کھٹکے تھے۔ مودہ بھلا پچھڑ گیا۔ اس نے ہم
دونوں کو کہا کہ یہ دروازہ ایسے نہیں کھٹکے گا۔ میں حویلی

کے اندر سوئے ہوئے مردوں کو اپنے طریقے سے
اٹھاتا ہوں۔ اس نے آؤڑ بکھانا تو حویلی کے باہر
پڑے اینٹوں کے پانچ پانچ ٹکڑے اٹھائے اور زور
زور سے اس دروازے پر مارنا شروع کر دیے۔ میں
نے اسے منع بھی کیا تھا کہ اچانک ڈرڑ ڈرڑ کی
خونفک آوازوں سے حویلی کے دروازے کھٹے۔
حویلی کے اندر سے ہر کمار پر کاش سندھو مری سخت
غصے میں نکلے۔ ٹھاکر پر کاش سندھو نے چلا کر کہا۔
”کس نے حویلی کے دروازے پر یوں پاگلوں

کی طرح اینٹیں چھینکی ہیں؟“

تو صیف نے روتے ہوئے کہا کہ کئی وہ ہماری
اماں نہ جانے کہاں چلی گئی ہے؟
”پہلے یہ بتا کہ تم میں سے کس نے اینٹیں حویلی
کے دروازے پر ماری ہیں؟“

”میں نے ماری نہیں بھائی جان.....“ بھلے نے
ٹانک کے ذریعے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
”تم نے ماری کی؟“ پر کاش سندھو اور ہر کمار
نے اس کے منہ پر زور دیا پھر رسید کر دیے۔ بھلے
کے منہ سے خون نکلنے لگا لیکن اس نے اس حالت
میں بھی کہا کہ ٹھاکر صاحب تو صیف اور شائستہ کی
ماں نہ جانے کس تانگے والے کے ساتھ چلی گئی
ہے۔ ان کی مدد کریں۔

”بھینے..... میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ آ
جائے گی اس نے جانا کہاں ہے؟ اصرہ رہی ہوگی۔
زادہ سے زیادہ ہسپتال میں ہوگی..... کس بخت نے اتنی
بہت شراب کا سارا نشہ خراب کر دیا۔ میں تو بڑے
مزے سے گہری نیند سو رہا تھا۔“ مرلی نے شربانی
انداز میں گلی لیتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر کو نے حویلی کے دروازے پھر سے بند
کر دیے وہاں سے مایوس ہوئی تو میں نے تو صیف
کو کہا کہ ماں کو ہم اپنے طور پر تلاش کرتے ہیں۔

مودا خود بخود ہمارے پیچھے حویلی سے باہر نکل کر
کھیتوں اور ارد گرد گھوم پھر گراں کو ڈھونڈنے میں
ہماری مدد کرنے لگا۔ کھلے کے چند مدمچی ہمارے
ساتھ ہو لیے۔ دن گیارہ بجے تک ماں کا کچھ پتہ نہ
چلا تو ہمیں پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی۔ وہاں
موجود کھلے والوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ تہذاری
ماں کو ڈھونڈنے میں حویلی کے ٹھاکر کچھ کر سکتے ہیں
لیکن یہ بہت کون کرے کہ ان سے رقم ٹھاکر
سے یہ بات کرے؟ ہم دونوں بہن بھائی بہت
زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ اماں کو ہر صورت میں
ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ ٹھاکروں کے پاس جانے کے سوا
اب کوئی چارہ نہ تھا۔ کھلے کے ایک پوڑے سے ہندو
نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ حویلی چلا ہوں۔ وہ
ہندو ہم دونوں کو اپنے ساتھ حویلی میں ٹھاکروں
کے پاس لے آیا۔

ہر کمار اور مرلی ابھی تک نشہ میں دھت سو
رہے تھے جبکہ پر کاش سندھو چکا تھا لیکن وہ ہماری
پریشانی سے قطع نظر ایک صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا
تھا۔ ہندو جب ہمیں ٹھاکر پر کاش سندھو کے پاس
لے کر گیا تو اس نے غصہ نہ ہوئے کہ تم میری
نظروں سے دُخ ہو جاؤ..... میں تمہاری کوئی مدد نہیں
کر سکتا۔

اس ہندو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”جناب یہ آپ
کے خدمت گار ہیں جی۔ دونوں بچے اپنی ماں کی وجہ
سے پریشان ہیں۔ آپ سے جتنی ہے کہ بھوکھان کے
واسطے ان کی کچھ مدد کریں۔“
ٹھاکر رگوشت سے اخبار کو پھینٹے ہوئے صوفے
سے اٹھا اور اس نے کہا۔ ”الو تو آیا کہ تمہارے
دارامرت بچن کو میرا پیغام دے کہ میں نے اسے
بلایا ہے۔“ تو صیف اور لالہ اس کے پاس پہنچے تو
امرت بچن تھانے دارمجت سے حویلی میں ٹھاکر

پر کاش سندر کے رو برد چش ہو گیا۔ اس کے ساتھ چند پولیس اہلکار بھی تھے۔ پر کاش سندر نے اسے ماں کی گھنڈی کے بارے میں بتایا تو قاتلے دار نے اسے کہا کہ جیسا صلہ آپ اس عورت کا پتا رہے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ عورت حمل سے کی وہ لازماً عمل زنجی کے لیے کسی ہسپتال یا دوائی کے پاس گئی ہوگی۔

”وہ تو مجھے بتا رہے ہیں کہ وہ حاملہ تھی لیکن میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے کہ تو اسے تلاش کر۔“
”اچھا خاکر صاحب.....“ قاتلے دار امرت بچن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

دو دھپ بارہ بجے تک دروازے کے قتلوان چوہدریوں ٹھاکر کو بے خبر دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں اس کم شدہ عورت کو تلاش کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ زنگی سے متعلق ہسپتالوں دانیوں کے ٹھکانوں کو کھنگالنا لیکن اماں کا کہیں سراخ نہیں مل سکا تھا۔ بالا خرہ دو بجے قاتلے دار نے جوئی میں آکر یہ دانا کہ خبر سنا لی کہ کوئٹہ گاؤں سے سیل دور سوئٹر گاؤں میں ایک عورت کی لاش ملی ہے جبکہ اس کے قریب ایک تو زائیدہ بیٹیم ہے ہوئی کے عالم میں ملا ہے۔ خاکر پر کاش سندر ہیرم کماڑ میں تو صیف اور مودا صاحب اس گاؤں میں پہنچے تو وہاں ایک جگہ کھیتوں میں اماں کی لاش پڑی ہوئی تھی اور ایک زندہ تو زائیدہ بچے کو ایک دیہان نے اپنی گود میں اٹھایا ہو تھا۔ میں اور تو صیف ماں سے لپٹ کر رونے لگے۔

”ہائے..... بے چاری حرام کا بچہ جن کر مر گئی.....“ وہاں کھڑے ایک دیہان نے ہمدردی کے انداز میں دل جلا جملہ کہا۔ اس علاقہ کا قاتلے دار پولیس اہلکار اور مقامی کاہنوں کا ہجوم لاش اور بچے کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان کی طرح طرح

کی باتیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ قاتلے دار نے مقامی دیہانوں سے پوچھا کہ یہ عورت کیسے یہاں پہنچی؟ انہوں نے بتایا کہ نہ جانے یہ کہاں سے آئی ہے کیونکہ یہاں صرف یہ مردہ عورت اور بچہ ملا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ بچوں کا یہاں سے زور ہوا تو انہوں نے اس عورت کو تڑپے دیکھا تھا۔ اس وقت اس میں جانی تھی۔

ٹھاکر ہیرم کمار نے قاتلے دار سے کہا۔ ”اگر اس حرام زادی نے حرام کا بچہ پینا تھا تو اتنی دور کیوں آئی؟“

”ہاں یہ بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ سوئٹر قاتلے کے قاتلے دار نے کہا اور وہاں کھڑی ایک بوڑھی دیہان سے پوچھا۔ ”کیا اس گاؤں میں کوئی دانی وغیرہ ہے کہیں؟“

”ہاں جو نام کی ایک اماں دانی موجود ہے جو کہ زانی“ فاحش عورتوں کے بچے چیکے سے پیدا کرواتی ہے۔“

قاتلے دار نے فوری طور پر اپنے دو پولیس اہلکار بھیج کر دانی کو بلوایا۔

نچو دانی محل و صورت سے ہی حرافہ اور بد قماش لگ رہی تھی۔ قاتلے دار نے اس سے سخت لہجہ میں ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ عورت جو تیرے سامنے پڑی ہوئی ہے تو اسے جاتی ہے؟“ جو خاموش کبھی ہوئی کھڑی رہی تب قاتلے دار نے اسے دھمکی دی اور کہا کہ میں تیری کمال قاتلے میں کھنڈاؤں گا تو تیرے فرشتے بھی بولیں گے پھر قاتلے دار نے بڑی دہجے سے اس کی پٹیا پکڑ کر اسے جھنجھڑا۔

”اے..... اپنے ہاتھوں میں قانون کو نہ لے.....“ وہاں کھڑے ہیرم کمار نے قاتلے دار کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

قاتلے دار نے بڑے پر جلال انداز میں چلائے ہوئے کہا کہ سردار جی میں کسی قانون کو ہاتھ میں نہیں لے رہا ہوں میں دراصل اس کی قانونی مدد کر رہا ہوں۔

”کیسی مدد؟“ خاکر پر کاش سندر نے اس سے پوچھا۔

”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس نچو دانی نے ہی اس عورت کی زنگی میں مدد کی ہوگی۔“
نچو دانی تک خاموش رہت ہی کھڑی تھی اس کے ہونٹ خوف سے پکپکا رہے تھے۔

”چلو لو..... اس مردہ عورت اور بچے کو قاتلے لے کر چلو.....“ قاتلے دار نے اپنے اہلکاروں کو کہا۔

اماں کی لاش کو بڑے ذلت بھرے انداز میں ایک جھڑ پر بے پروا کیا جبکہ بچہ کو صیری گود میں دے دیا گیا۔ نچو جو کبھی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی اسے قاتلے دار نے بوی کرخت آواز میں ٹھکرا۔

”تو بھی میرے ساتھ قاتلے وہاں میں تیری ہڈیاں تو فنا ہو چکیں۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ تیرا لہجہ اس عورت کی ناجائز زنگی میں ضرور ہے۔“

”ارے..... کیوں اپنی ہڈیاں قاتلے میں گھولنے کی کیا بچ ہے قاتلے دار صاحب کو کہیں بتا دے؟“ مجمع میں سے ایک بڑھا بولا۔

نچو فوراً قاتلے دار کے پاؤں میں گر کر بولی۔
”نندا کے واسطے مجھے قاتلے نے لے کر جاؤں گا میں آپ کو سب بچ جاتی ہوں۔“

”جلدی کب کیا کہنا جاتی ہے؟ ان سب لوگوں کے سامنے بتا کر یہ بھی نہیں۔“
نچو نے وہاں کھڑے کھڑے کہا شروع کیا۔ ”اس عورت نے اپنا نام کھانا بتلایا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کسی کا ختم اپنے شکم میں اٹھائے

پھر رہی ہوں اور میں نے اسے ضائع کرانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن یہ ضائع نہ ہو سکا لہذا میں مجھے لوٹوں کالا لہجہ دے کر کہا تھا کہ میں اس ناجائز بچے کی زنگی میں مدد کروں۔ یہ آج صبح میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اس کے دینے کے بعد 200 روپے کی بھاری رقم لے کر اسے لکی دوائیاں دیں۔ میں سوچے جو کہ زنگی کے عمل کو آسان بناتی ہیں لیکن انہوں نے وہ دوائیاں اسے نقصان نہ کریں۔ ان دوائیوں کا زہر اس کے پیٹ میں پھیل گیا تھا اور میں اسے بچا نہ سکی۔“

”قاتلے دار صاحب، نچو دانی نے جھپٹے ماہی حرام کو جھٹنے والی ایک فاحش عورت کو بار دیا تھا۔ مجمع میں سے نہ جانے کہاں سے آواز آئی تھی۔

”کیسی بیان اگر میں نے قاتلے میں جا کر اس سے لیا ہوتا تو تم کہتے کہ میں نے اس سے زہر دیا بیان لیا ہے۔“

سوئٹر قاتلے تک اماں کی لاش کو بڑے پر لے جایا گیا۔ دونوں ٹھاکر مجھے بچے سمیت وہاں سے لے گئے۔ پہلے تو حلقہ قاتلے دار نے جو کبھی کھنڈی کی لیکن بعد میں خاکر پر کاش سندر نے قاتلے دار کی مٹھی گرم کرتے ہوئے کہا کہ اس کیس کو کہیں ختم کر دے لہذا کیس واپس دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ نچو کی جان بھی بچ گئی۔

مجھے ماں پر شہید ہوا اور ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ اسے مردار جانوری طرح جھڑ پڑی پر گاؤں کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ تو صیف مسلسل سستہ کے عالم میں ماں کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اسے رلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا سستہ نہیں ٹوٹا۔ میں اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتی کہ ماں مر گئی ہے لیکن مودا جھلا میری بات یہ کہہ کر کھٹ دیتا تھا کہ آج تو تمہاری خوشی کا دن ہے تمہارا بھائی کا کا آ رہا ہے۔

اس کی بات سے وہاں کھڑے قماش بین دیکھنا ہمارا
مناق اڑانے لگتے تھے۔ ماں کے جنازے میں کسی
گاؤں والے نے شرکت نہیں کی۔ اسے کھڑا کھود کر
جانوروں کی طرح دبا دیا گیا۔

شام ہوئی تو خاکرا پرکاش بنیرم کنار نے ہم
دوئوں بہن بھائی کو اپنی حویلی کے کیٹ پر روکے
ہوئے کہا۔ ”خاکرا کی سریشہ دیوی اور دیگر
خاکرائیاں ہمیں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ تم
دوئوں ایک بدقش ماں کی اولاد ہو لہذا ہم دوئوں
حویلی کے اندر قدم نہیں رکھ سکتے۔“

پرکاش سندھ نے حویلی کا دروازہ ہمارے لیے
بند کر دیا تھا۔ میں اور تو صیف شہت میں سے روئے
لگے۔ یہ میں سننا کہ وہ جرم کی سزا مل رہی تھی؟
اماں نے نہ جانے کس خاتم کا گناہ کیا تھا۔ ہمیں پال
کر اسے ختم دیا تھا؟ اور سزا میں مل رہی تھی۔

مودا جھلا ہم دوئوں بہن بھائی کو اپنی کوکھری نما
رہائش میں لے گیا۔ وہاں اس نے ہمیں اپنی کوکھری
کے کچھ چھوڑے ہیں جگہ دے دی تھی کیونکہ ہمیں ہماری
کوکھری سے بھی بے دخل کر کے وہاں پتلا ڈال دیا
گیا تھا۔ یہ مودے کا ہم پر پہلا احسان تھا کہ اس نے
ہماری رہائش کا عارضی بندوبست کر دیا تھا۔ وہ باگل

بنے والے انداز میں اسے طوطے پر ہماری خدمت بھی
کرنے لگا تھا۔ وہ اکثر ہم بہن بھائی کے لیے طرح
طرح کی کھانے پینے کی چیزیں لے آتا تھا اور رات
در یک ہمارے کوارٹر میں بیچا دیوانگی میں ایسا انا
سیدھا بولتا تھا کہ اس کی دس باتوں میں سے ایک
بات بھائی کی تھی۔

اور محلے کے لوگ ہم دوئوں بہن بھائی کو کوکھری
کے پاس دیکھتے تو ہم پر آوازے کستے بلکہ کچھ عورتیں
مجھے کنواری ماں کہتی تھیں کیونکہ میری ماں کا وہ بچہ
میری گود میں ہوتا تھا۔ میں لوگوں کے لیے ایک

تماشہ بنی گئی تھی۔

ایک دن بعد وہ بچہ انتہائی بیمار ہو گیا تھا۔ وہ
روئے جا رہا تھا۔ بچی بات سے وہ مجھ سے سبھل نہیں
رہا تھا۔ مودا اپنی کوکھری سے چائے کی پتی لہال کر
لے آیا تھا۔ اس سے بھی اسے کوئی آرام نہیں آیا
تھا۔

رات تو میں نے بڑی مشکل سے گزار دی جب
صبح ہوئی تو میں نے گلے سے گزرتے لوگوں کی منتیں
کرنا شروع کر دیں کہ مٹا رہا ہے۔ خدا کے لیے
میری مدد کرو لیکن نہ جانے کیوں ان کے دل پتھر
ہو گئے ہیں یا پھر وہ خاکروں سے ڈر رہے تھے؟

انہوں نے میری بات پر کان نہیں دھرے۔ وہ بھرپور
اتفاق سے محلے کا ہندو بڑا جھاجھا لڑا میرے پاس
آیا۔ اسے میں نے اپنا کمر اور درو کرنا اور اس کے
آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کیں کہ خدا مراد میرا یہ بیٹا کم
طرح بڑی خاکرائی صلیب کو پھانسی دے کہ میں نے تمہاری

دل و جان سے خدمت کی ہے میں بہت پریشان
ہوں میری گناہ گار ماں کا گناہ (بچی) مجھ سے اب
نہیں نہیں ہا۔ میری مدد کرو۔ خوش قسمتی سے جو اب
لحل نے اپنی بیوی کے ذریعہ میرا بیٹا ہم خاکرائی
تک پہنچایا تھا۔

شام کے وقت لوری خاکرائی حویلی کے دو
نوجوان بچوں کے ہمارے چلتی ہوئی میرے پاس
آئیں۔ انہوں نے جب ہم دوئوں سے ملے تو ہمیں
بجائیں اس کی حالت دیکھی تو بہت پریشان ہو گئیں۔
”مجھے تو بتلایا گیا تھا کہ تم دوئوں اپنی خالہ کے
پاس چکی گاؤں چلے گئے ہو کیا ہمارا ہے؟“

”بڑی خاکرائی صلیب ہمیں خاکرا پرکاش سندھ
نے کہا تھا کہ آپ نے اور سریشہ دیوی نے حویلی میں
ہمارا داخلہ بند کر دیا ہے۔“
”یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں تو خود لاچار ہو کر

حویلی کے پچھواڑے میں پڑی ہوں۔ حویلی کے
ٹھاکروں نے مجھے بوزھال لاچار نکال دیا مجھ ایک
طرف مرنے کے لیے پھینک دیا ہے۔ شاکستہ تم
میرے ساتھ حویلی چلو اور اپنے کوارٹر میں رہو۔ آج
آئے دو پرکاش سندھ کو میں ان سے نمٹوں گی۔ ماں
کے گناہ میں ان بچوں کا کیا قصور ہے؟ چلو شاکستہ تم
میرے ساتھ آؤ۔“

اپنی خاکرائی مجھ سے یہ باتیں کر رہی تھیں
بلکہ پیچھے چھوٹی خاکرائی سریشہ دیوی مجھے میں کتنی
چلائی ہوئی آگئی۔ ”یہ ناک“ کندے لوگ اور
خاص طور پر یہ ناجائز بچہ کی قیمت پر حویلی میں
نہیں آگئے۔“

مودا جھلا پیچھے سے چلایا۔ ”بیگم صلیب یہ ناجائز
بچہ حویلی کے اندر ہی کسی کا گناہ معلوم ہوتا ہے۔“
”کیا اس بچہ کو... دوئوں کی تیرے منہ پر الے
ہاتھ کاچھڑھ...“ سریشہ دیوی نے اسے ڈانٹتے ہوئے
کہا۔

اب دوئوں خاکرائیوں میں بحث شروع ہو گئی
تھی۔ بڑی خاکرائی کتنی بھی کر شاکستہ حویلی کے اندر
میلے کی طرح آ کر کام کرے گی جبکہ سریشہ دیوی بغداد
تھی کہ میں اس کی قیمت پر بھی ان کے ناپاک قدم اندر
نہ آئے میں نہ کی۔ میں نے سریشہ دیوی کے آگے
ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ ہمارا اس معاملہ میں کیا
دوش ہے؟

”تو کیوں بند کر...“ وہ مجھے مارنے کے لیے
دوڑی تو بڑی خاکرائی نے آگے بڑھ کر اسے روک
دیا۔ اس جھگڑے کے دوران خاکرا پرکاش اور ہمیرم
کمار دی باہر آ گئے۔

پرکاش کو دیکھتے ہی بڑی خاکرائی نے ان پر
چلائے ہوئے کہا۔ ”تم نے ان بچوں کو حویلی سے
دور رکھنے کے لیے سریشہ دیوی کے ہاتھ میرا نام

کیوں لیا؟“

”میں نے تمہارا نام مطلق لیا تھا۔ ویسے مجھے
سریشہ دیوی اور ہمیرم کنار نے شاکستہ اور تو صیف کو
حویلی کے اندر قدم رکھنے سے روکا تھا۔ اگر یہ دوئوں
اپنے ناجائز بھائی کے ساتھ اس حویلی کے اندر قدم
رکھتے تو نہ جانے کس کس کی بدنامی ہوئی اور لوگ
بلاوجہ باتیں مانتے۔“ پرکاش سندھ نے اپنی چھوٹی
بھتیجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یاد رکھو یہ حویلی تمہاری نہیں بلکہ میرے باپ
کی طرف سے مجھ میں ہی ہوئی ہے۔ میں جہاں تو
تمہیں دیکھ دے گا اس حویلی سے نکلا سکتی ہوں۔“
”تو مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔“ پرکاش نے
کہا۔

”میں تجھے خردار کر رہی ہوں کہ یہاں دھٹی
نہیں انسان بن کر وہ اور انسانوں کی قدر کرنا سیکھ۔“
بڑی خاکرائی نے اسے معذرتے ہوئے کہا۔

سریشہ دیوی بھر آگئی۔ اس نے خاکرا پرکاش
سندھ سے کہا کہ تمہیں طلاق دوا یا اس بڑی خاکرائی کو
فارغ کر دو۔ دوئوں خاکرائیاں آپس میں لڑنے لگی
تھیں۔

خاکرا پرکاش سندھ اپنی جوان اور بڑی بیویوں
کے درمیان چکی کے پاٹ کی طرح پس رہا تھا۔
اچانک سریشہ دیوی چلائی۔

”دور کس گندری کے کونڑے کو...“ اس نے
میری گود سے بچہ چھین کر زمین پر پھینکے کی کوشش کی
لیکن میں نے اس بچے کو بڑی مضبوطی سے اپنے سینے
سے لگایا ہوا تھا۔ نورنی خاکرائی نے ان سب کو
سمجھانے کی کوشش کی کہ اماں کی جانب سے کیے گئے
گناہ میں تو صیف اور شاکستہ کا کیا دوش ہے؟ آخر
بڑی مشکل سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس ناجائز بچے کو حویلی
میں نہیں رکھا جائے گا۔

”کیوں؟“ میں نے چوٹی ٹھاکرائی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”کنڈو کنڈی کے ڈھیر میں پھنکا جاتا ہے گھر میں جاکر نہیں رکھا جاتا۔ اس کنڈی سے بڑھیدا ہوگی۔“

ابھی وہ یہ بات کر رہی تھی کہ گاؤں کے مندر کا ایک پنڈت جس کے گھنے سر پر چھوٹی سی انگلی برابر چٹا لک رہی تھی وہ حویلی کے دالان میں آیا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ ٹھاکر پرکاش مندر نے مجھے کہا کہ شائستہ اس بچے کو پنڈت کے حوالے کر دے۔

”کیوں؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔
”ٹھاکر نے شے سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم تدفون بہن بھائی اس صورت میں حویلی کے اندر آسکتے ہو جب یہ بچہ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ چل دے اسے پنڈت کے ہاتھ میں۔“
دوری ٹھاکرائی نے بھی مجھے ایسا کرنے کے لیے کہا تو چار میں نے بچہ کو پنڈت کی طرف بڑھایا۔

پنڈت نے بچہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے چومتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ ناچانچہ گاؤں کے مندر کی صفائی کرتی اور خدمت کر کے اپنی ماں کے پاس واپس آئے گا۔“ وہ یہ کہہ کر بچہ اٹھا لے کر حویلی سے نکل گیا۔

وہ بچہ چاہے ناچانچہ تھا لیکن قاتل میری ماں کا۔ مجھے اس کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ سارے لوگ وہاں کھڑے تھے۔

دوری دایو نے مجھے کہا۔ ”شائستہ تو پہلی طرح حویلی میں آکر میری خدمت کیا کرے۔“
توصیف کے بارے میں میرے کمار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مودے جھلے کے ساتھ ان کے اطمینان کے

جانوروں کی خدمت کرے گا۔ میں حویلی میں پہلی طرح بڑی ٹھاکرائی کی خدمت کرنے لگی تھی۔
میں نے بڑی ٹھاکرائی کا شکر یہ ادا کیا کہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائی پر ترس کھار نہیں دوبارہ حویلی میں بلایا تھا۔

حویلی کے باقی لوگ ہم سے زیادہ باہم نہیں کرتے تھے ایک دن بڑی ٹھاکرائی نے مجھے کہا تھا۔ ”اس حویلی کے تقریباً تمام مردوزن شرابی اور عیاش ہیں۔ لوگ شراب شام کے سیانہ میں پیئے بھی موش تلے تو یہاں سے بھاگ جاتا۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی تیری ہی عزت یہاں پالنا نہ ہو جائے۔“

کافی دن گزر گئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی میں ٹھکراؤ اور بھرتی آگئی ہے۔ توصیف حرم کمار کے اطمینان میں سارا دن کام کرتا۔ وہ رات کو کھٹک بار کرسو جاتا تھا۔ اس سے میری کوئی خاص بات نہیں ہو پاتی تھی۔ اور حویلی کے اندر کسی باہر کے فرد کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ایک دو بھلے دار یا ان کے برائے جانے بچانے والے آتے تھے یا حویلی والے سودا جھلا کوٹھل میلہ اور مذاق وغیرہ کے لیے بھی بھی بلاتے تھے۔ حویلی کے کینکین بچے بوڑھے اسے سنتے سنتے انداز سے گھٹکرتے تو وہ جمل کر انہیں گالیاں دیا کرتا تھا جس کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا توصیف کی شخصیت اور اس کے رہن بہن کے طور طریقے میں ہندوئہ انداز بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ماتھے پر بھنگ لگا کر ”السلام علیکم“ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر ”سنتے پرنام کیتے لگا تھا۔ میں نے جب اس کے یہ ہندو طور طریقے دیکھے تو اسے نوکا۔
”یہ تو کیا کرنے لگا ہے؟ یاد رکھو ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں کبھی بھارنماز پڑھتی تھی اور قرآن شریف بھی پڑھ لیتی تھی لیکن وہ تو اسلام سے بالکل ہی پھگڑا تھا۔ ایک دن مودے جھلے نے مجھے گھوڑی میں آکر بتایا کہ میرے کمار تو صیف کو روزانہ اس مندر میں لے کر جاتا ہے جہاں تیری ماں کا جنا ہوا ہے۔ یہاں سے وہاں کا پنڈت اسے ہندو مذہب کی جانب راغب کر رہا ہے۔ یہ میرے لیے ایک نئی پریشانی تھی۔ مودے کی بات سچ تھی۔ اس ہندو پنڈت نے نہ جانے توصیف کو کیا پتی پڑھائی کہ وہ اسلام سے بالکل ہی بے بہرہ ہو گیا تھا اور ہندوئہ مذہب کو اپنا جا رہا تھا۔ میں نے توصیف کو اپنے آباؤ اجداد کا دین بدلنے سے روکا تھا لیکن وہ نہ مانا۔

میں مکمل ہندوئہ ماحول میں رہ رہی تھی۔ اب میرا آخری مسلمان سہارا بھائی کی ہندو بہن چکا تھا۔ میں نے بھائی سے ناراض ہو کر اپنی کنیا لگ کر لی تھی۔ مجھے اس سے نفرت اور خوف محسوس ہونے لگا۔ توصیف اب سارا دن مندر میں رہتا تھا۔

ایک دن حویلی میں پوجا کی کوئی تقریب تھی۔ مندر کا پنڈت حویلی کے باسیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس قسم کی عبادت تھی؟ حویلی کے تمام باسی بار بار بھوکان کی صورتی کے سامنے جا کر ”سنتے پرنام کرتے اور پتھر پتھر وغیرہ پڑھتے تھے۔ توصیف بھی ان کے دھک میں رنگا بالکل ان جیسا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ اس طے میں بہت برا لگ رہا تھا۔ اس دن حویلی میں اس بھوکان پوجا کے دن مجھے بھی خصوصی طور پر سنتے پڑے پہنچانے گئے تھے۔ پہلے تو میں بھی کہہ کر حویلی والوں نے معمول کے مطابق میرے کپڑے بنوائے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب حویلی کے اندر باقاعدہ بھوکان پوجا شروع ہوئی تو سب سے پہلے پنڈت نے توصیف کو

اپنے پاس بلایا اور اسے اپنے پاس بڑی محبت اور عزت سے بٹھایا۔

کچھ وقت کے بعد اس نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ ”توصیف نے اب اپنا اہرم چھوڑ کر ہمارا اہرم دل سے قبول کر لیا ہے لہذا آج سے اس کا ہندو نام مودن ہوگا۔“ میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے لگا جیسے میرا دل اپھل کر منکوحہ ہو گیا ہو۔ میں دل ہی دل میں اس دن کو یاد کر کے رونے لگی جس محسوس گھڑی ہمارے لیے کس مجبور خاندان نے اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔

پرکاش مندر نے مجھے بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور مجھے کہا کہ سب کے ساتھ تم بھی ہندو پوجا میں بیٹھو۔ انہوں نے اتنی بڑی بات اسنے آرام سے کہہ دی کہ مجھے اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں گھبرا گئی۔

”آؤ بیٹی..... سریشٹر دیو نے مجھے کہا۔
”ارے آنا پوجا پر بیٹھ..... مرلی پرکاش نے اپنے ہندوئہ انداز میں کہا۔
”نہیں..... نہیں..... توصیف..... میں گھبراہٹ میں التاسیدھا بولنے لگی۔

”آ..... آ.....“ سریشٹر دیو نے مجھے اس پوجا میں بٹھانے پر بلند ہو گئیں۔
”نہیں..... میں مسلمان ہوں۔ میں بھوکان کی صورتی کی پوجا نہیں کر سکتی۔“

میرے بھائی توصیف نے جو کہ ہندو ہو چکا تھا اس نے مجھے بھی پوجا کی طرف لانے کی کوشش کی تو میں نے خدا تعالیٰ سے یہی دعا کی کہ ”خدا! مجھے میرے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی طاقت عطا فرما۔“

”جا..... شائستہ۔“ پنڈت نے کہا۔
”نہیں..... میں نے پوجا نہیں کی۔ آنا..... میں

نے اس بارگشی سے کہا۔

توصیف نے غصے سے بچھے کہا۔ ”میں تجھے کبہ رہا ہوں میرے واسطے بیٹے میں تیرا بھائی ہوں۔“

میں نے ایک زوردار چٹا پس کے منہ پر چڑھا۔

”تو میرا بھائی نہیں ہے اور نہ ہی اب تو توصیف ہے بلکہ موہن ہے۔“

”خوفی رشتہ سے تیرا بھائی ہوں۔“

”تو اب ہندو ہو گیا ہے۔ تیرا میرا کوئی رشتہ نہ

نہیں ہے۔“

پھر خاکہ پر کاش سندر میرے پاس آیا اور کہا۔

”سنگھان پوجا کی اس عمل کو بدعزہ نہ کرو۔ آ جاؤ

بیٹی۔“ میں نے مسلسل انکار کیا تو مجھے ڈانٹنے ہوئے

کہا۔

”جا۔۔۔۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔۔۔۔“

میرے بھائی نے بھی میری تدبیر پر کوئی رد عمل

نہیں کیا تھا۔ میں اپنی کھڑکی میں آ کر اپنی قسمت کو

رونے لگی۔

رات کو توصیف (موہن) کو خڑکی میں آیا اور

کہا۔ ”میں اپنی مرضی سے ہندو مذہب میں داخل ہوا

ہوں۔ اب یہ تیری مرضی ہے مجھے بھائی کی حیثیت

سے قبول کرے یا نہیں کرے۔“

میں اپنی جگہ جب حویلی میں نورنی خاکہ کرانی کی

خدمت کے لیے گئی تو انہوں نے مجھے زیادہ اہمیت

نہیں دی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھ سے اپنا چشم درگاہی

جو ناگزیر میں پھور رہی تھی۔

حویلی والوں نے ایک ہفتہ کے لیے وہاں جانا

تھا۔ اب حویلی میں مودا چھلا پیار تھا کرانی نورنی

دوبی کی خدمت کے لیے ایک بڑی عمر کی درکرانی

موجو تھی۔

حویلی کے کینوں کو جونا گڑھ گئے ہوئے ابھی

تین دن ہوئے تھے کہ ایک رات میں کھڑکی میں

گہری فیکورس تھی۔ توصیف (موہن) کرات کوئی

مندر چلا گیا تھا۔ میں نے نیند میں محسوس کیا کہ

میرے خیم کو دو تین مردوں نے بری طرح دبوچا ہوا

ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے میرے مندر پر ایک

دوپٹہ کو کولہ بنا کر ٹھوسا اس کے بعد انہوں نے

میرے ہاتھ پاؤں کی رسی سے باندھے۔ میں نے

زور سے جھوٹا کر شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے

میرے پاؤں باندھنے والے نے مضبوطی سے نہیں

باندھے تھے۔ میرے زور لگانے کی وجہ سے پاؤں

کھل گئے۔ میں نے مزاحمت کرتے ہوئے ایک

بندے کو اتنی زوردار مار دی کہ وہ زمین پر گر گیا۔

اس کے بعد میں نے جدوجہد کر کے ہاتھ پاؤں

دارنے شروع کر دیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے

میرے مندر میں پھنسا ہوا دوسرا کولہ بھی نکل چکا تھا۔

میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

”بھاؤ۔۔۔۔۔ بھاؤ۔۔۔۔۔“

اتنے میں مودا چھلا نیند میں بوڑھا ہوا اپنے

ایک غنڈے کی گردن کو زور سے پکڑ کر اسے نیچے گرایا

ہوا تھا اور ساتھ ساتھ چلائے جا رہا تھا۔

”شائستہ۔۔۔۔۔! ایٹھا اٹھا کر نہیں مار۔۔۔۔۔“

میں غنڈوں کو دیکھ کر کھوکھلائی ہو گئی۔ بہر حال

میں نے ایک ایٹھا اٹھا کر مودے سے اپنے غنڈے

کی کمر پر زور سے دے ماری۔ وہ ایٹھا کھا کر میری

جانب لپکا تو میں نے حویلی کے دروازے کی جانب

بھاگنے کی کوشش کی جو کہ بند تھا۔ میں نے زور زور

سے حویلی کے بند دروازہ پر پانی پھیلیاں مارنا شروع

کر دیں۔ شکر ہے تھوڑی دیر میں حویلی کی خادہ

نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بھی مودے اور غنڈوں کی

لڑائی کو دیکھ کر دم بخور ہو گئی۔ اس نے بھی زور زور

سے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس شو میں

ساتھ والے دو تین بڑی بھی آگئے تھے لیکن اس

دوران ایک دل خراش واقعہ یہ اس کا اس قسم کے کسی

دوران ایک غنڈے نے مودے کے پیٹ میں رام

پوری جا تو کھینچ دیا تھا۔ پڑوسیوں نے آہٹیں

چھڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں بڑی بھرتی

سے بھاگ گئے۔

میں بڑی پیار خاکہ کرانی کے پاس جا کر ان سے

چھٹ کر دوئے لگی۔ وہ صبح طریقے سے چل نہیں سکتی

تھیں۔ بہر حال وہ میرے سہارے چل کر آئیں تو

باہر کا منظر دیکھا۔ انہوں نے زمین پر پڑے شدید

زخمی مودے کو فوری طور پر ہسپتال لے جانے کو کہا اور

ایک سازش کے تحت ہندو بنالیا ہے۔ میری زندگی کا

اب کوئی مجبورہ نہیں ہے۔ آج تجھے نامعلوم

بدعماشوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے کل نہ

جانے تیرے ساتھ کیا فیکورس بیت جائے تو یہاں

سے ابھی بھاگ جا۔“

”لیکن کہاں جاؤں؟ ہم لوگوں کا یہاں کوئی

جاننے والا نہیں ہے۔“

”بیٹی۔۔۔۔۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اوپر

خدا۔۔۔۔۔ سنگھان نکھان ہوتا ہے۔“ خاکہ کرانی نے کہا۔

انہوں نے اپنی خادہ کے ذریعے بڑوں کے

ایک دلیر جوان منگے کھلوایا۔ وہ آیا تو خاکہ کرانی نے

اس کے ہاتھ پر 20 روپے سونے کے لاکٹ کڑے

رکھے اور کہا۔ ”اس لڑکی کو ابھی مسلمان آباد میسنر

مدد اس پہنچاؤ۔“

”میں اپنے محسن مودے سامیں اور بھائی

توصیف (موہن) کو لے بغیر نہ جاؤں گی۔“ میں

نے کہا۔

”بس تو فوراً پہلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا کیونکہ

یہاں پیچھے اب تیرا کچھ نہیں بچا ہے۔“ پھر انہوں

نے منگے کو کہا۔

”بار کھو بیٹا۔ اگر تجھ میں ذرا بھی انسانیت

ہو تو سنگھان کے واسطے اسے منزل پر پہنچاؤ۔“

مگنا خود بدعماش قسم کا تھا۔ مجھ سے بھی ڈر

لگ رہا تھا لیکن میں اس کے ساتھ تھی۔ میں مگنا

جھیل مچلو



شک کا دریا

لہرں محبت ہزاروں کا خیال

ہم نے جینے کی سزا کائی ہے
کیسے گزرا یہ سفر، جانے دو

ایک ایسی ماں کی کہانی جس نے بیس برسوں کا کرب جھیلا تھا

چلی منزل پہ خوشی کی دھوکہ بخ رہی تھی۔
بہرے بیٹے کی شادی تھی لیکن میرے دل میں سالوں
کا غبار بھرا ہوا تھا جو ہر کھٹے کو بے قراؤ تھا۔ بیس
جو درمیں نے سہا ہے وہ ایک دم کس طرح بھولا
جائے؟ ان بیس برسوں میں میں بل میں رہی ہوں
جانے کتنی راتیں میں نے خواب پر کزرازی ہیں
کے کا ایک طوفان میں نے جھیلا ہے اور کتنی ہی
باہر گرا کر موت کو گلے لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ہر



یہ کہتے ہی وہ مر گیا۔ مجھے اس وقت لگا جیسے میرا سگا
بھائی تھا۔ جدا ہو گیا ہو۔
پھر میں مندر گئی تو وہاں تو صیف (موہن) اپنی
عبادت میں مصروف تھا۔ اسے میری آمد کا علم ہوا تو
وہ میرے پاس آ گیا۔
”یہاں کیوں آئی ہو؟“
”سنگے نے کہا۔“ تو یہاں بھگوان کی پوجا کر رہا
تھا۔ وہاں آج تیری بہن کی عزت لٹ جاتی.....“
”کیا کہا؟“ اس نے چلا تے ہوئے کہا۔ ”میں
اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے میری بہن کی
عزت پر ہاتھ رکھا ہے۔“
”تو کس سے لڑے گا؟ تیری بہن پر جن
بد معاشوں نے ہاتھ ڈالا تھا؟ وہ نامعلوم تھے.....“
سنگے نے کہا۔
میں نے تو صیف کے آگے ہاتھ جوڑے کہ
خدا کے واسطے تو وہاں اپنے مذہب میں آ اور
میرے ساتھ مدد اس چل لیکن تو صیف نہ مانا۔
میری تمام التجائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ وہ س
سے مس نہ ہوا۔ ٹھاکروں اور مندر کے پندتوں
نے اسلام کی جانب سے اس کا دامغ آتھا تنگ کر
دیا تھا کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے سے
صاف انکار کر دیا۔
سنگے نے مجھے کہا۔ ”یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے تو
چل۔“
تو صیف نے کہا۔ ”میں دوبارہ اسلام قبول نہیں
کروں گا لیکن ایک منٹ..... تو مندر کی بیڑیوں پر
ٹھہر بیٹھی آتا ہوں۔“
میں اور مگا بھگت سے اس کا انتظار کرنے
لگے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مندر میں موجود ہندو
فٹنڈے نے آئے لیکن وہ اپنی گود میں میری ماں کا
ناجا بچے لے آیا جو کہ گہری نیند میں تھا۔ اسے میری

گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے پندت کہتے
ہیں کہ یہ ناجائز ہے، گندگی کا ڈھیر ہے اسے ہم اس
مقدس مندر میں نہیں رکھ سکتے۔“ میں نے اپنے کو بکیر
سوچے کیے تو رانا اپنی گود میں لے لیا۔ کچ پوچھو اس
وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی ماں کی گود میں اس کا
چمچر اہو بچا گیا ہو۔ میں نے تو صیف (موہن) کو
ایک دفعہ پکڑا اپنے ساتھ مدد اس لے جانے کی کوشش
کی لیکن وہ دایا مندر چلا گیا پھر سنگے نے مجھے
بحفاظت سے سمجھتے مدد اس پچھاپیا۔ اس نے اپنا
فرض بخوبی نبھایا تھا۔
مدد اس میں اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں ایک
ایسے نیک دل عالم و دین فاضلے۔ انہوں نے اس
بچے کا نام سادہ رکھا۔ ہم کچھ ماہ مدد اس کے اس
سینئر میں رہے اور جب پاکستان بنا تو ان عالم دین
نے مجھے اور بچے کو ایک نیک دل فاضلے کے حوالے کیا
اور یوں ہم ملتان آ گئے۔ میں نے سادہ کی تعلیم و
حریت و دینی تعلیمات کے مطابق کی۔ میں نے
اسے معاشرے میں اسے عزت دار مقام دلانے
کے لیے دن دن رات محنت کی۔ اسے پڑھا لکھا کر
پروفیسر بنایا اور اس کی خاطر میں نے زندگی بھر
شادی نہیں کی۔

میں آج بھی اسے محسن مودے جیسے گوارا دوسند
بڑی شاکرانی کے احسانات کو یاد کرتی ہوں۔ خدا ان
دلوں کی روروں کو ہمیشہ بخشتا رہے لیکن میں یہ راز نہ
جان لگی کہ میری ماں کے بلبل سے پیدا ہونے والا یہ
بچہ کس عیاش شخص کی نشانی تھا؟“
شاکر تہہ تیکہ اپنی سرگزشت سنا کر خاموش ہو گئی
جیسے گمراہ کے چرے کی جبریوں کی ایک ایک کیر
چبچ چب کر کہہ رہی تھی کہ جن انگادوں پر تل کر انہوں
نے نسبت کا سفر بڑھ پالے کیا تھا وہ کوئی بلی کیل
نہیں بلکہ بڑے خوشے کا کام تھا۔

بار ماں کا دیکھی چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ماں بیٹیوں کے دکھ مشترک ہوتے ہیں اور بیٹیوں کے دکھ تو ویسے بھی ماؤں کو رلاتے ہیں۔ اب ماں نہیں ہے اور ناپی جذبات کا طوفان شاید اسی لیے زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا مگر بیس سال بعد آج پھر جذبات ابل رہے ہیں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری پیاسی مستی چراب ہونے جاری تھی کہ میرے گھر میں میری اپنی سگی بیٹی بہو کی صورت آنے والی تھی اور میری آنکھوں کے سوتے جو درد و کوشش ہو چکے تھے وہ پھر سے ہرے ہو رہے تھے۔

پہلی منزل پہ میرے محلے والیوں کا ایک شور تھا؟ قہقہوں اور تالیوں کا شور ڈھولک پر شادی کے گانے گائے جا رہے تھے اور میرے ذہن میں پچھلے بیس برس کے واقعات کسی قلم کی طرح چل رہے تھے۔

.....

میری پھوپھو اور امی ایک دوسرے کی تندیں بھی تھیں اور بھابھیاں بھی۔ وٹے ٹٹے کی یہ رسم برسوں سے ہمارے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ یہ وہ رسم میری دادی کی مرضی سے ہوا تھا۔ پھوپھو کی بالکل بھی مرضی نہ تھی کہ ان کی شادی ماموں سے ہو۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ ناخوش رہیں۔ اس کے برعکس میرے امی بابا اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔

ہم دو بہنیں تھیں اور پھوپھو کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ پھوپھو چونکہ اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھیں اس لیے زیادہ تر یکے میں ہی رہتی تھیں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا اور ہماری شدید خواہش تھی کہ ہمارا بھائی بھی ہو پھر تقریباً سات سال بعد ہمارا بھائی پیدا ہوا جس کا نام تنویر رکھا گیا۔ بھائی کو پا کر ہم بہت خوش تھے۔ اسی دوران امی کو شہر میں ٹیچری مل گئی اور ہم شہر آ گئے۔ بابا نے بھی اپنی کچھ زمین بیچ کر ایک

چھوٹا سا گھر اور گھر کے قریب ہی دکان بھی لے لی اور اس طرح ہم شہر میں ہی رہنے لگے۔

زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی کہ ایک بھونچال آیا۔ بابا کا روڈ ایکسپریس میں اشتعال ہوا تو غموں کا ایک پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا دکھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وقت سب سے بڑا امر ہم ہوتا ہے اور اسی امر ہم سے ہم یہ تم جھیل گئے۔ ہم تو بچے تھے مگر امی کے ساتھ تو یہ تم آ سیب کی طرح چٹ گیا تھا اور وہ آ سیب تھا ہماری دادی جو اٹھتے بیٹھتے ای پر طنز کے تیر برسانی رہتی تھیں کہ پہلے تو کری کا بھانہ کیا اور میرے بیٹے کو بھلا کھلا کر شہر لے آئی مجھ سے دور کیا اور اب اسے کھائی..... اب تو کیچر ٹھنڈا ہو گیا؟ میں تو کہتی تھی یہ لوگ منحوس ہیں پھر بھی میری سنا کون ہے؟ اب یہ ماں بیٹیاں (یعنی ہماری امی اور نانی) اور کتنی غصہ پھیلایں گی؟ ایسی باتوں سے امی کا چہرہ کرب کی تصویر بن جاتا تھا۔ امی کے ساتھ ہم جب بھی گاؤں جاتے تو ایسی باتیں سننے کو ملتیں۔ آخر ہم بچوں نے ماں کو گاؤں جانے سے روک دیا۔ جب ماں کہتیں گاؤں چلیں پھوپھو سے ملنے تو ہم منع کر دیتے کہ اگر دادی کو ہماری یاد آئے گی تو وہ خود آ جائیں گی۔ دادی شہر آئیں تو امی کا جینا دو بھر ہو جاتا۔ دادی طعنے تشنے دیتیں۔ امی بڑی صابر عورت تھیں انہوں نے کبھی پلٹ کر دادی کو جواب نہیں دیا۔ جب دادی چلی جاتیں تو گھر میں سکون ہو جاتا۔

امی اب ہماری ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ ہماری بہتر تعلیم اور پرورش امی کا اہم مقصد تھا۔ ہم تینوں بھائی بہن ہر سال اپنی جماعتوں میں امتیازی نمبر لے کر کامیاب ہوتے رہے۔ زندگی اسی طرح اپنی ڈگر پر چل رہی تھی کہ میری زندگی کے سمندر میں پہلا تھپر پڑا اور لہلہا ہونے لگی۔

ایک روز ہم لوگ کالج سے واپس آئے تو دیکھا

تاکہ کاما نہ تھا یہ

کام سے ہرگز جی نہ چرانا

ترقی کی راہوں پہ جانا

لیکن ہم نے شروع کیا ہے

چھٹی کلچر..... بڑا ٹال کلچر..... شکستہ شفیق

”ماموں جان آئے ہیں اور ساتھ میں حماد بھائی بھی ہیں۔“ وہ ہنستا ہوا آ رہا تھا۔ سب مسکرانے لگے۔ اسی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ماموں مٹھائی لائے تھے کیونکہ حماد نے انجینئرنگ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ وہ لوگ شام تک رہے۔ گھر میں رونق مچ گئی رہی۔ حماد سچیدہ لڑکا تھا مگر آج اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

رات کو جب سب سونے کے لیے چلے گئے اور میں کچن سمیٹ رہی تھی تب امی نے میرے پاس آ کر کہا تھا۔ ”بیٹا عانتہ! آج بھائی جان نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہیں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“ امی میری طرف دیکھنے لگیں۔

”امی! جو آپ مناسب سمجھیں۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ امی نے میری پیشانی چومی اور چلی گئیں اور میں حماد کے بارے میں سوچنے لگی۔

پھر ایک بہار بھری شام میں ماموں اور ممانی آئے اور مجھے حماد کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے اور بدلے میں ماموں کی بیٹی جو کہ بارہ برس کی تھی اور میرا بھائی تویر جو ابھی نیا نیا فرسٹ ایئر میں آیا تھا۔ اُن کی بھی بات چلی ہو گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ہمارے خاندان میں دئے سٹے کا یہ رواج برسوں سے تھا۔ حماد جوں ہی برسرِ روزگار ہوا ہماری

دل گھر میں ایک چھوٹی سی دعوت کیے بیٹھی تھیں۔ وہ اصل سے ہاف ٹائم میں ہی آ گئی تھیں۔ دعوت کا یہ اہام انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بہت دنوں کے بعد ماموں آئے تھے ویسے تو وہ کبھی نہ بھی آ جاتے تھے لیکن مانی اماں کے انتقال کے بعد تو ان کا آنا اصل سی ختم ہو گیا تھا۔ اب اتنے سالوں کے بعد ان کے اہامک آنے سے میری ماں بہت خوش تھیں۔

اصل تو ہم بھی بہت تھے اپنے کزن حماد اور ماموں کے آنے سے چاہے اپنوں سے لاکھ شکوے ہوں لیکن اپنوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ اس دن ہم تینوں یعنی مجھے، تویر اور نجمہ کو بہت اچھا لگا اور ہمیں وقت کا بالکل پتہ نہیں چلا کہ باتوں باتوں میں کب شام ہو گئی۔ ماموں جب جانے کے لیے اٹھے تو امی اداس ہونے لگیں۔

ماموں نے ان کی اداسی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ تم لوگوں نے تو اب فرار گاہوں آنا جاس اتوار کو۔“

”انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔“ امی نے کہا اور پھر اکثر ہم گاؤں جانے لگے۔ ہم بھی اپنوں کی بہت کچھ بھوکے تھے پھوپھو، دادی اور دوسرے شتہ داروں سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔ میں نے اس کو دیکھا تھا کہ حماد کی نظر میں میرا چہرہ کتنی رعتی تھی اور میں اُن نظروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی اس لیے میرے لبوں پر بھی ایک خاص مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔

اس دن اتوار تھا۔ امی کو ہلکا بخار تھا۔ وہ ٹیلیفون کر سوری تھیں۔ ہم لوگ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں کپڑے پر پس کر رہی تھی۔ گھر خالی میں لگی ہوئی تھی اور تویر امی کا سر دبا رہا تھا کہ لیل کئی۔ تویر نے دروازہ کھولا اور نعرہ لگا تا ہوا

شادی ہوگئی۔ حماد کی محبت اور ماموں کی شفقت میں زندگی بہت حسین ہوگئی تھی البتہ میری ممانی جو کہ میری سگی چھٹی بھی اُن کا رو بہ میرے ساتھ سرد تھا لیکن میرے دل میں ان کے لیے کوئی برائی بات نہ تھی اسی لیے میں ان سے محبت اور ران کی عزت کرتی تھی اور دل و جان سے سب کی خدمت بھی کرتی تھی لیکن پھر میری من ان کے دل میں جگہ نہ بنا سکی تھی۔

دو سال اسی طرح گزر گئے اُن دور ران میرے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پہلے تو چھو پھو بے لفظوں میں لطفے دیتی تھیں مگر اب تو انہوں نے صاف صاف کہا شروع کر دیا تھا کہ مجھ سے لکھ کر لے لو یہ ماں نہیں ہے۔ یہ تیرا سال بھی اسی طرح سرک گیا اور کوئی امید نہ رہی۔ اس اثنا میں خود برادر ٹوپیک شادی کی تاریخ بھی طے ہوئی اور کمر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے اور میں بھی اپنے کمر اور سگی اسی کے کمر رہنے لگی۔ بھائیوں کی شادی کا بھوں کو بہت ارمان ہوتا ہے ہاری خوشی کا بھی ٹھکانہ نہ تھا۔

ہم اپنے اکلوتے بھائی کی شادی کے ارمان لگا لے کر تیار کیا کر رہے تھے اور پھر وہ مبارک دن بھی آیا جب تو یہ ہمارے بھائی تنویر کی دہن بن کر ہمارے آگن میں آئی اور وہ دونوں خوش خوش خرم زندگی گزارنے لگے۔ اسی بھی بہت خوش تھیں۔ دن گزرتے پتہ ہی نہیں چلا۔ جب امی کی دادی بننے کی خبر ہمارے گھر پہنچی تو چھو پھو نے طے کر کے ہوئے کہا کہ میں تو یہ حسرت قبر میں لے کر جاؤں گی کہ اپنے پوتے پوتیاں دیکھوں اور میں آؤں بھرا کر وہ مٹی بھلا میرے بس میں کیا تھا؟ سب میرے مال کا اختیار میرے۔

ایک دن دادی نے مجھے بلایا اور کہا۔ ”دیکھو جیٹا اگر تم اولاد نہیں جاتی تو مجھ سے کہہ دو میں رابو کو

سمجھا دوں گی۔“ دادی کے اس طرح پوچھنے پر تو میرا من ہی رہی۔

”دادی! آپ ایسا سوچ رہی ہیں؟“ میں نے پوچھی ہے دادی کو دیکھا۔

”ہاں کیونکہ تمہاری اماں بہت جالاکا ہے۔۔۔۔۔۔“ میں اپنے کمرے میں بھاگ آئی اور نے گئی اور خدا کے حضور گڑ گڑائی۔

کچھ دنوں بعد تو یہ نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بچے کا نام شہاب رکھا گیا۔ خوب مناسیاں باجھیں گئیں۔ امی میرے کمرے میں مٹھائی لے کر آئیں شام کو جب وہ جانے لگیں تو چھو پھو نے کہا۔ ”میرے حماد کی بھی اولاد ہو جانی چاہیے۔ سمجھا دو اور کوئی اور خود بھی بھلو۔“

”یہ میرے بس میں تو نہیں ہے اور کیا میں نہیں چاہتی کہ زبیدہ ماں ہے؟“ امی نے جواب دیا۔

دادی نے کہا۔ ”تیری چالاکیاں تو میں اچھ طرح جانتی ہوں۔ پہلے تو نے میرا بیٹا مجھ سے چھینے پھرتے پوتے پوتوں کی شکل دیکھنے سے ترسا یا اب میری بیٹی کو بھی بیٹے کی اولاد دیکھنے سے ترسا رہا ہے۔“

”یہ خدا کی طرف سے کوئی آزمائش ہے۔ میری بیٹی کی نیت میں کوئی گھٹ نہیں ہے۔“ امی نے دکھ سے کہا اور زہد ہی لوٹ گئیں۔

اب چھو پھو اٹھٹے بیٹھے مجھے لطفے دیتے تھے ناچنے ہواور میں اللہ کے حضور گڑ گڑانے سے مبرا کیا کرتی تھی؟ ماموں اور حماد ہی میرا ہاتھارتے۔ چھو پھو اور دادی دونوں ہی جیسے سوتیلوں جیسا سلوک کرتے تھیں۔

ایک رات ماموں ایسا سوئے کہ پھر میری

لے۔ ان کے جانے سے میرے دکھوں میں اضافہ ہوا کیونکہ ماموں میری ڈھال تھے اب وہ بھی نہ رہے تو چھو پھو کو نے کوئے والا بھی کوئی نہ تھا۔ دادی اور چھو پھو دونوں سر جوڑے بیٹھی رہیں۔ میں باوجود محنت کرنے کے اُن کو بالکل نہ بھائی تھی۔ حماد کی بے کام کی وجہ سے دو دو دنوں ساٹھ پر ہوتے بلکہ کمر کی تحفہ کی وجہ سے اب تو وہ ہفتہ ہفتہ آتے تھے۔ ایسے ہی دن گزر رہے تھے کہ دادی بھی گزر گئیں۔ کمر میں خاموشی رہتی۔ چھو پھو نے مجھ سے کہی کہ اب ہی چھوڑ دی۔ میں پھر بھی ان کی جی جان سے خدمت کرتی تھی۔

اُن دن میں بچن میں کام کر رہی تھی۔ حماد نے اپنے سے اور دمبر کی خوب باتے ہوئے جن میں مجھے سے چھو پھو بھی بیٹھی تھیں کہ انہوں نے حماد سے کہا۔ ”تو یہ کہ ہاں اب دوسری اولاد ہونے والی ہے۔ میں تو یہ آرزو کرتے کہ تمہارے ابا کی طرح کمر میں چلی جاؤں گی۔“ اور روئے لگیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ خدا نہ کرے۔“

حماد نے پریشانی سے کہا۔

”اور کیا تم میرے بیٹے تھوڑی ہو جو ہمیں میرا مال ہو۔“ چھو پھو نے روتے ہوئے کہا۔

”امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ حماد نے چھو پھو کا ہاتھ چومے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو تم دوسری شادی کر لو۔“ چھو پھو نے صاف صاف کہہ دیا۔

”مگر امی!۔۔۔۔۔۔“ حماد حیرت سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”امی!۔۔۔۔۔۔ زبیدہ۔۔۔۔۔۔ میری بیوی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ کی بیٹی بھی تو ہے؟“

”میں ناچنے بیٹھی کا کیا کروں؟ اور پھر تم میرے اکلوتے بیٹے ہو؟“ یہ باتیں سن کر میں تو جیسے بالکل لفظی پڑ گئی۔

دوسرے دن حماد پوٹ پر چلے گئے۔ اب میں خدا سے خوب بلک بلک کر دعا میں لگتی۔ میری اور حماد کی طبر پر پوش بھی بالکل درست تھیں۔ امی نے بھی میں وغیرہ خوب مانگی تھیں۔

ایک رات میں اپنے رب کے حضور بہت گڑ گڑائی تھی۔ ”اے اللہ! تو میری آزمائش ختم کر دے اور میری گداز اپنے پیارے محبوب کے صدمے“ پھر دے میرے مولانا میں روتے روتے جاہ نماز پر ہی سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سفید فرماک میں لمبوں ایک بہت ہی پیاری بیٹی میری گود میں ہمک رہی ہے۔ جب اُنکھ کھلی تو دل پر میری سرشاری تھی۔ دوام روم میں ایک ملیت کا احساس تھا۔ حماد نے تو میں نے انہیں بھی اپنا خواب بتایا۔

انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہمیں ضرور اولاد کی خوشی دے گا اور میں کوئی حماد نہ کر سکے گا۔“ میں نے دل ہی دل میں اُن کی بات پر آمین کہا اور پھر اسی ماہ ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی نوید سنائی۔ اب جب تو یہ دوسرے بیٹے کی ماں بنی تو میری گود بھی بھر نے لگی۔ چھو پھو سمیت سب کو دہری خوشی ملی۔ ٹھیک نو ماہ بعد میری گود میں ایک پیاری سی بیٹی گئی۔ اُس کا نام عائشہ رکھا گیا۔ چھو پھو بھی پوٹی کے ساتھ بہل گئیں اور ہمارے کمر پر خوشیاں ڈالنے لگیں۔ جب جنم کے پنے آئے اور ہماری عائشہ کو تلی زبان میں باتیں کرنے کو کہہ کر اُنکھ جیسے مکرانے لگا۔ میں سوچتی۔ بچوں کے بغیر تو زندگی بالکل بے مزہ تھی۔

اب حماد مذاق میں کہتے۔ ”اب دوسرا بچہ بھی ہو جاوے گا پھر دے ورنہ میں خداوائ سے کہہ دوں گا کہ میری دوسری شادی کرادیں۔“ میں انہیں اُنکھیں دکھائی اور دھڑارتے سے سکرادیے۔

شاہد اسی کی محبت اور برکت تھی کہ بھی ہو گئی ہے۔ وہیں ہمیں یہ پتہ چلا کہ تنویر کا تالہ دوسرے شعبہ میں ہو گیا ہے اور وہ کچھ سامان اور چار سالہ مہتاب کا ساتھ لے گیا ہے۔ خدا خدائے کسے! تنویر کا تالہ کھنڈراتو یہ جان کر جرت کا تھکا لگا کہ اس کا تو تالہ ہوا ہی نہیں ہے وہ بے کراچی میں ہی ہے مہتاب کے ساتھ۔ اس نے سب احوال سننے کے بعد کہا کہ میں فوراً نکلتا ہوں۔ مجھ پر تو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ اسی مجھے کرائے کی گاڑی میں گاؤں سے واپس گھر لے آئیں۔ مجھے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے دس پندرہ دنوں میں طبیعت کچھ مستحکم اور ڈیوچارنگ ہو کر گھر آگئی۔ تنویر اداری کی دونوں نے چھٹی مل ہوئی تھی۔ اخباری دن ریڈیو پر ہر یکساں اشتہار دیئے لیکن پھر پھوچار اور فیکہ کا کوئی پتہ نہ تھا تنویر کو اس بات کی جرت تھی کہ کوئی نہ بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور خود بھی تو چار سال کا مہتاب چھوڑ گئی تھی۔ کیا اسے اپنے بچے کی یادیں ستانی؟ ہمارے پاس ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا سوائے اس آجین بھرنے اور رونے کے.....!

وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا سو میرے دن بھی گزرنے لگے۔ تنویر نے مہتاب مجھے سونپے ہوئے کہا کہ اسے عاشر کی جگہ لے لو۔ قہاری مٹاؤ کچھ نہ کچھ تیلی ہو جائے گی اور میں بھی چپ چاپ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی گی۔ زعمی اپنی ڈگر پر چلنے لگی اداری انجمن پڑھنے اور مہتاب نگینے۔ تنویر اپنی ڈیوٹی پر لوٹ کر گیا۔ میں اور مہتاب گھر میں ہوتے۔ وہ بہت سادہ سادہ منہ بڑھتا تھا۔ کبھی نہیں کرتا تھا بلکہ اگر میں چپ چاپ لگتی ہوئی تو میرا سر دبا کر میرے آس پاس ہی رہتا۔ میرے ساتھ ہی سوتا اسی وجہ سے میرا دھیان

مجموع کر دیتی تھی۔ اسکول میں میری ترقی ہوتی رہی۔ مہتاب بھی سال بے سال اپنا قد اور پڑھائی میں بڑھتا رہا۔ کسی اس نے باپ کے ساتھ جانے کی بات نہیں کی بلکہ میں نے بھی کہا بھی تو کہا کہ میں آپ کچھ دیر کرئیں جاؤں گا مایا جان۔ اور میں سرشار ہو جاؤں کہ میری سب خوشی تھی۔

ایک دن اسی ہی میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ تنویر آیا چلا گیا کر کے چلا گیا میں نے بھی وہ گھر نہ بھر چھوڑ دیا۔ مجھ اور مہتاب کو لے کر دوسرے شہر آ گئی۔ ایک سال بعد تجربہ کی چاک بکلی ساتھ چھوڑ گئی اور میں تنہا رہ گئی۔ مہتاب جو کراہا انجمن گھر کے پہلے سال میں تھا قہاراً بہت خیال رکھنے کا تھا۔ وہ ہاسل میں رہتا تھا تاہم تجربہ کے بعد میرے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بہت فرماں بردار بڑا تھا۔ وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔ عاشر تو اب تک بن کر مرنے لگی تھی۔

کئی دنوں سے میں نوٹ کر رہی تھی کہ مہتاب کے چہرے پر ہر وقت شگفتگی مسکراہٹ چھٹی رہتی تھی۔ میں چاہتے تھے کہ وہ اسی حال سے سوچ رہی تھی کہ مہتاب بائیک کی چابی گھاتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

”مام..... میں ذرا ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں آپ دروازہ دھاک کر کھینچے گا۔“
”بہت خوش لگ رہے ہو اور بڑے اہتمام سے تیار ہوئے ہو۔ کیا کوئی خاص دوست ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”ہاں مام“ بھی آپ کو بھی ملوایا گا۔“
”فردوس ضرور۔“ میں نے جتنے ہاتھ کیٹ لاک کیا۔ اس کا وہ انکر اپنی دوست کی ہاتھ بڑے شوق سے کھتا تھا اس کا نام سترہ تھا وہ اسے اپنے دوست کی شادی میں لگی تھی اور مہتاب اسے دیکھتے

ہی دل ہل رہا تھا۔
”ستارہ وہ ایک چھوٹا بھائی اور ایک بڑی بہن ہے جو کہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔“ مہتاب نے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔
”پاپ.....“ میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”پپپپ.....“ دیکھی ستارہ نے بتایا نہ میں نے کبھی پوچھا۔“ مہتاب نے کہا۔
پھر امتحانات کی وجہ سے کئی مہینے چپکے سے بیت گئے۔ پہلے میرے اسکول میں سالانہ امتحانات پھر اس کا رزلٹ شیٹ کی تیاری پھر کئی کلاں اور پھر گرماں بھگتیں۔ وہم و گم میں اتر جاتی تھی۔ کسی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔

اس دن اتر رہا تھا میں قارئین۔ اسکول کے کاموں سے نمات ملتی تھی۔ بس چھینوں کا کچھ کام رہ گیا تھا۔ گریوں کی چھپان ہوئے والی تھیں۔ میں ابھی انہما کر کر رہی تھیں جو کر رہی تھی۔
”یہ نیچے کرم کرم چائے۔“ مہتاب نے دوکپ رکھے ہوئے کہا۔ میں اپنی مام کے لیے اپنے ہاتھ سے بنا کر لایا ہوں۔
”شکر ہے۔ مای کہاں ہے؟“ میں نے پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ دوپہر کا کھانا بنا رہی ہے۔“ مہتاب نے جواب دیا۔ ”مام اگر آپ کہیں تو میں آج سترہ کو انوائٹ کر لوں شام کی چائے پر؟“
”ہاں ہاں“ کیوں نہیں۔“ میں خوش ہو گئی۔
ہر ماں کو بیٹے کی شادی کا ارمان ہوتا ہے مجھے بھی تھا۔

پھر کب شام ہوئی پتہ بھی نہ چلا۔ سترہ سے ملنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا اس لیے میں لان میں بیٹھی سر ہا ہ انتظار کرتی۔ بار بار نظریں کیٹ کی طرف

عزل

آؤ سز کی شام کوئی فیصلہ کریں
لے کر خدا کا نام کوئی فیصلہ کریں

آؤ کہ ہم تعین منزل کریں ابھی
یہ کیا کہ گام گام کوئی فیصلہ کریں

آؤ کہ توڑ ڈالیں انا کا بھرم ابھی
لیس ہے غم کی شام کوئی فیصلہ کریں

ہم آج ہی سے چھوڑ دیں محبتیں ہری
سب کو کریں سلام کوئی فیصلہ کریں

حسنِ فنا کے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا
کس کو یہاں دوام کوئی فیصلہ کریں

محسنِ سلیم

”السلام علیکم؟“ اس نے سلام کیا۔
”وعلیکم السلام!“ میں نے جواب دیا۔
”یہ میری چھوٹی بہن رخشہ ہے۔ یہ مرکز میں
ہے۔“ ستارہ نے تعارف کر دیا۔ یہ نہیں کیوں
رخشہ کو دیکھ کر میرے دل پر عجیب سا بھاری پن
چھانے لگا کیونکہ اس کی لہجہ، اس کی آنکھیں مجھے پوچھ پوچی
یاد دلانا رہا تھا۔ میں زیادہ دیر بیٹھنے کی نہ چاہنے لگی۔
پھر اپنی پی پائی ہونے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بھی گھبرا
گئیں اور ہم گھر چلے آئے۔

”مہتاب پریشان ہو رہا تھا۔
”میں تھوڑا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں
گی۔“

”مام آپ کو عاشر یاد رہی ہے نا؟“ اس نے
اچانک پوچھ لیا۔ میں اُسے دیکھتی رہی اور اشیات
میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ ہوتی تو۔۔۔۔۔“

”تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
”میں اُسے تھماری ذہن بنائی۔“ میرے کنبھ میں
دکھاتر آ گیا تھا۔

”یہ بات ہے تو انشاء اللہ ضرور بولے گی۔“
”اور ستارہ۔۔۔۔۔!“ میں بولی۔
”آپ سے زیادہ مجھے کبھی عزیز نہیں۔“

اس نے میری کوشش سرکھدی۔
”میری جان۔۔۔۔۔! میرے بچے۔۔۔۔۔!“ میں
ہلکی ہوئے لگی تھی۔

اگلی صبح بھی میں اسکول نہیں جا سکی اور مہتاب
بھی گھر پہنچا۔ لیا اکثر وہ تاج میری طبیعت ٹھیک
نہیں ہوتی تو وہ بھی چھٹی کر لیا اور سارا دن میری
خدمت کرنے اور میرا دل بہلانے میں لگا رہتا۔ طبیعت
سانا کر مجھے شہنااز رہتا۔ شام تک میری طبیعت کافی
بہتر ہو چکی تھی۔ مہتاب باہر گیا ہوا تھا تیل جیتنے پر

”اجما! آپ کا موڈ نہیں تو کیسٹل۔۔۔۔۔!“ اس کا
چہرہ بچھنے لگا۔
”نہیں! بات نہیں ہے۔“
”تو پھر چلے نا۔۔۔۔۔! وہ اسرار کرنے لگا۔
”ٹھیک ہے چلتا۔۔۔۔۔! چلو!“ میں نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

”جیو مام۔۔۔۔۔!“ اس نے نعرہ لگایا۔ اگیشن
میں چالی بھائی۔ راستے بھر وہ ستارہ کے بارے میں
بتاتا رہا اور میں سنی رہی۔

”ستارہ کے ابو فوت ہو چکے ہیں۔ وہ چار بہن
بھائی ہیں۔ یوں بہن منیج ہے۔ ایک چھوٹی بہن اور
بھائی ہے۔ مام گھر پر کپڑے وغیرہ بیٹنی ہیں۔“ ابھی

اس کی باتیں جاری تھیں کہ گاڑی ایک چھوٹے سے
کیٹ پر رکی۔ تاج میں نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی نئی
آبادی تھی۔ کچھ مکان بن رہے تھے، کچھ بے ہوئے

تھے آبادی بھی کم تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھی رہی۔
مہتاب نے تیل دی تو ایک نو عمر لڑکے نے گیٹ کھولا
اور مہتاب کو دیکھ کر کیٹ سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں

بھی گاڑی سے اتری اور مہتاب نے پھل وغیرہ اٹھا
لیے تو تک ستارہ بھی گیٹ پر آ گئی تھی اور میں اندر
لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھائی۔ باتوں کے دوران

یہ چلا کہ ستارہ کی امی اور بڑی بہن کبھی شادی کی
تقریب میں گئی ہوئی ہیں۔
”اگر یہ ہوتا تو لوگ آ رہے ہیں تو میں

انہیں روک لیتی۔“ ستارہ نے چستی آنکھوں کے
ساتھ مہتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا
رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں! بس اچانک ہی موڈ بن گیا۔
خیر! تمہاری امی سے پھر بھی مل لیں گے۔“ میں نے
کہا۔ اسی وقت ایک لڑکی جانے کی فرے تھاسے
داخل ہوئی۔

اٹھ جاتی تھیں۔ مہتاب انہیں لینے گیا تھا اور میں
بچانے بیٹھی تھی۔
انتظار کی کڑواں کشیں اور کار کرکٹ پر کی۔
میں کیٹ کی طرف بڑھی۔ کار میں سے مہتاب اور
ایک اٹھارہ بیس سال کی لڑکی اتری۔ وہی ستارہ
تھی۔

”ستارہ!۔۔۔۔۔! یہ میری مام ہیں۔“ مہتاب نے
تعارف کر لیا۔ وہ گرم چوٹی سے کی پھر ہم نے مل کر
چائے پی لیں۔ میری نظر میں تو اس کے چہرے سے

ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ مجھے ایک عجیب کشش
اُس میں محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد
میں بے چین رہی تھی۔

”مام۔۔۔۔۔! ستارہ کیسے لگی آپ کو؟“ مہتاب
نے مجھ سے پوچھا۔
”بہت ہی پیاری ہے۔“

”ادھر بیٹھی یہ مام۔۔۔۔۔!“ مہتاب مجھ سے لپٹ
گیا۔ میں نے بھی اُسے چوما۔

ایک شام گری اور جس بھی بہت تھا۔ میں کھڑی
سے لان کو دیکھ رہی تھی کہ مہتاب آ گیا۔
”مام۔۔۔۔۔! باہر چلنے ہیں۔ اُس کس کریم

کھانے کو بی جا رہا ہے۔“
”نہیں! تم جاؤ۔“ میں نے کسٹل دی سے کہا۔
ہم نے اُس کس کریم کھانی لاٹک ڈرائی کی تو موڈ

اور موسم دونوں تبدیل ہو گئے۔ خوشگوار سی ہوا چلنے لگی
تھی رات ہونے لگی۔ مہتاب نے پھل اور مٹھائی
لے کر گاڑی میں بیٹھی۔

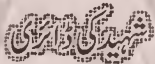
”اتنا کچھ تو کھالیا ہے یہ سب۔۔۔۔۔؟“ میں نے
حیرت سے پوچھا۔
”مام۔۔۔۔۔! ہم ستارہ کے گھر جا رہے ہیں۔“ اس

نے کہا۔ چہرے پر خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔
”لیکن اس طرح اچانک۔۔۔۔۔؟“ میں پچکائی۔

شہید کی کہانی

چار سون کا دفاع کر کے نئے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگذا سوچ

منزہ سہام مرزا



علامہ اقبال کی برداشت

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال نصیحت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر حق ایک دلگذا سلسلہ

بہت سارے دن گزر گئے امید آس کے درمیان..... اپنوں سے بچنے کے کادھ کیا ہوتا ہے کبھی نظر نہ آنے کا خوف کیا ہوتا ہے مجھ سے بڑھ کر کون کتنا سکھ ہے۔ ہاں یہ بھی بتا دے کہ میں بہت اچھی جگہ پر ہوں گریہ بھی تو جگ ہے کہ جن سے دور ہوا جن سے بچنا اوروں کی بہت پیارے تھے۔ میں نیلے آسمانوں سے جب انہیں اُلی اباد میں چیکے چیکے آسوا ہوتا دیکھتا تھا تو دل بہت دکھتا تھا۔ میری بیوی نے میرے جانے کے بعد کبھی نہیں پکڑے نہیں پہنے کالج کی چوڑیاں کبھی نہیں پہنیں مہندی سے انھوں پر گل بوئے نہیں بنائے۔ سارا دن سر پر سفید دپڑہ اوڑھے کمرے کے کاموں میں انجی روتی اور رات میں طحلی فاطمہ کو سینے سے لگا کر ہولے ہولے سکتی۔ کتنی عیدیں آئیں اور چلی گئیں پر اس کے سر سے وہ سفید اوڑھنی نہ ڈھٹی۔ میں تو بہت خوش ہوں بہت اچھی جگہ ہوں پر میری بیوی نے بہت سخت دقت کرا۔ رنگ خوشیاں اٹھیں جیسے تئیں سے اس کی لڑائی ہوئی تھی وہ بھی غلامی میں کسی ماں کے سر کا سائیں تھا اس کی ذہال اس کی چار دیواری سب کچھ تو میں تھا میں ہی نہیں رہا تو وہ بے چاری کیا کرئی؟ شہر میں جب ماں سے بٹے سنے اور جتوں کے لیے جتنا تباہ اس یک بخت کی آنکھیں جھللائے نکلیں۔ وہ بے بس تھی۔

ہم لوگوں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے زندہ ہوتے ہیں تب بھی گھر والوں سے دور اور جب واقعی میں دور ہو جاتے ہیں تب بھی گھر والے بھگتی بھگتی آنکھوں سے یاد کرتے ہیں بس ہم اپنے پیاروں کا نظارہ انتظار دیتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر تو میرا وطن تھا وطن کی خاطر جیلا اور وطن کی خاطر جی جان دی۔ میں خوش ہوں مطمئن ہوں فاطمہ بیٹی نے کمر میں خوش شہر شیلی اپنی ماں کا بہت خیال کرتا ہے۔

مشکل وقت گزر گیا لیکن مشکل وقت کہاں گزرا؟ 07 اپریل 2012ء کو ایک بار پھر کئی خاندانوں پر

طوفان تھا تو گلے گھوٹے ہوئے اور ٹوہیر میرے قدموں میں پھٹی معافاں مانگ رہی تھی۔

اس نے بتایا۔ ”چھو پھوٹے نہ جانے کب یہ پلان بنایا تھا..... وہ بھی نہیں کسم کسم ہمارے ہاں بہت چالاک ہوا اور وہ ہمیں بیٹے کی جدائی میں شریک بنی

ایک طرح وہ ہمیں بھی اولاد کے دکھ میں تو بٹایا جانتی تھیں اور یہ سب کچھ مجھے بھی نہ بتایا گیا۔ اگر بتا جیتی تو میں متباب کو توڑ کر ساتھ بھی نہ جیتی۔ ہم اتنی دور چلے گئے تھے کہ وہاں سے آنا مجھ اکیلی عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے بھی تو اپنے بیٹے کی جدائی کا بے بسی میں ہل پل رہی ہوں جانے میرا بیٹا کیا ہوگا؟ لیکن تمہارا دکھ میرے دکھ سے بڑا ہے۔ میرے پاس میری بیٹی سارا اور یہ عالم جو کہ میری کوکھ میں تھا بعد میں پیدا ہوا تمہاری پھوپھی فاطمہ کا غلاب سہہ کر چل گئیں۔ آخری دقت میں وہ تمہیں یاد کر کے اپنے کناہوں کی معافاں مانگتی رہی تھیں۔ ”ٹوہیر رو رہی تھی۔

”یہ رہا تمہارا بیٹا متباب!“ میں نے متباب کو اس کے سامنے کر دیا۔ ”توہیر نے یہ مجھے دے دیا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ بڑے کسم کسم ہے۔“

ساروں کی جدائی کا درد گلے گھوٹے دب آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہے تھے ہم سب رو رہے تھے کہ آنسوؤں میں دلوں کو دھونے کی طاقت ہے۔ یہ سن کر کوکھ کر دیتے ہیں اور آنکھیں صاف و شفاف ہو کر کسرائے نکلتی ہیں۔ میں نے سب کو دل سے معاف کر دیا تھا کیونکہ معافی میرے دل کی منت ہے۔ آگ کا لودیا بار کر کے مجھے آج اتنی خوشیاں ملی ہیں۔ آپ کو دکھ و غم کریں کہ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم رکھے۔ (آمین!)

ماں نے آ کر بتایا کہ ستارہ اور اس کی امی آئی ہیں۔ وہ چار لوگ ہیں۔

”ہائیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔“ ماں چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر واٹ روم کا رخ کیا۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی میں ساکت سی رہ گئی۔ سامنے صوفے پر بیٹھی عورت کو بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی؟ میں سال کی دھول پڑنے کے باوجود میں نے ٹوہیر کو پہچان لیا تھا اور وہ بھی مجھے دیکھتی کی دیکھتی رو کئی گئی پھر اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ وہ مجھے چوم رہی تھی۔ بچے حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ اس دوران متباب بھی آچکا تھا۔ میں نے جھنگے سے خود کو ٹوہیر سے چھڑایا۔ میں اُس وقت خضر اور اہل دونوں کیفیتوں سے دوچار تھی شاید میں کرنے کی گئی۔ متباب نے مجھے قہار صوفے پر بٹھایا۔ میری سر دھری کو ٹوہیر نے بھی جیسے محسوس کر لیا تھا اور وہ اب سر دھری سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میرا ذہن تو ساری ساری کناہوں پر تھا۔ کچھ سمجھنے آ رہا تھا کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں۔

ٹوہیر پھر اٹھی اور ستارہ کو میرے سامنے لاتے ہوئے بولی۔ ”یہ..... دیکھو..... یہ تمہاری بیٹی عائشہ ہے جسے میں نے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار دیا ہے۔ میں تمہاری بچہم ہوں مجھ سے بڑھ کر نہ ہو لیکن اپنی بیٹی کو تو سینے سے لگا لو۔“ میں نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے اندر جیسے یکدم کلا جوا لکھی ہو کر اٹھا اور میں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور دیاؤں کی طرح اسے پیار کرنے لگی۔ اب آنسو بہانے کی باری میری تھی۔

”میری بیٹی! میری عائشہ! میری جان.....!“ میں پکار کر رہی جب جذبات کا



آپ بیتی

یہ سچ بیتی سنانے والے آپ کے اور کارکردگیوں میں ہی موجود ہیں

نفسہ فضل



گیا وہاں ہی

مہناز بیٹ کا خیال

نہ خبر ہو دل یہ ہر ای رہے
ہیں ہی آنسوؤں کو پیا کرتے ہیں

اس غیب عورت کا قصہ جو اس جیسے مقدس رشتے کی توہین تھی



قیامت گزر گئی۔ 139 سپاہیوں برف کے نیچے زندہ دب گئے۔ اُن کے گھر والے امیدوار اس کے درمیان متعلق..... زندہ لوٹے تو غازی اور نہ لوٹے تو شہید گردل چیکے سے کہتا ہے کہ ”آ جاؤ! ابھی مت جاؤ چھوڑ کر زندگی کا سفر بہت طویل اور بہت کھٹن ہے۔ دھوپ بہت شدید سر کے سائیں میرے بابا دیر لاڈ لے بیٹے! ہمیں پتہ ہے تمہیں پاکستان سے بہت پیار ہے مگر ہمیں بھی تو تم سے پیار ہے آ نکلیں تمہیں دیکھنے کو توتری ہیں پھر پتہ نہیں چلتے وقت کیا کیا سوچا ہو گا؟ اُن کی آغوش چاہی ہوگی۔ باپ کے جھکے جھکے کانہ سے دروازے کی آڑ میں مٹی کی انگی قاسے کھڑا وہ لے ہو لے کا پتا جو زندگی سے بھر پور نہیں سب بہت یاد آئے ہوں گے۔ بچپن سے جوانی تک کاسٹریکٹوں میں رنگا ہوں کے سامنے سے گزرا ہو گا۔ اپنے بہت یاد آئے ہوں گے۔ لکھوں میں حضور نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو گا۔ چلتی آنکھوں اور دیکتی پیشانیوں نے استقبال کیا ہو گا۔ رضوان نے دروازہ کھولا ہو گا۔ برف سے نکل کر ٹہلی فرش پر قدم رکھے ہوں گے۔ ہر جانب پھول ہوں گے خوشبو ہوگی رنگ برنگی تھلیاں ہوں گی۔ دہاں سے زمین والوں پر تلاش کرنے والوں پر پیار بھری نظر ڈالی ہوگی۔ اُن کی محبت اور جذبے کو سراہا ہو گا۔ آساؤں سے آواز دی ہوگی۔ ”مت کرو اتنی محبت“ مت ڈھوٹو ہمیں۔ اس خون جمانی برف میں ہم تو وہاں ہیں جہاں جانے کی آرزو ہر مومن کرتا ہے۔ ہم تو زندہ ہیں ابلس تمہیں اب بھی نظر نہ آئیں گے کیونکہ ہم شہید ہیں اور شہید کی مراد نہیں کرتے۔

اپنی تلاش میں مصروف اپنے ساتھیوں پر پیار بھری نظر اُن کے اونچے درجوں کے لیے دُعا بھی کی ہوگی کیونکہ وہ شہید ہیں اُن کا رتبہ بہت بلند ہے وہ ہمیشہ اپنوں کے آس پاس ہی ہوں گے کیونکہ شہید مرا نہیں کرتے۔



میرے ابو اسلام آباد کے ایک بینک میں آفیسر تھے۔ ہم دو بہن بھائی تھے ایک چھوٹا بھائی سفیان دس سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اس کا بیٹا یانیز بڑا گیا تھا اب سب کی توجہ کارکنز میں اور میرا بھائی یان تھے۔ امی اکثر سفیان کو یاد کر کے روتی تھیں۔ سفیان بہت ذہین اور خوبصورت تھا۔ خوبصورت تو ہم دونوں بہن بھائی بھی تھے اور خوبصورتی کے معاملے میں اپنی امی اور ابو پر بھی تھے۔ جب امی سفیان کی یاد میں بہت اداں ہوتی تھیں تو ابو کہتے۔ ”راشدہ.....! تم کوئی کورس کر لو اس طرح تمہارا دل بھل جائے گا۔“

ابو کے بار بار اسرار پر امی نے یونیشن کا کورس کر لیا۔ امی طرح کی پریس کر لگے۔

میں تو زیادہ ایئر میں تھی اور ایمان فرسٹ ایئر میں جب ابو کا بینک بینک میں ہی ہارٹ ایک ہوا تھا۔ بینک والے انہیں اسپتال لے کر گئے۔ امی کو کون پر اطلاع کی مگر ہمارے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ابو اپنے خاں ختی سے جا ملے تھے۔ ابو کی چاک سموت سے ہم پر تو کویا قیمت ہی ٹوٹ پڑی تھی ہمیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ ہر کس طرح کھ رہا ہیں آئے؟ تھوڑی دیر میں باپا ابوبکر اور دیگر عزیز و اقارب سے گھر بھر چکا تھا۔ امی کو غش پر غش آ رہے تھے اور ایمان کا بھی رور کورہا حال تھا۔ ایک طرف چاک تک امی اپنے اتنے چاہتے والے ابو کے چھڑنے کا صدمہ دوسری طرف ایمان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ صبر کے وقت ابو کی میت سفر آخرت کے لیے لے جانی گئی تھی توں تباہ ابو کے گلے لگ کر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ایک کاندھے سے ایمان لگا کھڑا تھا۔ بے شکل مجھے اور ایمان کو تباہ ابو سے الگ کیا گیا۔

”ایمان بیٹا.....! اپنے ابو کو ان کی آخری آرام گاہ لے کر جانا ہے چلو۔“

یہ کہہ کر تباہ ابو ایمان کو سنبھالے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد ہم پر کیا کڑی پائی ایک الگ کہانی ہے۔ ابابو کا فرسٹر لاہور ہو گیا۔ ابو کے فنڈز دوسرے کے سلسلہ میں ان کے ایک کوٹنگ شاہ زیب انگل نے کافی بدو جھڑکی ہمارا بہت ساتھ دیا۔

وہ امی سے کہتے۔ ”بھائی! میرے ہوتے ہوئے آپ کو اور بچوں کو کسی قسم کی فکر نہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ سبزی گوشت پھل وغیرہ تک لا کر دیتے۔ چھٹی کے دن وہ سامان سے ملے بعدے معی آ جاتے۔ سارا دن ہمارے ساتھ گزارتے۔ اس دن تنہی ڈشز بنی تھیں۔ اکثر وہ ہمیں گاڑی میں تھامنے بھی لے جاتے۔ میں یانیز ایمان زیادہ اداں ہوتے تو کچھ بچہ دکھا لاتے۔ اس دوران میرا ریکیویشن کھلیٹ ہو چکا تھا۔ میں تاریخ بھی اور گھر میں رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو گش اپنے کمرے سے باہر آئی تو امی کے بیڈ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ ایمان تو لاہور گیا ہوا ہے پھر امی کس سے باتیں کر رہی ہیں؟ یہ سوچ کر میں نے امی کے کمرے کا دروازہ دھکیلتی سے ذرا سا کھولا تو چکر اور دھکیلی میری پیداری امی جاہلو سے بے پناہ محبت کرتی تھیں ان کی یاد میں راتوں کو اٹھ کر دھکیلی تھیں شاہ زیب انگل کے سینے سے لگی بیٹی تھیں۔ میں نے دروازے کو امی طرح غیر محسوس طور پر بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شام تک جب میں آکر کمرے سے باہر نہیں نکل سکی تو امی خود ہی کمرے میں چلی آئیں۔

”مغزوہ! کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے امی کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر معصومت اور محبت تھی ہونے لگی۔ امی نے مسکراتے ہوئے میرے چہرے پر آنکھ لٹو کر ہٹا کر بیٹھائی پر بوسہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر باہر لانے میں آئیں۔ میز

پر چائے اور دو گلاؤں زامات رکھے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے امی بولیں۔

”مغزوہ.....! یہ شامی کباب تو گرم گرم ہیں یہ براؤنیز میں سے تمہارے لیے بنائی ہیں۔“ ”نہیں..... میرا دل کی چیز کو نہیں کر رہا۔“ یہ کہہ کر میں نے خاموشی سے چائے کی اور سر درد کا بیانہ کر کے اپنے کمرے میں داخل آ کر لیٹ گئی۔ داغ ابھرا ہوا تھا۔ میری سین و دھنیں باں چوڑے شوہری محبت کا دم بھرتی تھیں آتی جلد انہیں بھول گئی تھیں۔

اس دن کے بعد بھی امی مرتبہ میں نے شاہ زیب انگل اور ایمان یا کو امی طرح تنہائی میں دیکھا مگر میں کچھ نہ کہہ پائی۔

ایک دن امی نے مجھے اپنے کمرے سے بلایا اور بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھا کر بولیں۔ ”مغزوہ.....! میری جان.....! میں نے تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور چاہتی ہوں کہ اس شخص سے جلد سبکدوش ہو جاؤں۔ شاہ زیب ایک اچھا اور نیک لڑکا ہے یہاں اس کا کوئی نہیں ہے ایک بھائی لاہور میں ہے والدین حیات نہیں ہیں ایک بہن اور بھائی امریکہ میں سین لائیں۔“

شاہ زیب کا نام سن کر ہی میرے داغ میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں؟ کتنی مرتبہ میں امی کو شاہ زیب کے ساتھ تھا کتنی اعتراض حالت میں دیکھ چکی تھی۔

”امی.....! میں شادی کرنا نہیں چاہتی؟ میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے اپنا قصہ ضبط کرتے ہوئے نالے والے انداز میں کہا۔

”بیٹا! میں چاہتی ہوں تم جلد اپنے کمرے ہو جاؤ۔“ امی نے اسرار کرتے ہوئے کہا پھر میرے لاٹھ کمرے کے باہر جانی سے میری شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُن دنوں مگر میں شاہ زیب کی آمد و رفت بھی کسی

ہونے لگی تھی۔ میں اپنی ماں کی چال اچھی طرح سمجھ رہی تھی وہ جہان بچوں کی ماں تھیں اس لیے شاہ زیب سے دوسری شادی کرتے ہوئے چھپا کر میں چنانچہ میری شادی شاہ زیب سے کر کے ان کا جائز فیصلہ برقرار رہا تھا۔ کتنا میرے بڑا مزاح کرنے کے باوجود امی نے میری شادی کی تاریخ طے کر دی شاید میں بد دل تھی کہ اپنی ماں سے یہ نہ کہہ سکی کہ مجھے آپ کے اور شاہ زیب کے تعلقات کا علم ہے۔ میں کتنی ہی پرہیزگار شاہ زیب کے ساتھ رہنے لگا رہا اس نئے دیکھ چکی ہوں۔

وہ دن بھی آ گیا جب مجھے میری مرضی کے خلاف شاہ زیب کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اپنی شادی پر لڑائیں کتنی خوش ہوتی ہیں، پہلی رات کا تصور ہی انہیں لگدھڑاتا ہے مگر میں..... میں تو انکا درد چ لوٹ رہی تھی۔ دو دن میرے لیے انتہائی تکلیف و قحط جب شاہ زیب خوبصورت شہزادے میں لبس کسی شہزادے کی طرح چلتا ہوا چلتا عروسی میں داخل ہوا اور میز پر آکر بیٹھ گیا۔ اگر شاہ زیب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں بھی سٹ سکڑ کر دیہوں کی طرح شر پالیا کر بیٹھی ہوتی کمرے میرے دل میں انگلیوں کی بجائے نفرت بھری ہوئی جو میرے سینے کو دھکا کر رہی تھی

اور جب شاہ زیب نے میری طرف بڑی محبت بات نظروں سے دیکھتے ہوئے پچھا کر مغزوہ.....! تم تو خوش ہو نا اس شادی سے؟ جب میں پٹ پڑی تھی۔ ”خوش.....؟ یہ شادی میری ماں سے میری مرضی کے خلاف کی ہے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شاید نفرت..... میں جانتی ہوں میری ماں اور تم کیا کھیل کر نہیں چاہتی۔ میری ماں نے تم سے تعلق قائم رکھنے کے لیے مجھے سولی پر چڑھایا ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ شاہ زیب حیران حیران سا بیٹھ دیکھے جارہا تھا اس کے پاس کہنے کو کیا الفاظ ہی نہیں تھے۔ میں



انکس میں ہی شہنشاہی ہے

عاشق وکیل راؤ کا خیال
یہاں آتے ہیں سب موسم گرہ لوٹ جاتے ہیں
تمہاری یاد کا موسم پڑتا بھول جاتا ہے

ایسے عاشرے کی کہانی چس آن بھی عورت رسوں اور لہجوں کی حیرت چڑھائی جاتی ہے

میراثہ امرا سے اعلیٰ خان ہے۔ میں عمر سے دروازے
لندن میں مقیم ہوں۔ خوبصورت بیوی اور ایک بیٹا
ہے۔ گھر کا ڈیڑھ ایک بیٹلس کیا نہیں ہے جو میرے
پاس نہ ہو مگر ایک کی سی ہے جو میری روح سے لپٹی
ہے ایک درد دل میں بسا ہے میری کی غلط جیسے کسی
بل صحن میں لیسے نہیں دیتی۔



ہوئی نہیں ہیں۔ پولیس آئی اور ان دونوں کو تھانے لے
گئی۔ ان پر حدود آؤ بیٹلس کا کیس تھا۔ کسی طرح شاہ
زیب کے بڑے بھائی کو اس بارے میں پتہ چل گیا۔
انہوں نے حنا کے کرائی بیوی رسوائی ہوئی پھر انہوں نے
کانی برا بھلا کہہ کر انہیں نکاح کرنے کے لیے کہا مگر
نجانے ان دونوں نے کیا سوچ رکھا تھا کہ نکاح نہیں
کیا۔ اس طرح یہ غمخیز کی زندگی گزارتے رہے۔

مدد دے آتے تو میں میڈیا پر ماں کے حوالے
سے لوگوں کے تڑاوت تھی اور میری ہوں تو دل کٹ
رہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی کی ماں ہیں اور ایک بیری
ماں ہے جس نے اپنی عیاشیوں کے لیے لاپٹی بیٹی کی
زندگی راؤ پر لگادی۔ اس نے میری زندگی میں زہر مگر
کے رکھ دیا ہے ماں کہتے ہوئے عیاشی شرم آتی ہے۔
کاش ہمارے ابو کی بجائے ای کی موت آ جاتی۔
آج لوگوں کی باتیں تو نہ سنتا پڑتوں۔ قارئین! تعین
کر رہی ہیں نے تو گھر سے نکلتا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب
کون شریف انسان مجھ سے شادی کرے گا؟ ابھی کچھ
دوں پہلے لیان نے بھی اتفاقاً شاہ زیب کے خاندان
کی لڑکی بھوکا کوٹ میرج کر لی۔ شاید اس نے ایسا
کر کے اپنے اندر کی آگ بجھائی مگر میں ایک کمزور
لڑکی رونے اور کڑھنے کے سوا کیا کر سکتی ہوں؟ آپ
سب سے اتنا س ہے میرے لیے دعا کریں اللہ
پاک مجھے بھی خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین!)

یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی آئی کارشن مگر میں
روڈ ایکسٹنشن میں انتقال ہو گیا تو شاہ زیب نے بھی
شادی کر لی۔ شادی کے تین سال قبل وہ تہہ تیغ ہو گیا۔
پھر اچانک ہی اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے کڑے
چھ ماہ تک ہی شاہ زیب ایک رات جو سویا تو صبح دیکھا
اسے نصیب ہی نہیں ہوئی۔ جب اسے موت آئی تو
کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں تھا وہ
سکسک کر مر گیا۔ موت کا ٹھکانہ تھا۔

یہ غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی اسی
وقت طلاق چاہیے طلاق.....“ اور میں چوڑے پاس
کاغذ تلے کر بیٹھی تھی اس سے طلاق لکھوا کر ہی دم
لیا۔ شاہ زیب کسی بارے ہوئے جواری کی طرح
بیروں سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے
دروازہ لاک کیا اور اطمینان سے سو گئی۔
صبح جب اسی وغیرہ آئیں تو میں اُن کے سامنے
بھی بیٹھ پڑی۔ ”آپ نے اپنی ماں کو مار کر لی ناں
میں نے بھی اپنی سرخس کر لی۔ یہ دیکھیں سلطان نامہ.....“
اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیان کو
جب تمام صورت حال معلوم ہوئی تو وہ مجھے گلے
لگا کر بہت رو دیا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ میں گھر چھ
کر لاہور چلے جاتے ہیں۔ اسی تو کچھ پتھر پر راضی
تھی نہیں تھیں مگر لیان نے ان سے منوا کر ہی دم لیا۔
پندرہ دن کے اندر ان تمام وہ گھر چھ کر لاہور آ گئے۔
یہاں ہم نے ٹھکانہ راوی میں گھر خریدا تھا۔

لیان نے اسی کو دلا لاکھ روپے دے دیے ہوئے کہا
تھا۔ ”اے! ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے“ آپ تو
بیوی و شاعر بیوی ہیں آپ نے ابو کے ساتھ تو بے
وفائی کی بھی اپنی بیٹی کی بھی نہ چھوڑا؟ شاہ زیب تو
غیر موافق تھا۔ آپ تو ماں ہیں آپ کو ذرا لاج نہ آتی؟“
اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ بول سکیں۔
کچھ عرصے بعد لیان نے ہمارے گھر سے ذرا دور
مکان کرانے پر لے لیا۔ تھوڑے ہی دن بعد شاہ زیب
بھی اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو گیا اور اسی کے ساتھ
اسی گھر میں رہنے لگا۔ لیان نے ان دونوں لاکھ روپوں سے شاہ
زیب کو ایک چھوٹی سی دکان کرا دی۔ ایک ہی کھلے میں
رہنے کی جگہ سے اسی کی ہر بات کی خبر نہیں ہوتی
تھی۔ نجانے کس طرح لوگوں کو علم ہو گیا کرا دی اور شاہ
زیب میاں بیوی نہیں ہیں۔ میں کسی نے تھانے میں
الطاف کر دی کہ نکاح میں جو لوگ رہتے ہیں وہ میاں



سوال

فاسلے گمانے کو

راستے دکھانے کو

تیر کی مٹانے کو

اپنے اچھے سے

کب دے جلاؤ گے؟

ر ر ر ر ر ظریف احسن

بھی آنا بند ہو گئے تھے۔ نجانے کیا وجہ تھی، مہر و بدل گئی تھی، یہ ممکن نہیں تھا مگر ایسا کیا ہوا تھا جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ سب سے لڑ کر میں اپنے کمرے میں آیا اور فریض ہو کر بستر پر دراز ہو گیا اور مہر و بارے میں سوچے ہوئے نیند کی وادی میں اتر گیا۔ شام میں آنکھ کھلی تو خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اب سڑکی اتھان کا پھر میری تلاش غالب آ گئی تھی۔ ایک بار میرا آنا مہر و کے کمرے میں اور انشاء کو ایکے پاس لے گیا اور مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دیکھ کر نظر نہ اٹائی۔ سہرے بہت پوچھا تو اس نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

میری ناراضگی پر اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”چند ماہ پہلے مہر و کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چھوٹ چھوٹ کر رو دی۔ اپنی بیٹی کے دکھنے لہو کو میری بڑ حال کر رہا تھا۔ میں بے یقینی کے انداز میں نو کو دیکھتا رہا۔

”..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ میں بڑ بولا۔
”حقیقت ہے۔“ تو نے جواب دیا۔
”آغا جان ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ میں نے

وہ ان سے بہت مالوس ہو گئی تھی۔ آغا جانی کے باروا سلوک کے باعث مہر انشاء نے آغا جانی سے دور رہنے میں عافیت جانی تھی۔ نور بہت چھوٹی تھی اسی لیے اسے ابھی ان باتوں کا شعور نہیں تھا۔

میں باہمی کی بھولیں بھیلوں میں کھویا ہوا تھا کہ ٹیکسی ایک جھگڑے سے رک گئی تھی۔ میں نے چوکر کر نظر اٹھائی تو حویلی کو سامنے پایا تھا۔ میں فوراً حویلی میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ہمارے بے برسوں پرانے ملازم کریم بابا نظر آ گئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ہنسنے لگے۔ اس طرف بڑھے۔ اس طویل عرصے کے دوران کریم بابا حریہ بوڑھے ہو گئے تھے۔ مجھے اچانک یاد ہو کر حیران بھی ہوئے اور خوش

بھی پھر وہ میرا سامان لانے کے لیے باہر کی جانب بڑھ گئے۔ سب سے ملاقات کے دوران میری نظریں مہر انشاء کو ڈھونڈتی رہی تھیں۔ نور بھی اب بڑی ہو گئی تھی۔ 15 سال دور نے بھی ماں کے نہیں نقش چرائے تھے۔ کوہر کوہر کی نسبت نور بہت خوبصورت تھی کمرے سے دل کو مہر و ہی لگتی تھی۔

میں نے فیروزہ علیا سے مہر و کے متعلق پوچھا تو وہ ٹال گئے اور انہوں نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔ نور بھی خاموش خاموش ہی لگ رہی تھی۔ حویلی کی فضا میں ایک خاموش قسم کی سوکاوٹ محسوس کیا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ گل جیتا بیجی جہاں میرے آنے پر خوش نظر آ رہی تھیں وہ جہاں ان کے چہرے پر دکھ کے سائے واضح لڑ رہے تھے۔ وزینہ پھوپھو کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جس قید تہائی کے عفریت نے انہیں اور ان کے خدایوں کو لٹکایا تھا۔ دو سال قبل وزینہ پھوپھو نے اس عالم ساج سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ان کی وفات کی خبر بھی مجھے مہر و کے خطوط کے ذریعے لی تھی مگر پچھلے چند ماہ سے مہر و کے خطوط

کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہوتے دی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کو ان سے خاص قسم کی انسیت تھی۔ ان کی بڑی بیٹی مہر انشاء اور ہم دونوں بھائیوں کا بچپن ساتھ گزارا تھا۔ نور انشاء اور وقت بہت چھوٹی تھی۔ مہر و خاص شوق اور ہنس لگتی تھی۔ میں اور فیروزہ علیا جب بھی شہر سے آتے تو ان دونوں کے لیے ڈبھروں چیزیں لاتے تھے جنہیں باکر مہر و کی آنکھیں چپک اٹھتی تھیں۔ مجھے اس کی آنکھوں کے یہ جنونہ عزیمتیں بڑے گرتے وقت کے ساتھ ساتھ مجھے مہر و سے خاص الفت ہو گئی تھی اور میری محبت کا علم وقت کے ساتھ ساتھ فیروزہ علیا کے علاوہ وزینہ پھوپھو کو بھی ہو گیا تھا۔

وزینہ پھوپھو ہماری حویلی کا سنجیدہ بلکہ الیہ کردار تھیں۔ انہیں ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں یوں لگتیں جیسے حویلی میں کوئی روح ہینک رہی ہو۔ ان کے ساتھ ہونے والے ظلم نے انہیں بہت خاموش سا کر دیا تھا۔ آغا جانی نے جہاں حویلی کی اور فیروزہ و رسوں کو پروردان پڑھایا تھا وہیں قرآن پاک سے نکاح جیسی صحیح رسم میں ان میں سے ایک تھی۔

ان کے مطابق خاندان کی لڑکیاں باہر نہیں بیایا جاتی تھیں اور اگر خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا تو اس کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا جاتا تھا۔ وزینہ پھوپھو اس رسم کی پیچیت پڑھ گئی تھیں۔ وہ دل جس میں جیسے کی اسٹنگ تھی جو ہواؤں اور گھاٹوں کے سنگ کا تھا تھا اسے قید تہائی میں ڈال دیا گیا۔

میری اور مہر انشاء کی محبت دیکھ کر وہ ذرا مسکراتیں اور پھر ان کے چہرے پر دکھ و ملال کے رنگ بکھر جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں ہوتا دکھتا تھا۔ مہر انشاء تو اکثر ان کے کمرے میں دکھائی دیتی تھی۔

اپنے آنے کی اطلاع بھی انہیں نہیں دی تھی۔ خوشی کے مارے میرا دل چاہ رہا تھا کہ پریکس اور میں اڑتا ہوا اس وسیع و عریض رہنے پر کھلی شامدار حویلی پہنچ جاؤں جہاں میرے پیارے رہنے ہیں۔ آغا جانی پرینہ پھوپھو نے فرمایا۔ ”ان کی بیوی بھائی شہ پارہ اور ان کا کینٹ سا پینا مسجد اگل جیتا چچی اور ان کی دونوں بیٹیاں مہر انشاء اور نور انشاء!“

چھوٹے چچا خان امزلی خان نے آغا جانی کی مخالفت کے باوجود گل جیتا چچی سے شادی کی تھی جو خاندان سے باہر کی تھیں۔ بیٹے کے اس تصور پر آغا جانی نے انہیں بھی مخالف نہیں کیا تھا۔ دو سال قبل چچا اپنے انتقال سے پہلے اپنی بیوی گل جیتا چچی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو حویلی لے آئے تھے۔

چچا نے فیروزہ خاندانی رسوں اور دو قہنوں سے بدعات ترک کر کے گل جیتا سے شادی کی تھی اور میرے خیال میں اس میں کوئی برائی نہیں تھی مگر آغا جانی انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے وہ اپنی خاندانی رسوں کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ میرے اور آغا جانی کے درمیان یہی اختلاف تھا جس کی وجہ سے باپ جیتا ہونے کے باوجود ہم دینی طور پر ہمیشہ دور رہے۔

گل جیتا چچی کو امرت چچی کی وفات کے بعد حویلی میں جگہ تو کسی بھی عمر گروں میں بدل گئی۔ ان کی اپنائیت، سکھ پڑھانے اور لٹریچر کے باوجود وہ حویلی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکیں۔ یہ مال ان کے چہرے پر بہت جلد رہتا تھا مگر انہوں نے مہر انشاء اور نور انشاء کی پرورش کی خاطر یہ قبول کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو آخر وہ دونوں میں تو آغا جانی کا خون۔

لی لی جان کی وفات کے بعد مجھے اور فیروزہ علیا کو گل جیتا چچی نے ہی سنبھالا اور انہوں نے ہمیں

سو چاہر میں نے زور دینا چو پھو کے کمرے کی طرف
قدم بڑھا دیئے۔ دسک دینے بغیر میں اندر داخل
ہو گیا۔ کمرے میں سفید لباس میں لبڑی مہر و نظر
آئی۔

”مگر.....“ وہ ہر وہ نہیں تھی جسے میں چھوڑ
گیا تھا۔ یہ تو کوئی بھٹی ہوئی روح تھی یا پھر زریزہ
چو پھو کی روح تھی جو مہر و کے اندر داخل ہو گئی تھی۔
میں بے دانی سے مہر و کی طرف بڑھا۔ مہر و نے مجھے
بڑے دیکر کرخ موزا لیا تھا۔

”مہر و؟ یہ سب کیا ہو گیا؟“ میں نے تڑپ کر
پوچھا۔
”جی میری تقدیر تھی.....“ اس کا لہجہ سہا تھا
مگر میں اس کے کرب کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔
”تجسّس نہیں کیے ظلم ہے.....“ میں چلا یا۔
”کچھ بھی کہہ لیں اب یہی میرا نصیب ہے۔“

وہ پھر اسی انداز میں بولی۔
”میں تجسّس زندہ درگوش نہیں ہونے دوں گا۔“
”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے اسٹریٹ میں چاہتی
کہ میری وجہ سے کوئی فساد ہو۔“
”یہ ظلم ہے مہر و.....“ میں نے بے بسی سے
کہا۔

”اسٹریٹ واپس لوٹ جاؤ۔“
”میں تجسّس ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ میں نے
اٹل لہجہ میں کہا۔ مہر و نے میری طرف دیکھا۔ اس
کی نظروں میں دھکے کا سندھو ٹھیکس بار بار تھا۔ اس کی
آنکھوں کے وہ چنگو جو مجھے بہت عزیز تھے اب مجھ
سے کیے تھے۔ اس کی حالت پر میرا دل دکھ سے بھر گیا
تھا۔ وہ شرخ کی مہر و جا نے کہاں گم ہو گئی تھی۔ سناج
کے ظالم اصولوں نے زور دینا چو پھو کے بعد اب مہر و
کو بھی نکل پایا تھا۔

”میں نہیں نہیں جاؤں گی۔“ مہر و نے تھی لہجہ

میں کہا۔ میں جانتا تھا مہر و اپنے فیصلے سے ٹس سے
مس نہیں ہوگی۔

”میں آقا جان کے اصولوں سے ٹکرانے کا
حوصلہ نہیں رکھتی۔“ مہر و نے مسکاتے ہوئے کہا۔

”ان سے میں بات کروں گا۔“ میں نے اسے
حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”کوئی فائدہ نہیں اسٹریٹ چلے جاؤ یہاں
سے۔“ وہ دکھ سے چلائی۔ میں نے کرب کی شدت
سے آنکھیں بند کر لیں اور واپسی کے لیے قدم بڑھا
دیئے۔

”مظہر دس.....“ اس کی آواز بر میں مڑا۔ ”مجھ پر
ایک احسان کرتے جاؤ۔“ اس کی آنکھوں میں التجا
تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا
تھا۔

”نور کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“
”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس سے شادی کر لو۔“ اس نے اپنی ٹھیک
بات یوں آسانی سے کہہ دی تھی۔ ”میں نہیں چاہتی
میرے بعد میری بہن اس کمرے کو آباد کرے۔
میرے لیے اب کچھ نہیں بچا۔ میں تمہارا ساتھ نہیں
دے سکتی مگر ذرا دیر کے لیے یہاں ہی رہنے دوں گی۔“

کب وقت کے ظالم ہاتھ اسے بھی میری طرح محروم
کر دیں پیلز اسٹریٹ میری خاطر اس محبت کی خاطر جو
تجسّس مجھ سے تھی، نور کو قبول کر لو۔“ مہر و نے
امید بھری نگاہوں سے مجھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں
کوئی جواب دینے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

آقا جان شہر سے واپس آ چکے تھے تو کہیں اندر
سے دکی تھا اور اس کے ذمہ دار بھی آقا جان تھے مگر
ان سے ملنا ضروری تھا۔ میں ان کے کمرے میں
داخل ہوا۔ آقا جان نے مجھ سے دیکھا اور محبت سے
گلے لگایا پھر میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

”آقا جان! آپ سے ایک ضروری بات کرنی
ہے؟“ میں نے تمام حوصلہ جمع کر کے کہا۔

”بولو۔“ انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔
”آپ نے مہر و کے ساتھ چاہیں نہیں کیا۔“ میں

نے مذکور طریقے سے شکوہ کیا۔
”اب تم مجھے سمجھاؤ کہ کیا اچھا ہے اور کیا
برا؟“ وہ غصہ ناک لہجہ میں بولے۔

”آقا جان! ظلم ہے۔“
”یہ کوئی کس اصول ہیں اور تم ان سے نیکو کرنا تو
بہتر ہے۔“ انہوں نے اٹھ کر انداز میں کہا۔

کچھ دیر یوں خاموش رہی پھر میں نے ہمت
کی۔ ”آقا جان! میں نور کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا
ہوں۔“ آقا جان نے حیرت سے میری طرف دیکھا
تھا۔ ”میرا مطلب ہے میں اس سے شادی کر کے
اسے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ آقا جان برہم ہو گئے۔ ”تم
حد سے بڑھ رہے ہو اسٹریٹ۔“

”پیلز آقا جان! مہر و کے بعد نور کے ساتھ یہ ظلم
مت کرنا۔ آپ آخر کب تک کل جیتا چھٹی کے
خانان سے باہر ہونے کے تصور کو حائف نہیں کریں
گے؟ اس میں مہر و اور نور کا کیا قصور ہے کہ آپ اپنے
بے بنے کے لیے ان کا انتخاب نہیں کر سکتے؟ اگر خانان
کی لڑکیاں خانان سے باہر نہیں دی جاسکتی تو یہ کہاں
کا انصاف ہے کہ ان کے ساتھ یہ ظلم کیا جائے؟
قرآن پاک سے نکاح کرنا؟ کیا اسلام اس کی
اجازت دیتا ہے؟“ میں نے انہیں اپنی دلیلوں سے
تاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم ہمارے خانانہ اصولوں سے بغاوت کر
رہے ہو؟“ آقا جان دھماکے سے تھے۔

”کتنی ہی حائف آقا جان! تم کہیں نے نور کو اس
قید سے آزاد کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے

اٹل انداز میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں اس صورت میں
میرا آپ سے اس حوصلے سے کوئی رشتہ بنا نہیں رہے
گا۔“ میری بات پر آقا جان خاموش رہے تھے اور

میں بھی ان کا جواب سے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔
حوصلے سے رخصت ہوتے ہوئے فیروز بیگ نے

گلے لگ کر میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ گلے بچنے کے
چہرے پر اظہارِ فکر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ میرے

لیے یہی کافی تھا اور پھر صرف محبت کو پا لینے سے تو
محبت کی جیت نہیں ہوتی۔

مہر و انشاء کو دیکھنے یا اس سے ملنے کی مجھ میں
ہمت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا وہ میری احسان مند
ہو گی کہ یہ احسان نہیں تھا۔ تلافی بھی جو آقا جان
کے ظلم کے جواب میں مجھے نور کو اپنا کر کرنی پڑی تھی
پھر میں نور کو لے کر لندن آ گیا تھا۔

.....

اب اس بات کو بھی دس برس ہو گئے ہیں۔
ہمارے آنے کے کچھ عرصے بعد گل جیتا چھٹی نے بھی
اس جہاں سے ناٹھ ڈال دیا تھا۔ دو سال تک مہر و انشاء
بھی یہ جہاں چھوڑ کر گئی۔ مہر و انشاء نہیں ہے مگر
مجھے دل میں وہ ہمیشہ زنده رہے گی۔ میرے دل
میں بار بار مجھے مہر و انشاء کو کھلانے نہیں دیتا۔

نور بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ وہ مجھ
سے بہت محبت کرتی ہے اور میری احسان مند ہوتی
ہے۔ عموں کے فرق کے باوجود ہم نے کامیاب
زندگی گزارنے سے کچھ دور سے کوئی شکایت نہیں
سوائے اس کے کہ وہ نور انشاء سے مہر و انشاء نہیں۔

آپ کو شاید میرے درد کی بخوبی سمجھ آگئی ہوگی
کہ میں مہر و کے لیے چکھ نہ کر سکا۔ اسے ظلم سے
نجات نہ دلا سکا۔ شاید میں بد دل تھا۔ یہ سوچ
میرے سن میں ایک عرصے کی صورت ہمیشہ وقتی
ہے۔

سبیں غزالہ ہاں

صراطِ مستقیم

حیرا رات کا خیال

کتنے فریب اور کتنے دم کے کتنی باتیں، کتنے دم سے
سب کو اپنی گود میں دقت اگر چہ ہوتا ہے

ایک برلمان عورت کا قصہ اسے بروقت راستہ مستقیم مل گئی تھی

”آپ کے اوپر کالا جادو کر دیا گیا ہے اس کا
اتار کر واپس لے گا۔“

”جادو؟۔۔۔ مگر عامل صاحب میری تو کسی
سے کوئی دشمنی نہیں ہے مجھ پر کون جادو کر دیا ہو سکتا ہے؟
وہ بھی کالا جادو؟۔۔۔“ مسرتو قیر نے پریشان ہوئے
ہوئے عامل شاہ مراد بابا سے پوچھا۔

”میرا علم تو یہ ہی بتا رہا ہے کہ آپ کے اوپر
بہت ہی خطرناک قسم کا جادو کیا گیا ہے اسی کی وجہ
سے آپ کے کالوں میں بلا جواز رکاوٹ پیدا ہو
رہی ہے آپ کے کام بننے سے بگڑ جاتے ہیں مگر
میں بے برکتی سے اولاد نا فرمان ہو رہی ہے شوہر
اسے ان بن رہے گی ہے فرخ میں شگنی ہو رہی ہے
حالانکہ پیسہ بہت ہے۔۔۔“ عامل صاحب کی زبان
اپنے چل رہی تھی جیسے ٹپ ریکارڈنگ مشین ان کو ریکارڈ
کیا ہو۔ مسرتو قیر یہ سب سن کر بہت گھبرا گئی تھیں۔

واقعی اُن کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔

”مگر جادو۔۔۔ کر دیا کس نے ہے؟ آپ یہ بتا
سکتے ہیں؟“ مسرتو قیر نے پوچھا تھا۔

”جہیں۔۔۔ سی۔۔۔ نہیں۔۔۔ بتانے کی
اجازت نہیں ہے ہم آپ کو نام نہیں بتا سکتے اس میں
بہتری ہے۔“ عامل صاحب نے دھوک جواب دیا تھا۔
”مگر عامل صاحب مجھے یہ معلوم تو ہونا چاہیے
کہ میرا دشمن کون ہے؟ وہ ہو سکتا ہے وہ بظاہر میرا
دوست بن کر مجھے نقصان پہنچا رہا ہو؟“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اس کی
اجازت نہیں، ہم صرف دشمن کی نشاندہی کر سکتے ہیں
دشمن کا نام نہیں بتا سکتے۔ اس طرح دشمنی بلا وجہ اور
بڑھ سکتی۔“

”جو کوئی بھی میرا دشمن بن گیا ہے بلا وجہ کی دشمنی
کر رہا ہے کیونکہ میرے تو کسی سے بھی تعلقات



بات ہے۔“ عامل صاحب نے بڑی خوبصورتی سے
بڑے خفیہ معاوضے کا مطالبہ کر دیا تھا۔

مسرتو قیر کو یہ تو معلوم تھا کہ تعلیمات میں مختلف
بخوات کا استعمال ضروری ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم
تھا کہ منگ و دیگر کی قیمت آسان پر مٹی اور وہ یہ بھی
جانتی تھیں کہ مٹکلات کو بلانے کے لیے اُن کا
استعمال ضروری ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ
مٹکلات کو کس میں کرنا کرنا کرنا کی بات نہیں۔
یہاں تو ہر دوسرا آدمی ان کو بلانے کا ہتھکڑی
کرنے کا دعوئی کرتا نظر آتا ہے۔ تقریباً روزانہ ہی
اخبارات میں ایسے اشتہارات پر نظر ان کی بھی پڑتی
تھیں جس میں اس طرح کے دعوے ہوتے تھے۔

’ہر کام مٹکلات کے ذریعے ملے گا۔۔۔‘
’جو چاہیں سو پائیں۔۔۔‘
’ایک رات کے خاص عمل سے مٹکلات کے
ذریعے ہر کام کرادیں۔۔۔‘

’لوہ نہیں ہیں۔ پلیز‘ آپ مجھے نام بتادیں میں
اس سے کچھ بھی نہیں کہوں گی بلکہ کسی کو بھی کچھ نہیں
بتاؤں گی نہ لڑائی جھگڑا کروں گی، میں اس سے
’لوہ‘ ہو جاؤں گی۔“ مسرتو قیر نے بڑی لجاجت سے
درخواست کی تھی۔

عامل صاحب کچھ دیر تک سوچنے کے بعد پھر
’اے تھے۔“ دیکھیں لی بی بی، میں اس بات کی اجازت
اپنے استاد سے لیتی پڑے گی اس کے لیے ایک خاص
عمل کے ذریعے اپنے استاد سے روحانی طور پر
مٹکلات کرنی پڑے گی۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اس کام
میں خرچہ بھی بہت ہوتا ہے بہت سارے خوات
ہلانے پڑتے ہیں منگ و وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے
’مٹک کے ذریعے اس بات کا یہ چلا پڑتا ہے اور
’مٹک کو بلانے کے لیے ان چیزوں کا استعمال بہت
ضروری ہے ورنہ سب کو معلوم ہے میں کام کرنے کی
لہجہ نہیں لیتا۔ کوئی اپنی خوشی سے دے دے وہ اور

اپنی آنکھوں کے سامنے سوکھاتے سے کام کر دائیں۔۔۔۔۔

مسز تو قیر کسی ایسے اشتہارات پر ڈھک رہی تھیں کہ ہر کام خنوں میں کر کے کاغذی کرنے والے خود کیوں ایک معمولی سا بک پر بیٹھے ہوئے ہیں؟ اپنے آمودہ حال ہونے کا کام نہیں کر دیا؟ مگر آج وہ خود ایک عامل کے پاس اپنا مسئلہ کر دلوانے بیٹھی تھیں۔

”آپ خرچہ تو بتائیں! کتنا ہوگا؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”بی بی!۔۔۔۔۔! ہم کسی کو خواہوا خرچے میں نہیں ڈالتے۔ آپ کے اصرار پر صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کا نام۔۔۔۔۔ اور ان سے شروع ہوتا ہے آپ کو نام کا پہلا حرف بتانے پر بھی ہمیں سوکھاتے کی دقت کرنی پڑے گی۔ گوشت کا صدف اور مٹھائی کی نیاز کرنی پڑے گی۔ تقریباً دو ڈھائی ہزار روپے تو اسی میں خرچ ہوگا اور چھائیں ٹھیک ہے میں سوکل کو بلانے کے لیے بخوات وغیرہ کا اپنے پاس سے انتظام کر لوں گا۔ میں دیکھتا ہوں شاید میرے پاس کچھ بڑا ہوا ہو۔“

عامل صاحب تجلے کیا کیا بول رہے تھے جبکہ مسز تو قیر تو اپنے خیالوں میں بیٹھ دوں۔۔۔۔۔ اور ان کے چکر میں پھنسی بیٹھ رہی تھیں۔

”میں سے تو حرام شروع ہوتا ہے اور سر میری دیورانی ہے۔ بظاہر تو بھائی بھائی کہتے زبان سوکتی ہے اور اندر سے دشمنی کر رہی ہے بڑی کھلی ہے اور ان سے مجھ میری تہ نہ دے دے اور بے یہی بڑی اچھی طرح لکھی ہے بہت بڑے خطوں نظر آتی ہے اور ہاں!۔۔۔۔۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے تو شروع ہی سے مجھ سے جتنی ہیں۔ جب بھی میرے گھر آتی ہیں میرے گھر اور سامان کو لگاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی

ہیں۔ حدان کے لیے اور نظروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کئی بار کہہ چکی ہیں۔۔۔۔۔ ”مجھی تمہارا کیا ہے تم تو خود بھی کمانی ہو تمہارے میاں بھی اتنی اچھی پوسٹ پر فائز ہیں تمہارا تو گھر بھی کرائے پر اٹھا ہوا ہے تمہیں کسی چیز کی ہے؟“ وہ نہیں دیکھیں گے میں نے محنت کی ہے۔ میں نے تو شادی کے بعد بھی اپنی بڑھائی جاری رکھی تعلیم مکمل کی تو فکری کی اور پھر خدمت کر کے اوری منزل بنوائی۔

اب کرائے پر اٹھایا ہے تو اس سے خرمہ اتار دی ہوں۔ خود تو میرے بھیا کی کمانی پر عیش کر رہی ہیں۔ میری طرح محنت تو کر کے دکھائیں؟“ ان کا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا ٹھیک کاچ جو عامل صاحب نے ان کے دماغ میں بویا تھا وہ انہوں میں تباہ و تار و تخت بن چکا تھا۔

مسز تو قیر ایسی تھیں۔۔۔۔۔ وہ سیدھی سادی مراد علی تعلیم یافتہ قدرے مذہبی خاتون تھیں۔ وہ ایک سیکریٹری اسکول میں منصفہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وہ بڑی مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ شوہر ایک تجارتی فزم میں مارکیٹنگ منیجر تھے۔ ان کے چار بچے تھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں مگر اڑھارہ عرصے سے ان کے مالی حالات خراب ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھیں۔ ان کے شوہر کی فزم کچھ دنوں سے خسارہ میں جاری تھی جس کی وجہ سے تقریباً آٹھ مہینے سے ان کی خواہ اسٹاپ ہوئی مسز تو قیر کو اپنی خواہ سے گھر کا خرچ چلانا پڑ رہا تھا اس لیے ان کو کمانی شکل پیش آ رہی تھی۔

اسکول میں پچھڑ آج میں بے تکلف ہوتی ہیں تب ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتی ہیں وہ آپس میں اتنی بے تکلف ہوتی ہیں کہ جو گھریلو باتیں مکی بہن کے سامنے نہیں کر سکتیں وہ

اسٹاف کے کر لیتی ہیں چاہے وہ سرال کی شکایتیں ہوں یا میاں کی بے وفائی یا لاچار دانیوں کا راز سب ایک دوسرے پر عیاں ہوتا ہے۔ اس طرح سب آپس میں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کر کے اپنی پینشن ریلیز کر لیتی ہیں اور اسلے میں سب ایک دوسرے کو شہرے بھی خوب دیتی ہیں۔

مسز تو قیر کیکنہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے خاصی پریشان ہیں اس وجہ سے وہ چڑچڑی ہو رہی تھیں وہ بچوں اور میاں سے بلاوجہ الجھ پڑتی تھیں شوہر پہلے ہی پریشان تھے اور بے یوگی کی بدحالی نے ان کو چڑچڑایا دیا تھا۔ دونوں اکثر بلاوجہ ٹھکارا شروع کر دیتے۔ اس منیشن نے گھریلو حالات پر اثر ڈال دیا تھا اسکول میں بھی ان کی تدریس ذمہ داریوں پر بھی فرق پڑنے لگا تھا۔

ایک روز مسز تو قیر کی زبانی تمام حالات سن کر ان کی ایک ساتھی منیجر نے ایک عامل صاحب کا پتہ بتایا تھا اور ان کے عملیات کے ذریعے سے لوگوں کو دلانی کا کامیابیوں کے لیے قہرے تھے کہ وہ بھی اس بات پر تیار ہو گئی تھیں کہ اس بار ان عامل صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور مسز تو قیر اپنے میاں سے چھپ کر ان عامل صاحب کے بیچ مکی تھیں جنہوں نے ان کو ایک نئی منیشن میں جلا کر دیا تھا۔ قصہ مختصر بہت سوچ بچار کے انہوں نے اپنے پس سے دو ہزار روپے نکال کر عامل صاحب کی طرف بڑھائے تھے۔

عامل صاحب نے ہزار ہزار کے دو تھے نوٹوں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بظاہر بے اعتنائی سے کہتا۔۔۔۔۔ ”بی بی!۔۔۔۔۔! اس پورے کام میں پانچ ہزار سے کم خرچ نہیں ہوتا اور اس میں میری کوئی فیس یا ہدیہ نہیں یہ صرف آپ کے کام کے لیے منوکل کو بلانے کا خرچہ ہے۔“

”لیکن میں تو اسے نہیں لائی دے بھی آج کل میرے حالات ایسے نہیں کہ میں اتنی بڑی رقم خرچ کر سکوں۔“

”لیکن آپ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“ ”گھر میں بہت بچہ ہوں آپ کا کام شروع تو کریں میرے میاں کی جوتواہری ہوئی ہے وہ آپ اپنے عمل سے نکلوا دیں تو پھر میں آپ کو پھر یہ رقم دے دوں گی۔“

”بی بی!۔۔۔۔۔! آپ اپنے شوہر سے کہیں کہ وہ باقی رقم کا انتظام کر دیں۔“ عامل صاحب نے مشورہ دیا تھا۔

”عامل صاحب! میرے شوہر نہ تو عملیات وغیرہ کے قائل ہیں نہ اس قسم کے کام کا وہ پسند کرتے ہیں میں ان کے علم میں لائے بغیر یہاں آئی ہوں۔“

”لیکن بی بی!۔۔۔۔۔! پہلے یہ کام ہوگا تو آپ کے میاں کو رکی ہوئی خواہ لے لی اس کے لیے پہلے خرچہ تو کرنا ہوگا۔“ عامل صاحب نے مسز تو قیر کو اپنے مطلب کی سمجھانے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ کر کہتے گئے۔ ”آپ ایسا کریں کہ یہ رقم والدین میں جمع کر دے دیں میں کام شروع کرنا ہوتا آپ دو چار دن میں انتظام کر کے باقی رقم دے دیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مسز تو قیر نے بے چارگی سے کہا تھا پھر اپنے خون پیسے کی کمانی دو چار روپے عامل صاحب کے حوالے کر کے چلی آئی تھیں اور دل میں یہ سوچ رہی تھیں کہ عامل صاحب کو باقی پیسے اسٹاف سے قرض لے کر دے دوں گی۔

ان کی بہن سارہ کا نام بھی آتا ہے اور میم سے اُن کی والدہ معینہ کا نام بھی ہے اور فیضان کی نانی ہیں جن کا نام اُن سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا بہت سی سہیلیاں اور جاننے والیاں بھی ہیں جن کا نام س۔م اور ن سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کا نام بھی منیرہ ہے جو ہم سے شروع ہوتا ہے گردہ روایتی حدود اور ملن جو سہرا ل والوں اور ہماری سے ہوتی ہے اب اس کی بنیاد پر چکی کی دو شاخ سے پہلے نند بھاج اور پوریانی سب سے خلوص کا رشتہ قائم تھا۔ یہ سب عامل صاحب کی باتوں کا کمال تھا جو بل مہر میں خلوص اور محبت ختم کر گیا تھا۔

.....
عامل صاحب نے نوٹل پانچ ہزار کا خرچہ بتایا تھا مگر دو تین ہفتوں کے اندر سزوقیر کے تقریباً تین ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے جو انہوں نے نہ جانے کس کس سے ادا کر لیے تھے مگر اس کے باوجود ان کے مسائل جوں کے توں تھے بلکہ ایک اور مسئلہ قرض کا بھی ہو گیا تھا۔

دو تین مہینے یوں گزریں کہ سزوقیر صاحب کے آفس کے مسئلہ کا کوئی حل نکلا نہ اُن کو چپوس کی ادائیگی ہوئی بلکہ سزوقیر قرض پر قرض میں پھنس گئے۔ نہ جانے مالوں نہ پائے رفتن کے مصداق وہ عامل اور معمول کے چکر میں الجھتی چلی گئیں۔ ایک عامل سے کوئی قاعدہ نہ ہونے پر ان کو کسی اور نے دوسرے عامل صاحب کا پتہ اس یقین دہانی کے ساتھ بتایا تھا کہ ان کے عملیات سے ان کا ذاتی طوڑ پر اپنا ناکامہ

ہو جائے۔
نئے عامل صاحب نے سزوقیر کو صرف چار ہزار کا خرچہ بتایا تھا وہ بھی قسطوں میں انہوں نے تو سزوقیر کو اپنے آستانے پر بھی نہیں بلایا بلکہ نوٹوں کے

ذریعے تمام معاملات طے کر کے اپنے بندے کو ان کی طرف بھیج دیا جس کو سزوقیر نے اپنے گھر کے بجائے اپنے اسکول میں بلوایا۔ عامل صاحب نے ان کو صرف دو ہفتوں کا کارٹھ دیا تھا جس میں ان کے سارے کام سمجھ جائے تھے ان کو یہ یقین دہانی کروا دی تھی کہ میرے عمل کے بعد آپ کے میاں کی ریکی ہوئی خواہ مخواہ ان کی ترقی کے کارڈ کے ساتھ مل جائے گی یوں سزوقیر نے عامل صاحب سے ایک نئی امید باندھی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سزوقیر کے شوہر جن کے لیے عملیات کروانے مارے تھے ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان کی بیگم صاحبہ کیا کمالات کر رہی ہیں؟ ویسے خبر بھی اسی تھی کہ ان کو کچھ خبر نہ تھی کہ سزوقیر کا لپسا ہو کر ڈھنگا نہ لگتا اور کچھ خبریں کٹوٹ بھی جاتا کیونکہ ان کے میاں کو قیاسے معاملات کے شدید ترین مخالف تھے ان کے لیے یہ ناقابل معافی غلطی ہوئی وہ یہی تو کوئی معاف نہیں کرتے۔

.....
سزوقیر احمد کے آفس کے حالات تو خراب تھے ہی ان کے گھر کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ سزوقیر کا زیادہ وقت اور پیرہا ایک اور نئے عامل صاحب کے چکر میں خرچ ہو رہا تھا۔ سب تو جب تکو موہاں پر ہدایتاں مطالبے اور شور سے ہوتے۔ ان معاملات کے باعث وہ گھر سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جب گھر کی مالک گھر سے بے گناہ ہو جانے کی تو گھر کی حالت بگڑے ہی کی۔ ان حالات نے سزوقیر صاحب کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ میٹشن اور ڈپریشن نے اُن کو بہت زیادہ چڑچڑاہا دیا تھا۔ ان حالات میں بجائے اس کے کہ وہ شوہر کی پریشانیوں کو شیش کر تیں جس میں اس کے شکایتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ گھر میں عجب محنت

اور سگواری کی فضا چھا گئی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے بھی سزوقیر پریشان تھے سو ان کی بیگم سزوقیر پر بھی بہت برا اثر پڑا۔ اسکول سے شکایتیں آنے لگیں اور دونوں میاں بیوی کو لڑائی کا ایک اور ایڑی ٹھیل گئے۔
.....
سزوقیر کو اب عامل حضرات کا پیسہ دینے کے لیے ساتھی نہیں تھے۔ یہ قرض ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ میٹرس اب کسلے عام تھیں۔ "سزوقیر کو تو ملنے کی عادت ہو گئی ہے" ایک دن وہ ہر طرف سے پریشان اپنے حالات پر غور کر رہی تھیں کہ عامل صاحب کا ایک مٹے معاملے کے ساتھ فون آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"آپ کے لیے سہون شریف جاکر پڑھائی کرنی ہے۔ گیارہ دن کا چلہ ہے" روزانہ گیارہ کوڑ خرید کر آزاد کرنے ہیں اس کے علاوہ پڑھائی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اس کا بھی خرچہ ہے پھر آنے جانے کا کارایہ اور کھانے پینے کا خرچہ ہے وہ آپ کو دینا ہوگا اور بااں روزانہ گیارہ سینکڑوں کو تین وقت کا کھانا کھانا کھانا ہے۔"

سزوقیر نے حساب لگایا تو خرچہ ہزاروں میں ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کہاں سے اتنا خرچ کر تیں؟ اصل مسئلہ تو چپوس کی کی کا ہی تو تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مختلف مالوں کا کھانا لیا تھا۔

انہوں نے اپنی اسی ساتھی سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا جس نے انہیں اس مٹے عامل کا پتہ بتایا تھا۔ اس نے میٹرس ساری بات سن کر بے گناہی سے کہا تھا۔ "بھئی" خرچ تو کرنا پڑے گا۔ آخر کھانا کام کی ہو رہا ہے۔
.....
آج بھی نہیں بدگئی کہیر اکام ہو جائے گا؟

"بھئی..... عمل تو پورا ہونے دو۔" میٹرس نے پھر لاپرواہی سے کہا تھا۔

"عمل پورا ہونے کا خرچہ میں کہاں سے کروں؟" سزوقیر نے زچ ہو کر کہا تھا۔
.....
"بھئی تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔" وہ یہ کہہ کر اٹھ کے چلی دی گئی۔

سزوقیر نے بہت سوچ سمجھ کر عامل صاحب کو فون پر بتایا تھا کہ میں اتنا خرچ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔
.....
"آپ کو کوئی ذکوئی انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اب تو میں اس عمل کی تیاری کر چکا ہوں۔" عامل کے لہجے میں دیکھی جاساں بات کے جواب میں وہ خاموش رہی تھیں تو پھر عامل نے زری سے کہا تھا۔

"دیکھو بی بی.....! بہر عورت کے پاس زیورات کی فصل میں کچھ نہ کچھ سونا ضرور ہوتا ہے وہ فروخت کر دیں۔" عمل کو کچھ میں اور مرنا چھوڑیں.....

اب انہیں صورت حال کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہوا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ بڑی دلدل میں پھنس رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کچھ کچھ بغیر فون رکھ دیا تھا مگر دو تین دن کی خاموشی کے بعد ایک دن پھر عامل صاحب کا فون آ گیا تھا۔

"بی بی.....! آپ نے تو مجھے فون ہی نہیں کیا؟ خیر یہ بتائیں کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا؟"

"میں نے تو آپ کو اسی دن جواب دے دیا تھا کہ میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔" سزوقیر نے صاف جواب دیا تھا۔

"دیکھ بی بی.....! میں تو آپ کے کام میں پھنس گیا ہوں۔ جو ایک موکل کام مکمل نہیں کرے گا۔" میٹرس پریشان کرتا رہا۔ آپ عمل کو کچھ میں احوال نہ چھوڑیں ورنہ.....

”مگر میرے لیے اتنا خرچ کرنا ناممکن ہے نہ میرے پاس زیورات ہیں جو فروخت کر دوں اور اگر ہوئے تب بھی میں نہیں کر سکتی گی۔“

”بی بی!.....! آپ مجھے کیوں پھنسا رہی ہیں؟ دیکھیں آپ کے پاس گاڑی بھی تو ہے وہ فروخت کر دیں۔“ یہ بات سن کر تو مسرتو قیر اچھل پڑی تھیں۔ ان کو ایسے معلوم ہوا کہ شوہر کی گاڑی میرے نام ہے؟ وہ دل میں سوچتے ہوئے بولی گئیں۔

”یہ بھی ناممکن ہے۔“

”تو پھر بی بی!.....! آپ ایسا کریں مکان بھی تو آپ کا اپنا ہے اس کے نقدات پر قرض لے لیں۔ آج کل چیک سے بڑی آسانی سے قرض مل جاتا ہے۔“

اب تو مسرتو قیر کا صبر جواب دے گیا تھا۔ انہوں نے بڑی تکی سے کہا تھا۔ ”آپ عامل ہیں یا.....؟“ غلگ؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے آپ کے کام نہیں کروانا، بس اب یہ معاملہ ختم کر دیں۔

”میں کام شروع کر کے چھ سال نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو یہ خرچ اٹھانا ہی پڑے گا۔“ عامل نے پھر دھمکی دی تھی۔

”میں آپ کا یہ نمبر اپنے شوہر کو دے رہی ہوں وہی اب آپ سے بات کریں گے۔“ مسرتو قیر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر اس کم کو ہی نکال کر پھینک دیا تھا جس سے وہ عامل حضرات سے رابطہ کرتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے دھوکہ کے دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد اللہ سے معافی مانگی تھی اور اس کا کھل اُدارا کیا تھا کہ اس نے انہیں ان جھوٹے عاملوں کے چکر سے نکالا اور عزت و رہائی ورنہ اگر تو قیر صاحب کو اس بات کا پتہ چل جاتا تو یہ نہیں کیا ہوتا۔ اس سے آگے ان میں کچھ سوچنے کی صحت نہیں

صدف آصف

تو قیر صاحب

یا مکن سہا خیال
اور جو چیز بھی ہے دایم و مکمل ٹھہری
یہ نظر میرے سوا اور کہاں ٹھہری ہے

ان پتیلیوں کے لیے بطور خاص جو اپنے شوہر کی عدم اہمیت کا شکار ہیں

”ہیلو..... پروفیسر صاحب! پلیر“ میری مدد کریں میں بیٹا چاہتی ہوں خوش رہنا چاہتی ہوں مگر وہ مجھے خوش رہنے نہیں دیتے۔ ”دوسری طرف بی بی سی ایل کال رہی ہو تو ہے ہی میں نے پروفیسر اور سندے مدد کی درخواست کی تھی اور اس کے ساتھ

یہ مجھے بے ساختہ دروہ بھی آ گیا تھا۔ ”دیکھ پلیر! آپ حوصلہ کریں یہ بتائیں آپ کو کیا ہیں؟ کیا جانتی ہیں؟“ دوسری طرف سے پروفیسر صاحب نے مجھے دلا روہنے کی کوشش کی تھی۔ ”میرا نام عاصمہ ہے۔ مجھے آپ کا فون نمبر

کھانے لگائی اور باقی کا وقت ان کے گرد پروانوں کی طرح گھبرونے میں صرف کرتی لیکن اس بار میں نے اپنی روایت تو ڈالی پہلے ان بچوں کے ذریعے ان پر فزود ڈالا اور پھر ہم سب باہر کھانا کھانے گئے یہاں بھی میں نے اپنی توجہ اس کے علاوہ ہر دور کی چیز پر رکھی تھی۔ میں نے فیروز کی لکیوں والا گرد اور بیلا چوڑی دار پا جاسہ پہنا ہوا تھا۔ کانوں میں سونے کے وہ بھیسے تھے جو اس نے مجھ سے منہ دکھائی میں دے دیتے تھے بالوں کو کھلا چھوڑا تھا شوق رنگ کی لپ اسٹک بھی لگائی تھی۔ اس کی نظریں کچھ پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں ان سے کوئی پیار بھری بات کہے ہوئے مجھے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج اسد میرے آگے مزاحمت نہیں کر پائیں گے مگر میں بھی ان کے دل سے اپنی محبت کا دریا بہانا چاہتی تھی اسی لیے دکان پر بچوں کے ساتھ اپنے سیکے انڑکی۔ بچوں کا ادھر میرا سامان ایک بیک میں رکھ کر میں نے پہلے ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ اسد مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر اکیلے دواںں جاتے ہوئے بہت دواںں دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بچوں کو دواںں گھر چلنے کے لیے چیکے چیکے لاج بھی دیا تھا مگر میں جانے کتنے مہینوں بعد بچوں کے ساتھ سیکے رہنے آئی تھی۔ ان کا تو خوشی سے برا حال تھا اس لیے انہوں نے اپنے بابا کی ہر پریشانی فرمگاری تھی۔

ایسی گھر پر دل تو میرا بھی نہیں لگا رہا تھا مگر میں چاہتی تھی کہ اسد اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے لینے آئیں۔ میرا اعزاز تھا کہ میرے اسی کے گھر کتنے سے دوہاری کی ضرورت محسوس کریں گے۔ دو دن انتظار میں گزر گئے مگر نہ وہ آئے نہ ہی ان کا کوئی نوٹ آیا۔ مجبور ہو کر میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ دے۔ اس نے کہا کہ میں اپنی گاڑی میں بیٹھوں گا۔ تم آ جاؤ پھر آپ کو گھر چھوڑ دوں گا۔ میں تیار

ہو کر بھائی کا انتظار کرنے لگی۔ ایک مکہ سے درست رہنے کی عادت جو بڑی تھی۔ بچے لان میں گھر دواںں کے لیے تیار پائی تھی ان کے کان کھارے تھے۔ میں نے سوچ کر اداس بھیجی تھی کہ اسد بھی جی نہیں بدلیں گے پھر ادول دور پا تھا کہ میں نے کس سنگدل سے دل لگایا ہے۔ اسے میں بچوں نے آواز دینا شروع کر دی تھیں۔ "ماما..... چلیں نا" ہر دوری ہے۔ "میں نے کھانے پر بیک ڈالا تھا اور آسو پوچھتی ہوئی بھائی کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر نکلی آئی تھی۔

مگر یہ کیا؟ یہاں تو ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ او بانی کا ڈانٹیں نے خوش ہو کر رات بیک سیٹ کی طرف دیکھا تو اسد اپنی دو جاہوں کے ساتھ بیٹھے سگرا رہے تھے۔ میری تو حیرت ہوئی۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بچے کچھ خوش تھے۔ راستے میں اسد نے بتایا کہ وہ مجھے سر پر انڑا تو چادر ہے تھی اسی لیے فون کر کے نہیں آئے مگر ہمارے بچے اور میرے گھر والے اس بھاری سی سازش میں شامل تھے۔ اس دن مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے سیکے سے پہلی بار رخصت ہو کر اسد کی زندگی میں آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لی تھی اور مجھے کھانے پاکستان ٹور پر لے گئے تھے۔

پاکستان ٹور سے واپسی کے فوراً بعد میں نے پروفیسر ارشد سے فون پر رابطہ کیا تھا اور خوش خوش ساری صورت حال بتائی تھی۔

"اس دوران آپ کے سسرال والوں کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟" پروفیسر ارشد نے پوچھا۔

"بہت حوصلہ شکن تھا میرے کام سے ہاتھ اٹھالینے پر انہوں نے بڑے طعنے دیتے میرے سیک اور پر انہوں نے میرا مذاق اڑایا مگر میں صبر سے ڈلی رہی۔ انہوں نے اسد کے کان بھی مجھے مگر مکیں کہ اسد کے من کو خود بھی میرے اصرار والی تبدیلیاں

بمباری تھیں اس لیے ایک دن انہوں نے سب کے سامنے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کوئی مجھے کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرے گا نہ وہ اپنی ٹیلی کے ساتھ نہیں اور شوق ہو جائیں گے۔ سونے کا ٹاڈہ دیئے والی مرنی کو کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے دوسرے دن سے سب سدرہ گئے۔ میرے لیے وہ بھی احترام گم دواںں کے سچے میں در آ جا جو شادی کے شروع دنوں میں ہوتا تھا۔ "میں نے چپکے ہوئے یوں بتایا تھا کہ پروفیسر ارشد بھی جس دینے تھے پھر میں نے بہت بہت شکر کیا اور کہنے کے بعد فون رکھ دیا تھا۔

یہ اس بات کے ایک نمونے بعد کی بات ہے کہ میرے پچازاد بھائی انظر بھی مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں ابھی پروفیسر ارشد کے حوالے سے ان کا شکر یہ ادا کرنے ہی والی تھی کہ وہ بول پڑے تھے۔

"ماسا.....! میں بہت شرمندہ ہوں میں نے تمہیں پروفیسر ارشد کا جو خبر دیا تھا وہ اب ان کے زیرِ استقبال نہیں۔ دراصل انہوں نے اپنا پرانا کمرے کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ اپنے کھن اقبال میں واقع اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ میری بڑے دنوں بعد کل جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے بات بتائی اور اپنا پتہ بھی دیا ہے۔ تم آ جاؤ بچے کے قریب ان کو فون کر لینا۔" اس کے بعد انہوں نے ایک جٹ مجھے دی جس کی پر کالے پین سے پروفیسر ارشد کا کوئی اور نمٹا رکھا ہوا تھا۔

"تو پھر وہ کون تھے جن سے میں پروفیسر ارشد سمجھ کر اپنا حال دل بہتی رہی تھی؟" یہ سوال مجھے بہت زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پچازاد بھائی کے جاتے ہی فوراً پروفیسر ارشد کا وہی پرانا نمبر ملا یا تھا۔ بہت دیر تک بتل ہو رہی تھی مگر میں نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے کئی بار زانی کیا تھا۔ آخر ایک کھٹے بعد کی عورت نے فون اٹھایا تھا۔

محبت کچھ نہیں ہوتی.....

محبت کچھ نہیں ہوتی

محبت کچھ نہیں ہوتی

تمہیں کس میں سمجھاؤں؟

یقین کر لو

میںی ج ہے

محبت اک نظر دے آنے والے سامنے بیٹھی ہے

ہمیشہ ساتھ چلتی ہے

محبت ایک دواںں سا ہے

جو بس تحلیل ہوتا ہے

ہماری زم سانسوں میں

ہماری گرم سانسوں میں

محبت تم سا ہے اک لس

جو دل کو بڑا رکھتا ہے

محبت چاند کے بیسی

جو اکثر اٹھا کر پرچی ٹھکی میں نہیں آتی

محبت رات کا جگنو

جو کھٹے اور چھپنے میں ہی بس الجھائے رکھتا ہے

محبت تم میں کسی ہے کہ

محبت کچھ نہیں ہوتی

محبت کچھ نہیں ہوتی.....

شازلی سعید مغل، کراچی

ر ر ر ر ر ر ر ر ر ر ر



حیرات انگیز

جواب ماس کا خیال

انگوں میں لگے ہوئے جہاں اک عمر کے سدرے

ہاتھوں کی ٹیکروں میں لکھا کچھ نہیں ہوتا

اکسی حصولوں سے لکھدی ایک صنف تازک کا قصہ دوردولم

”شرین!..... آج کل تو تم اسکول سے چھٹیوں پر ہو میری ایک واقف کار ضرورت مند خاتون کو free میں انگریزی پڑھا دو۔“

”میرے پاس ٹائم تو نہیں ہے۔ خیر میں دیکھوں گی۔ لی انجیل تو میں جانتی ہوں“ میرے Dear hubby دفتر سے آچکے ہوں گے تو ڈائنی

میری طبیعت ساری رات ٹھیک نہیں رہی تھی۔ جیسے کسی بے چینی محسوس ہوتی رہی تھی۔ میں دوسرے دن اپنی بہت ہی اچھی اپنی ہم نام دوست ڈاکٹر شرین افضل کے کینک جوائنٹی میں بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے کے بعد انہوں نے کچھ دوائیاں دی ہیں اور چند مشوروں کے بعد کہا تھا۔

”بس لی بی میں ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہوں اسی لیے آپ کے شوہر کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے رپورٹس سارے کالج کی اصطلاح کے مطابق آپ کو کچھ مشورے اور ہدایات دی تھیں۔ اسل میں مردوں کو مزاج ہوتا ہے وہ زندگی میں تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے آپ کے شوہر اسمدی ریشم لائف سے اکٹھے گئے تھے۔ آپ نے اُن کے معدے کا تو خیال رکھا مگر ان کے دل کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیوی کو بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے خاصہ کے روپ میں نہیں۔ میرے مشوروں پر عمل کر کے آپ نے اپنی تمام چیزوں کو ان کی زندگی سے نکال پھینکا جو انہیں آپ سے دور کر رہی ہیں اور ان باتوں کو ان کی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی جس سے وہ زندگی میں بدلاؤ محسوس کریں کیونکہ ہر وقت بیٹھا کھانا مزہ سچت ہے اسی لیے آپ نے اپنی سبھی محبت میں نیگمیا میں ڈال دیا تھا۔ آپ کے شوہر اسمدی آپ سے بس یہی مسئلہ تھا جو میں نے دور کر دیا اور ہاں وہ ہزار بار غیور ہو تھیں مگر صرف آپ کی تسلی کے لیے بنایا تھا کیونکہ آپ مجھے ستاروں کا علم رکھتے والا پروفیسر سمجھ رہی تھیں ورنہ مجھے ستاروں کے بارے میں کوئی علم اور معلومات نہیں ہیں۔“

.....

میری زندگی اب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بڑی بھرپور گزر رہی ہے اور ہاں ڈاکٹر حسن عابدی کا شمار ہمارے نہایت ہی ترقی پزیر فرینڈز میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے زندگی کو بہترین انداز میں گزارنے اور ستونارنے کے لیے بے شمار مشورے دے چکے ہیں۔ ان میں سے ایک مشورہ میں آپ کا رینڈ جو کبھی بتا نہ تھیں ہوں یہ بات کے لیے بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ ”کسی کی نظروں میں اپنے آپ کو ستونارنے کے لیے پہلے خود سے اپنے آپ کو ستونا ضروری ہوتا ہے۔“

”مجھے پروفیسر صاحب سے بات کرنی ہے؟“
”اوه..... آپ کا مطلب شاید ڈاکٹر صاحب سے ہے اؤکے ڈیٹ۔“ وہ نہیں بکھر رہا مگر بے ہوش آواز دے لگیں۔ ”عابدی!..... ہاں ہاں!.....! ارے بھئی آپ کا فون ہے۔ اب آپ کے مریش مگر بھی فون کرنے لگے ہیں۔ اس عورت کے بچے میں شرارت تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مہربان آواز میرے کانوں سے گرائی جس کی وجہ سے میری زندگی کو سکون حاصل ہوا تھا۔“
”وہ..... وہ..... آپ کون ہیں؟“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں ہوں؟ ”اچھا تو آپ کو پتا چل گیا کہ میں پروفیسر اور شدائیں ہوں؟“ انہوں نے جتنے ہوئے کہا تھا۔
”پلیز..... آپ اس سپنس کو رڈ دیں۔“
میرے جس اور لکھے میں غلطی تو نہیں نے بھی مزید تھک رہا ڈاکٹر ضروری نہیں سمجھا تو۔
”میں ڈاکٹر حسن عابدی ہوں میں نے پروفیسر ارشد کی جگہ پر مگر کرانے پر لیا ہے اسل میں اُن کا پرانا فون میرا نہیں کیا ہے کیونکہ یہ فون لگہ کان نے لگوا دیا ہے تو ہر کرائے دار کے زیر استعمال رہتا ہے۔ اُس دن آپ نے شاید ہائی کی انتہا میں پہنچی اس مگر پروفیسر ارشد کا نمبر سمجھتے ہوئے فون کیا تھا اور جب میں نے آپ کو بتایا تو آپ کا کہنا تھا کہ میں پروفیسر اور شدائیں ہوں تو آپ نے سنی کی زحمت نہیں کی بلکہ کھوکھو کرنے کی دیکھی دی تھی اس لیے مجھ سے آپ کی پوری کہانی سن کر اپنی تعلیم اور تجربے کے حساب سے آپ کا کیس حل کر دیا تھا۔ میں اس کی بات تھی۔“ ڈاکٹر حسن عابدی نے شکستہ انداز میں سارا سارا کہہ دیا تھا۔
”اوه..... اچھا تو یہ بات تھی مگر آپ نے ابھی بھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آپ.....“
میں نے جلدی سے پوچھا تھا۔



ہے۔“

”سزودہ کل تمہارے گھر آ رہی ہے۔“ شمرین نے تو جیسے فیصلہ کر ڈالا تھا۔

دوسرے دن میں گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ”اسامہ! اچھا! مٹاں! دروازے پر کوئی ہے؟“ وہ بچوں کو دے دی تھی۔

”کی! کوئی آئی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ مٹھن یہ تیار کر بھاگ گیا تھا۔

”کون آ گیا؟“ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے تک نکلی تھی۔ وہاں ایک خاتون موجود تھیں۔

”آپ شمرین اور میں ہیں؟“ آنے والی خاتون نے تعجب سے پوچھا۔

”جی، شمرین اور میں ہوں۔ اور آپ؟“

”میرا نام علیہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر شمرین افضل نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں آپ سے

انگریزی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ علیہ صاحبہ نے اپنے تعارف کے ساتھ ہی آنے کی وجہ بتائی تھی۔ میں نے

انہیں گھر کے اندر بلا کر کھانے کے بعد کہا تھا۔

”علیہ صاحبہ.....! سواری میں home tuition نہیں کرتی۔ میں آرام کے علاوہ بچوں کے ساتھ

time spend کرنے کے لیے چھٹیوں پر ہوں۔ آپ کو برا تو لگا ہوگا مگر میں straight forward

ہوں۔ خیر اب آپ یہ بتائیں چاہئے میں کیا یا کولڈ تو رکھ؟“ میں نے بہت غلظت سے پوچھا تھا۔

”بھئی..... میں بایوں بہت ہوشی ہوں.....“ یہ کہہ کر انہوں نے رونما شروع کر دیا

تھا اور اس قدر روئی تھیں کہ میں میرے لیے ان کو جب کراٹا مشکل ہو گیا تھا ساتھ ہی دل میں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان سے پوچھوں آخرا کیا

معالجہ ہے؟ وہ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“ اور پھر میں نے اُن سے یہ بات پوچھ لی تھی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد جب اُن کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

”میں کراچی میں ناظم آباد کے علاقے میں پیدا ہوئی۔ میری ایک بہن اور بھائی مجھے سے بڑے

ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری شادی انوار احمد نام کے ایک صاحب سے کر دی گئی۔ وہ اس وقت

اڑتیس سال کے تھے اور پشے کے اعتبار سے بزرگ مین تھے۔ ہماری شادی بہت دھوم دھام سے

ہوئی۔ مجھے کہن بننے کا بہت شوق تھا۔ میں دکن میں خلیفہ مریدی میں اپنے پیٹریک زندقہ کا بہت دیر تک

تعلیم کر رہی تھی اور میری عمر آٹھ آٹھ گھنٹے میں بہت شراب اور گھبراہٹ تھی کہ وہ میرا گھونگٹ

اٹھا کر کچھ نہیں لے کر انہوں نے تو میری آرزو اور امید کے برعکس بس یہ فرمایا تھا۔ ”میں لائٹ بند کر

رہا ہوں“ تم بھی کچھ نہ تبدیل کر کے سو جاؤ۔ میں بہت تنگ کیا ہوں۔ لی الحال بس آرام کرنا چاہتا

ہوں۔“

میں جبران پریشان وادش روم چلی گئی اور کچھ نہ تبدیل کر کے بیٹھ کر دوسری طرف سونے کے لیے

لٹ لی تھی مگر صبح سویرے اچانک انہوں نے مجھے جھجھک کر بگاڑ دیا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی تو وہ اپنی

مراد مانگ کر اٹھنا کر رہے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ بڑا عجیب تھا اور پھر انہوں نے بس اپنی ضرورت

پوری کر لی تھی اور وہ باہر ہو گئے تھے۔ یہ سب محسوس نہ کیا تھا کہ میں دروہی ہوں میں روتے ہوئے یہ سوچ

رہی تھی.....! میں ہوتی ہے سہاگ رات؟“

میری شادی شدہ زندگی کا آغاز بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ انوار میری ہر بات پر جہیز میں برائی تلاش کرتے تھے میرا بولنا آئیں بڑا بیکار لگتا تھا۔

میں نے انہیں کہا تھا۔ میں باتوں ہی مگر جب سے یہاں آئی تھی کم بات کرتی تھی۔ انہیں میرے

گمانے میں ہمیشہ تنگ کیا یا زیادہ لگتا میری عمر کم بات کرتی تھی ان کے لیے مسئلہ تھی۔ ”کچھ کہتے“ تم

پر بھی حسرتیں کر رہی ہو۔“ میری ہر پسند نہیں پسند تھی۔ کچھوں میں میرا بیوروہ رنگ لگتا تھا وہ

کہتے۔ ”گلابی رنگ میں تم بند رہا لگتی ہو۔“ میں نے

وکی پر جو بھی پھیل لگتی غصے میں آ کر پوچھتے۔ ”یہ کون سا جینس دیکھ رہی ہو؟“ غصہ بھی ایسا تھا کہ جو

پتھر ہاتھ میں ہوتی۔ دسے مارے۔ ”بہی قسمت ہی تھی کہ میں زیادہ تر اپنے آپ کو بچا لیتی تھی۔ میری شکل و

صورت میں ہمیشہ نقص لگانے والا تھا کہ میں کافی ڈوب صورت تھی۔ میں اکثر سوچتی۔ ”میں یہ نفسانی

فرائض تو نہیں؟“ اُن کے ساتھ میرا دل تو کسی نہ کسی صورت توڑ جاتا تھا کہیں شب تو بہت ہی اذیت

ناک ہوتی تھی۔ رات ہوئی تو وہ وحشی روندا بہن کر میرے اوپر ٹوٹ پڑتے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ

انسان ہیں۔ میں روئی اور شکایت کرتی تو جواب ملتا۔ ”یہ تو میرا حق ہے تم میری بیوی ہو میں چاہے

تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کروں۔“

ان کے انجی رویوں اور حکمت کی وجہ سے رفتہ رفتہ میرے دل سے ان کا احترام بالکل ختم ہو گیا

تھا۔ خیر زندگی کا سفر ایسا ہی چلتا رہا کہ ایک روز ان کے سامنے اچانک ہی مجھے لٹائیاں شروع ہو گئی

تھیں۔ ”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے علیہ؟“ انوار احمد نے

واش روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

”میں pregnant ہو گئی ہوں شاید برسوں اماں کے یہاں بھی لٹائیاں دوسری تھیں۔ انہوں نے تنبیہا لیا کہ.....“

سنو.....!

سنو.....! میرے کریم تو آؤ

بہت اداس ہوں میں

بس آج نوٹ کے چاہو

بہت اداس ہوں میں

اندھیری رات ہے کچھ بھی نظر نہیں آتا

ستارے تو لڑکے لاؤ بہت اداس ہوں میں

زورہیب ماہی۔ ملائیشیا

”کیسے ہو سکا ہے؟“ انوار احمد نے غصے میں میری بات کاٹتے ہوئے مجھے ٹھٹھرا رہا تھا۔ ”تو خود

ابھی پچی ہے کچھ کیا پالے گی؟ اور کیسی..... تو مجھے یہ بات آج بتا رہی ہے۔“

جلدی سے تیار ہو جا میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر یہ قصہ ہی ختم کروادوں۔“

”میں..... میں اس بچے کو abort نہیں کرواؤں گی یہ میرے لیے اندھیرے میں جا لے گی

آخری کرنا ہے۔“ میں یہ فیصلہ کر کے بیڈ روم میں آئی تھی اور اپنے کچھوں کے چند جوڑے اور

ضرورت کا کچھ ساتھ بیک میں ڈالا تھا۔ انوار احمد اُس وقت وادش روم میں تھا۔ میں ابھی اُس گھر سے

لکھنا ہی چادر ہی گئی کہ انوار احمد وادش روم سے باہر آیا تھا اور میرا دھانہ کر اُس نے مجھے بالوں سے پکڑ

کر کھینچا تھا۔ ”کیسی..... تو اس حرامی کو پیدا کرنے کے لیے

میرے گھر سے بھاگ رہی ہے مجھے میں چاہوں تو تیری کو کھش ہی ارادوں.....“ یہ کہہ کر مجھے اس نے

اتنا مارا تھا کہ میں گھر کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے

ہوں ہوتے ہوئے مجھے ایسا لگا تھا جیسے پردوں کے کچھ لوگوں کی آواز کے ساتھ کہ کاروازہ زور زور سے بجایا جا رہا ہو۔

میری آنکھ کی تھی تو ایسا میرے سر ہانے موجود تھے۔ ”اب کسی ہو گیا؟“ ابانے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ میں اب اسے لپٹ گئی تھی اور روتے روتے faint ہو گئی تھی اور پھر پانی کے قطرے منہ پر پڑتے ہوئے آ رہا تھا۔

”ابا.....! یہ پچہ میری زندگی ہے مجھے نہیں مارتا اس کو.....“ میں نے روتے اور پکلتے ہوئے کہا تھا۔

”تم نگرمت کرو میری جان.....! اب تم جیسا چاہو گی دیکھا ہی ہوگا۔ اس انوار کی تو ایسی کی جیسی تم بس اور ام کرو۔“ کہہ کر ہاتھ پکے گئے۔

”ای.....! وہ مجھے بہت تکلیف دیتا تھا۔ میں ہر رات کانٹوں پر سوئی تھی۔“ میں نے اسی کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

میرے سخت اور کڑے وقت میں پردی بہت کام آئے تھے۔ انہوں نے ہی اس ظالم انوار سے مجھے بچایا اور میرے ہاں باپ کو لایا تھا اور پھر پردی مشکوں سے اس نے مجھے شخ دی تھی۔ منہ کے ساتھ ہی اللہ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا دیا تھا۔ اس کا نام ہم نے مہربان رکھا تھا۔

.....

وقت کا سفر چار دیواریاں ہا تھا۔ مہربان عمر کے زینے پر قدم رکھتا چلا گیا تھا۔ باد جو اس کے کراہا ہی مجھے سپورٹ کرتے تھے میں نے گئی کے اسکول میں نوکری کی تھی اور اپنی اولاد کی پرورش کے لیے خود بھی رزق حلال کمانے لگی تھی۔ اس دوران میں انوار احمد کے بارے میں خبریں ملتی رہیں تھیں کہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور اولاد فریڈک خواہ میں

لگا تا رہا پانچ بیٹیوں کا باپ بن گیا تھا۔

اُس روز میں اسکول سے جیسے ہی نکلی تھی ایک سفید بھڑائی میرے سامنے آ کر رکی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا تھا اور انوار احمد نے پا برآئے ہی مہربان کو گتے لگایا تھا اور نہایت جذباتی انداز میں بولا تھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے نا؟“ میرے دل کا ٹکڑا ابھول گیا۔ یہ میرا بیٹا ہے نا؟“

میں نے خوب سوچ بچ کر جواب دیا تھا۔ ”ہاں! الو احمد! یہ تمہارا ہی بیٹا ہے وہ بیٹا جس کی دنیا میں آنے سے پہلے ہی تم جاتے تھے کون تھے تو پھر آج یہ سب کیا؟“

”دیکھو بلینز مجھے معاف کر دو مجھے اپنی اولاد سے ملے تھے۔“ وہ جیسے میرے آگے گھر گزرتے لگا تھا۔

ہمارے چاروں طرف اب لوگ جمع ہوئے تھے۔ میں نے انوار احمد کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور مہربان کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے کمر کی راہ لی تھی۔ انوار احمد بھی میرے پیچھے پیچھے میرے کمر کے دروازے پر اور پھر میرے کمر کے اندر بھی آ گیا تھا اور اسے بہت دیر تک نہ جانے کیا بات کی تھی۔

انوار احمد کے جانے کے بعد ابانے آواز دی تھی۔ ”بیٹی علیہ! ادھر آؤ۔“

”جی ابا!“ میں جواب دیتے ہوئے ابانے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹی! الو احمد اپنی اولاد سے ملنا چاہتا ہے اور یہ تو قانون بھی جائز ہے وہ اپنے بیٹے کے لیے خود خراج بھی دینی دیتا چاہتا ہے۔ آج تمہارا بیٹا مہربان آٹھ سال کا ہے مجھے اب کہتا ہے کہ جب کل بڑا ہوگا اور باپ کا پوچھے گا تو کیا جواب دو گی؟ اب فیصلہ تمہارا ہے؟“ ابانے کہنے کے بعد اٹھ کر چلے گئے تھے اور میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

سارا دن اور ساری رات سوچتے ہوئے ہی گزرتی تھی۔ زندگی کی ظلم کی طرح آنکھوں کے سامنے کھونٹے کی گچی اور پھر جج آذان کی آواز پر نفاذ سے پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

جج اسکول جاتے ہوئے میں نے ابا سے کہا تھا۔ ”ابا! آپ کسی وکیل سے مل کر مہربان کا اپنے باپ سے ملاقات کا قانون پر کوئی طریقہ طے کر لیں“

”فیصلہ میں صرف اور صرف اپنے بیٹے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں۔“

ابانے میری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”وہ بیٹے! مجھے تو وہ انوار ابانے اب بہت بدلا دلا لگتا ہے۔“ ابانے یہ بات سن کر میں بس ایک ٹھٹھری ساٹھ ہی بھر کر رہ گئی تھی۔

اُس دوپہر اسکول سے واپس آنے کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی۔

”مہربان! کہاں ہو؟“

”میں یہاں ہوں گی!“ مہربان نے مجھے ڈرتے ڈرتے پھیل کے نیچے سے جواب دیا تھا۔

”بھیل کے نیچے کیا کر رہے ہو؟ پا برآؤ۔“ میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

”بھی! وہ انٹیکل کون تھے میرے کچھ پیا؟“ مہربان نے اپنی پردی پردی غلائی آنکھوں میں حیرت بھر کے پوچھا تھا۔

”وہ آپ کے پیا ہیں اور ابا میرے ابا ہیں۔“ ٹھیک ہے وہ آپ سے ملنے آئیں گے تو آپ کے لیے Toys بھی لے کر آئیں گے۔“ میں نے پیار سے اسے سمجھایا تھا کہ چاکلے میرے سوا بال کی اسکرین پر کوئی انجمن نہیں کر رہا ہوا تھا۔ کون ہو سکتا ہے؟“ یہ سوچتے ہوئے میں نے کال ریسیو کی تھی۔

دوسری طرف انوار احمد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو علیہ! میری موجودہ بیوی ابھی نہیں ہے بہت سخت اور کمزور ہے۔ وہ تمہاری بہت اچھی نہیں۔“ بلینز میری زندگی میں لوٹ آئے تھے اب اپنے بچے مہربان اور تمہارے ساتھ رہنا ہے۔ میں معافی مانگتا ہوں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ وہ تمام حتمیں جو میں نے سر کھینچا جاگ ہو گئی تھیں۔“

میں نے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ ”انوار احمد! میں تمہارے بچے سے تمہیں ضرور ملے دوں گی اور رہی بات تمہاری اور میری تو ایسا ممکن نہیں ہے اور ہاں تم نے کہا کہ تم اپنی بیوی سے خوش نہیں ہو تھے تو تمہاری پانچ عدد اولادوں سے انکار ہو گیا۔ تم مردوں کا بھی جواب نہیں اپنی بیوی پر نہیں مگر اولاد کی

اُس ہی بیوی سے خوب پیدا کرتے ہو۔ میں اب آٹھ سو سال اکیلے رہا ہوں اب مجھے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ تم نے مجھے اس قدر جہانی اذیت دی اور abuse کیا کہ مردوں کی

ذات سے میرا اعتبار ہی ختم کر دیا۔ میرا تو سب کچھ تمہارا تھا اگر تم مجھے پکار کر تے تو میں تم پر اپنا جسم و جان سب قربان کر دیتی۔ تم پر اب اعتبار کیسے کروں؟ ہر حال تمہارا بیٹا مہربان قانوناً باشرعاً اب نو سال کا ہونے والا ہے وہ تم سے مل سکتا ہے اور ہاں انوار احمد! اللہ نے تم کو پانچ بیٹیاں امتحان کے طور پر دی ہیں۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔“ یہ

کہہ کر میں نے فون بند کر دیا تھا۔

.....

انوار احمد عوامی حکم کے تحت اپنے بیٹے مہربان سے سینے میں دھار پلٹے لگا۔ مجھے سینے سے ہاتھ چلا تھا کہ اس نے داڑھی رکھی ہے اور پچھ لوگوں سے یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ بدیا گیا ہے۔ ایک دن ملاقات کے بعد وہ مجھے کچھ پھوٹے آقا کیٹ میں

.....

.....

”غربت.....“ ایک سرد آدہ ماہ لگتا ہے کھینچا اور اس کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کے احساسات کے عکس ہیں جن کے بکڑنے کے جیسے وہ ماضی کے ہیروں کے جیسے دوڑ رہی ہے۔ کس منظر میں رکے اور کسے چھوڑ دے فیصلہ نہیں کر پائی۔

”غالب آپ احتیاط سے کام لے رہی ہیں؟“ منظروں کے چٹاؤ کے فیصلوں میں ابھی ہوئی ہیں؟“ سائز نے تادیب خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد کہا۔

”شاید آپ صحیح کہتے ہیں، ایک کھینے والے کی نظر اتنی ہی گہری ہونی چاہیے۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد کہہ رہی تھی۔

”دنا سے طوائفوں کو بھی ڈر لگتا ہے؟“

”ڈر..... عورت کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ حکم میں یا بدی میں زندگی تیرا اور زور یہ لوٹ رہی ہیں بدی باندی گئی۔ ہزاروں طرح کی زنجیریں پہنائی گئیں اور وہ جتنی توڑی جاتی ہے اتنی ہی پھر بھادی جاتی ہیں اس حد تک کہ جب وہ پوری طرح آزاد ہو جائے گی تب بھی اس احساس سے بچنا نہ پڑا اس کے کیڑ زنجیریں اس کی تنہی گہری ریت اور سما کی دہلی میں بس مجھ وقت گزرنے کے بعد بھرپور ہوا سنا رہا ہے تو یوں سمجھو طوائف کے پاس شریف اور بارگاہیوں جیسی عزت اور اس کے ٹھو جانے کے ڈر بیلے ہی نہ ہو براں ڈر کا احساس عورت کے وجود میں ہمیشہ کنڈلی مارے بٹھا رہا ہے۔ کیا طوائف کو عورت نہ سمجھتے ہے وہ عورت نہیں رہتی؟“

”ہاں تو یہ تو اتنی گہری باتیں رہاں کہ سے سیکھ گئی؟ میں نے تو تجھے ہمیشہ منہ جڑا قسم کی لایا اور قس کا رو باری گشتگو کرتے ہی دیکھا ہے؟“ نفرت نے قدر سے سنجیدگی سے کہا۔

”تیرا دوست قلمی ہے، لکھتا ہے اور حکیم کے گھر

کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر اس بڑے لکھے آدمی کی محبت میں بیٹھنے سے کچھ قلمی ہو گئی..... مگر تو لگتا ہے دیوار کے ساتھ لگا پتھر ہے جو دیوار میں نہیں بن سکا وہی پتھر کا پتھر رہا ہے۔“

”آپ دونوں آپسی گفتگو چھوڑیں اور آپ باہر لگتا اپنی کہانی کو دہرے سے شروع کر رہی ہیں جہاں سے چھوڑی تھی۔“ سائز کو لگا دوں پھر بکھارنے نہ لگیں کہیں۔

”کہاں سے چھوڑی تھی؟“ وہ کچھ عجیب سی مسکراہٹ سے بولی۔

”آپ فیصل کے گھر نہیں آؤ وہ پھر اکیلا تھا۔“ سائز نے اس فضا کو دانتا اپنے لیے کی گھیرتا ہے مزید لہر بناتا رہا۔

”ایک دفعہ تو قلمی تھی مگر مجھے لگا کہ پار بار بج نہ پاؤں گی یہ وقت مجھ پر آتا ہی رہے گا اور کبھی نہ کبھی وہ شکاری میرے پر بوج ہی ڈالے گا بس یہ سوچ تھی جس نے مجھے آغا خان طواف بنا دیا اور جگ پوچھو سائز۔ طواف بھی عورت ہے اسے صرف سوچ کی برنگی نے ہی طوائف بنایا ہے۔“ سائز چپ رہا۔ وہ ماہ لگتا ہوئے گا زیادہ سوچ دینا چاہتا تھا۔

”پھر میں گھر میں داخل ہوئی سوچوں کی پینٹلی نے ایک ایسی جست میں مضبوط عورت کا روپ دھار کر گلیا کہ میں نے اس ملاقات کو خود طے کیا اور کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک لے جاسکتی ہوں بس پھر فیصل کو کچھ سے قلموں کی طرح زور ڈالنی کر کے میری عزت کو لٹنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اسے اپنا ماحول اور اپنی گرم جوشی دینی کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈیر کر دیتی تھی۔ یہی تھی میرے طوائف بننے کی ابتدا..... یہ حد دلا دینا تیرا اور خوشامیادوں کی دنیا میں لے جانی کہ میں بہت

جلد اس کی سب خواہشیں پوری کر دوں گی مگر یہ آدمی اپنی عزت و عصمت بھی بڑے طوفانوں سے زور دے گا۔ بڑے غدا ہتے جن سے میں نے ثواب کمانے بہت سے روپے مجھے فیصل سے مل جاتے تھے بس یوں سمجھو کہ جتنی قیمت لے رہی تھی اتنے ہی مزے لے رہی تھی۔“

سائز کا دل چاہا کہ وہ ماہ لگتا ہے پوچھ کر اس وقت بھی اس طرح طوائفوں کی طرح سوچتی تھی اور پھر اسے لگا کہ ماہ لگتا ہے اس کی یہ سوچ معاذ پر دہلی ہے۔

”تم سوچے ہو گے کہ ایک نوخیز دو شیر و جس کا وجود خواہوں اور پھنوں سے لہا بہر اونا چاہیے وہ سنوں جیسی لو کی اتنی بازار یا باتیں بھی سوچ سکتی ہے تو تم غلط ہیں سوچنے میں ایسا باتیں اس وقت نہیں سوچتی تھیں اس وقت تو میرے ہر طرح فیصل کو اس بات پر ناک کر تھی کہ وہ میرے جسم کو لٹنے کے بجائے میرے من کے مندر میں دیوتا بن کے بیٹھ جائے۔ میں ساری عمر اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی۔ کہتے ہیں محبت خورد پرورے کی طرح آپ ہی آپ جنم لیتی ہے اور خورد ہی دل کی زمین میں چپ چاپ آگئی ہے۔ بندہ نہ چاہے بھی پوری زبردستی اور زور مٹائی ہے تاہم درخت جتنی چلی جاتی ہے جیسے وہ غالب نے کہا ہے تاکہ

”عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگنے نہ لگے اور بھرتے نہ دے“

”فائیں! ایسی بحثیں کہ خوش نصیب لڑکیوں کا مقدر بنتی ہیں؟ میں تو اپنی ضرورت کی مٹی میں زور زبردستی سے محبت کو بند کرنے کی اوجیز میں تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ فیصل مجھ کو مال سمجھ کے ڈلوئے بلکہ عزت سے اپنے دل میں اور مگر میں جلد دے اس سوچ کو دن رات اپنا پو پاتی اور فیصل کی

ہر طرح کی خستہوں کے باوجود اسے محبت کے رستے پر چلنے کی ترغیبیں دیتی۔ ہر روز جب وہ ملتا تھا سب اس سے ایسے سوالات کرتی کہ وہ مجھے اکیلے میں یاد کرتا ہے؟ میں اس کے خواہوں میں آتی ہوں یا نہیں اور میرے بارے میں اس کی سوچیں کیا ہیں؟ اس کی راتوں کی تینداڑی کہ نہیں؟ ایک مہوہم کی امید پر جانے کتنی ہی بار میں نے فیصل سے ایسے سوالات کیے مگر ہر بار اس کی ہوسنا کی اور بڑھتی ہوئی دست دازنی ہی میرا نصیب بنتی۔ وہ بس مجھے جلد سے جلد واغدا کر کے اور پھر سستی کی رکھیں جاتا ہے پر ہی مضر نظر آتا۔ میں جتنا اسے پاؤں اور آرزوؤں اور باتوں بھری محبت کی داستان اور حکایتیں سناتی۔ وہ اتنا ہی مجھے دیوچ لینے کو چھتا۔ میری ہر طرح کی باتیں اس کو بھی بس یہی کہتا کہ.....

”وہ تو سب ٹھیک ہے، محبت تو میں تجھ سے ہی کرتا ہوں مگر اب تو محبت میں اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ تم کے ایک دفعہ ہی میری بات ان لے۔“

”سب شادی کے بعد اچھا لگتا ہے شادی سے پہلے ہی غلط بات ہے۔“ میں بڑی نرمی سے اس کے چہرے کو چھو کر کہتی۔ ”مگر آج سوچتی ہوں ٹھیک ہی لگتا ہے کہ آگ لگ گئے سے لگ نہیں جاتی اور لگ جائے تو اس کا بچھا نا مشکل ہے اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔“

”شادی تو میں تجھ سے کر ہی لوں گا مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن بیٹھے ہیں، پہلے ان کی ہونگی پھر کہیں جا کے میری باری آئے گی۔ دیکھ! اتنے عرصے تک مجھ سے انتظار نہیں ہوگا۔ میں تجھے چھوڑا ہوں تو تیرے جانے کے بعد بھی قسم اٹھا ہے کہ میں دہکتا رہتا ہے جیسے سمندر میں تھما کے بھی سوکھا کے سوکھا..... دیکھ! ان باتیں تو

کسی دن زبردستی وہ سب کروں گا جس کے لیے اسے پیار ہے تجھے بھار ہوں۔ میں غصہ ہو جائی اسے مار کوئے لے گا اور وہ..... نا اہل تار کی۔

سائرس نے گہری خاموشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس ایمان کے بعد پھر بہت کوشش ہو گیا کہ وہ اب بھی اسی منظر میں رہی ہو گی۔ "وہ اور سرکش ہو جاتا تو بڑی گہری اور ڈرا دینے والی سرگوشی سنائی۔"

"جو کچھ ہو گیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا میرا وعدہ ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ جواب دیتا۔

"تو کیا نہیں یقین دلاتا ہے؟ میں خوب جانتی ہوں تجھے اور تیرے وعدوں کو۔"

"تو تو نہیں مانے گی؟"

"نہیں....."

"میں یہی ہے تیری محبت..... اتنی ہی قربانی تو دے نہیں سکتی تو کیا محبت کرے گی حرافہ؟" وہ اپنی اوقات پر آ جاتا۔

"اور تو تیری محبت کیا ہے؟ بس مجھے برا دکر دینے سے کام ہے تجھے۔ جو ڈرا ہی بھی غلطی ہو تو میں کسی کو سزا دھانے لائن نہیں رہوں گی۔"

"تو پھر ٹھیک میں وہ کروں گا جو تجھے ٹھیک لگتا ہے۔"

"زبردستی کرے گا تو میں جنوں کی جلاؤں گی....."

"اول تو میں تجھے چیتنے چلائے دوں گا نہیں جو تو پھر بھی نہ مانی تو سمجھ لے اس میں نقصان تو سراسر تیرا ہی ہے۔ مسئلے والے تجھے ہی برا بھلا نہیں کہے۔" وہ خفا سے بولا۔

"اور تو ساف بچ جائے گا؟"

"اور نہیں تو کیا؟ کہہ دوں گا؟ بچے کو اکیلا دیکھ کر

خود ہی سر ہو رہی تھی۔"

"ایسے بولے گا بے شرم؟ اور تو بچہ ہے؟" ہنسنا چاہتی تھی پر ہنس نہ سکی۔

"اس سے بھی زیادہ کہ تو کب سے مجھ سے پیسے لٹھ رہی ہے اور آج پیسے نہیں دے تو لگی کر گرنے؟" میں تجب بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی اور مجھے لگا کہ اس شیطان سے اس سے بھی زیادہ کی توقع کرنی چاہیے۔"

"اب ہم دونوں میں یہ کشمکش کئی دنوں تک چلی۔ اس مسئلے میں ایسی عورت دو چار ہی نہیں جس کے خاندان کروں سے باہر کرانے گئے تھے اور انہیں گھبنے لپے بنائے اور خریداری کرنے کے علاوہ کوئی دود کا کام ہی نہیں تھا۔" یقین باجی کے علاوہ باقی کی عورتیں میں شہر میں درزیوں سے سلوائی تھیں یا ان کی کپڑے سینے والیاں موجود تھیں جو پیسہ دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کے خرچ کرتی تھیں وہ سال میں تین چار بار ہی کپڑے بناتی تھیں۔ دونوں عیدوں پر یا پھر کسی کے شادی بیاہ پر۔ اب یوں چار پانچ منگوں سے تو ہمارا کر چل نہیں تھا۔ اس طرح یقین باجی خود میری سب سے بڑی ضرورت بن چکی تھی۔

"اسے چھوڑنا میرے لیے بھی جیسے ممکن ہی نہ رہا تھا۔ کسی بھی جرات کو مجھے ایسی گھبرا دینے والی سوچوں کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی تو میں بڑے دل سے دعا کرتی تھی کہ اللہ کرے فیمل کا ایک سیڈنٹ ہو جائے اور وہ مر جائے۔ یا اسے بھی میرے ابا کی طرح پولیس والے اٹھالے جائیں اور مار مار کے جان سے مار دیں کیونکہ میرے اور کھر کے بیچ جو پیٹ لگا تھا اس کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ منوں فیمل ہی تھا حالانکہ جتنی بار وہ مجھے چھو چکا تھا ان لوگوں اور ان منظر کو یاد کرنے کے بعد میرے دل میں ہمیشہ بھی ابھی ایک خیال آتا تھا کہ اب میں

کسی اور کے لائق نہیں رہی۔ جب بھی بڑھری شادی ہی حرام خور سے ہو کر ہر طرح کے بہت کڑے میں بھی نہ کام لگی اور مجھے کوئی راستہ بھائی نہ دیتا تھا کہ آخر کھر کی برکت جو دو زخ بن کے ہر وقت دھکا کرتی تھی اسے کسے بھجاؤں؟ اسی طرح کی سوچوں میں جانے کو ٹوٹی ہوئی چار پائی پے نیند آ جاتی اور پھر جب اس کا مطالبہ بعد سے پڑھتا تو میں نے باجی بانیس کے کھر جانا چھوڑ دیا۔ ہفت روزہ ان کو نالافتی رہی کہ اب باجی بانیس کے پاس کام نہیں ہے پھر ایک ہفتے بعد اماں بعد ہوئی کہ میں کم سے کم چکر لگا کر پوچھ ہی آؤں۔ اماں کے اسرار پر کھر سے لگی راستے میں بھر جی سوجھی رہی کہ جاؤں گی نہیں اور اماں کے چھوٹ بول دون کی کہ کچھ نہیں لاکر کھر جب کچھ دیر یونہی خوری کرے کھر میں گئی تو اماں کے سوال نے بھنا پٹ میرا جھوٹ کھول دیا۔

"ارے..... تو؟ تو؟ خالی ہاتھ آ گئی؟ وہ لڑکا بانیس کا بھائی تجھے پوچھتا ہوا آیا تھا کہ باجی باری ہے اب تو بہت دنوں سے ان کے کھر بھانجی بھی نہیں۔" تب میں چپ رہی۔ "ارہی بولتی کیوں نہیں؟ تو نے کیا چوری کر لی جو یوں ڈری ہوئی رہتی کی طرح چپ چاپ کھڑی ہوئی ہے؟" اماں کو غصہ آئے ہی والی اٹھا۔

"کیا بولوں اماں.....؟ کپڑوں کی مزدوری پر اس کا بھائی میری عزت کی قیمت مانگتا ہے۔ بتا پھر کیسے جاؤں؟ تجھے کیا تاؤں؟" بڑی ہمت کر کے میں نے کہہ دیا۔ ماں کے جیسے کھڑے کھڑے جسم سے جان ہی نکل گئی ایک دم سکے میں آ گئی۔ مجھے بھی کچھ نہیں آیا اور کھر میں سنا رہے لگا۔

رات کو ماں دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھانے لگی کہ اب کچھ بھی کرنا کوئی بھی نہت مزدوری کر کے تم دونوں کو کھر چلانا ہے۔ ظاہر ہے وہ ابھی

چھوٹے تھے اور پندرہ سال کا تھا۔ اس پر میرا حق؟ لوری سمجھو جس کی رہی ہوگی اور سب سے آخری آخریں پانچ سال کی ہوئے کو لائی تھی۔ ان علاقوں اور گلوں میں ہلدر پیر پے پیدا ہوتے ہیں۔ اماں کے تو پھر بھی پانچ تھے اور پانچوں میں ہفتہ کی مناسب ہی تھا۔ کاش..... میں کسی طرح چار پانچ سال تک چلا چلتی تو اور ضرور کھر سنبھال لیتا مگر چلاتی کیسے غریب اور مظلن لڑکی کی عزت چور ہے پر کھر وہ گلاس ہے جو خالی ہو جائے تب بھی آس پاس سے گزرنے والا ہر شخص ایک نظر اس پر ڈالنا ضرور ہے۔ اور اور اس پر منفرج سے شام تک جانے کہاں جاتے اور شام کو کچھ نہ کچھ پیسے لے کر لوٹ آتے جس سے کسی نہ کسی طرح کم سے کم شام کا کھانا مل جاتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ایک ہوٹل پر میرا کیری کا کام کرنے لگا تھا۔ آدھے پیسے ٹھیکے دار لے لیتا اور آدھے پیسے وہ کھر لے آتا۔ کھر میری بھی چھپ چھپ کے پیتے لگا تھا جبکہ اس پر کھر صرف ایک دکان میں کام کرنے پر دوپہر کا کھانا ملتا تھا۔ بقول اس پر میرا وہ اس کا امتحان لے رہا ہے۔ ایسا عمارت بہت ہوئی تو کچھ نہ کچھ مزدوری میں ضرور ملنے لگی۔

کھر میں مظلن کم نہ ہوئی اور سب سے دونوں بھائی جن لوگوں میں اٹھتے بیٹھے تھے ان سے خراب عادتیں بھی سیکھ رہے تھے۔ اس دوران میں فیصل ایک مرتبہ پھر آیا تھا مگر ماں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد کافی برا بھلا کہہ کر ہموک دیا یوں سمجھو اماں نے میرے طوائف بننے کی نیکو کردالی۔ مجھے پوری کی پوری حاصل نہ کرنے کا دکھ ایک قسم کا انتقام بن کر فیصل کے رگ و پے میں تیرنے لگا وہ سنے سنے منصوبے بنانے لگا کہ کسے مجھے تو چھوڑ ڈالے؟ اس کی انا کو بڑی زبردست محسوس ہوتی تھی کہ

میں اسنے دن تک اس کے سامنے رہی اور وہ اپنی مراد کی بھی پابت نہ کر سکا۔

ایک روز رات کے دو بجے ہوں گے کہ ایک نہیں ایک سو برس کا نوجوان لڑکا ہمارے گھر آیا اور بولا کہ "لو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے اس پر چوری کا الزام ہے۔۔۔۔۔" اماں کے اور میرے بیروں تلے زمین نکل گئی۔ جولا کا بتانے آیا تھا وہ ہماری کڑی ہوئی حالت کا تماشا دیکھنے کو بدستور کھڑا رہا۔ میں نے اماں سے کہا۔ "میں تھانے جاؤں؟ کہیں۔۔۔۔۔"

ہم دونوں ماں بیٹیوں کے ذہنوں میں ابادالی ہاتھ واقعہ تیرکان ہو گیا۔ ہم خوف سے لرزنے لگے کہ کہیں پولیس والے انور کو بھی تشدد کر کے ماری نہ ڈالیں۔ اماں نے کہا۔ "تم گھر میں رہو میں جاتی ہوں۔"

مگر اچانک وہ لڑکا بولا۔ "خالی جی آپ فکر نہ کریں ہم لوگ انور کے دوست ہیں ہم اسے چھڑا لائیں گے۔ آپ مت چلیں۔ پولیس والے آپ سے پیسوں کا تقاضہ کریں گے۔ پھر اس نے پولیس کی رشوت خوری کے بارے میں بتایا اور یوں اماں اور میں جاتے جاتے رک گئے۔ اماں بڑی بے بسی سے اس لڑکے کی جس نے اپنا نام انور بتا تھا۔ تھیں کرنے لگیں اسے ڈھانسیں دینے لگیں کہ وہ کسی بھی طرح انور کو چھڑا لائے۔ اسی گفتگو کے درمیان میں امیر آ گیا۔ اس نے سنا تو وہ اس لڑکے کے ساتھ چلا گیا اور ہم دونوں ماں بیٹی نے سوچنے پہلے کہ پولیس کہیں امیر کو بھی نہ پکڑ لے۔

دو گھنٹے گزر گئے جب امیر بھی واپس نہ آیا تو اماں نے کہا۔ "میں جاتی ہوں زنجیاں نہیں تو بڑا اندھیر ہو جائے۔" اماں دروازے سے نکل ہی رہی تھیں کہ اکرم بھی آ گیا اور بڑے غصے اور گھبرائے ہوئے انداز میں بولا کہ "پولیس والوں نے امیر کو بھی

یہ کہہ کر پکڑ لیا ہے کہ چور کا بھائی بھی چوری ہو گا۔" جب اماں شش کھانے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آئی اور جیسے اس پر غریب عورت کے پاس بے بسی اور بھوری سے گھٹے پیچھے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر کار اکرم کے ساتھ میں چلی گئی۔ وہ مجھے مختلف گلیوں اور گھروں سے گزرا ہوتا رہا ایک ایسے علاقے میں لے آیا جہاں کچھ غیر آبادے مکانات بھی تھے اور بہت تھوڑے سے گھروں میں شاید لوگ آباد تھے۔ رات کے گھپ اندھیرے میں پوری طرح تو کچھ پتا نہ چلتا تھا اور یوں بے کہیں گھمبیں کچھ روشنی بعض گھروں میں نظر آتی تھی۔ اکرم ایک گھر کے سامنے رک کر بولا کہ یہاں اس کے چچا رہتے ہیں انہیں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ وہ اندر گیا۔ میں اس دیرانے میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔

گھروں کی ان قطاروں کے سامنے حق و حق خالی زمین پر تھی جسے تو جوان کھیلنے کو نہ تو استعمال کرتے ہوں گے۔ بہت دور ایک کھیت کی لائن میں کچھ وہندلا سا نظر آ رہا تھا۔ میں انجانہ خوف اور دوسوں سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ اس بے بسی کی لفظوں میں کون بیان کر سکتا ہے کہ میں کہیں نہیں دور اپنے دل کے اندر اس خوف سے کبھی لرز رہی تھی جو ایک لڑکی کو ہوش سنبھالنے ہی فطرت کی طرف سے عطا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ قاتل میری بے جا دگرگی کی تھی کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکتی تھی کہ میرے دونوں بھائیوں کو پولیس نے چوری کے الزام میں پکڑ لیا تھا اور صرف یہی نہیں کہ ان دونوں کو مار مار کے جان سے دھار دیا جائے گا بلکہ یہی خوف بھی میری عمر بھر نہیں سرا رہا تھا کہ امیر اور انور آتے تو ہم دونوں عورتیں اور چھوٹی بیٹیاں کی زندگی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس سے زیادہ میں کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اکرم آیا اور بولا۔

"چچا انور بلا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں تیار ہو کے چلوں گا۔ تھوڑا سادقت لگے گا۔" ناچار میں گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک تنگ سی راہداری کے داہنے ہاتھ پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا اس کا دروازہ کھلا۔ میں نے ابھی تدم ہی رکھا تھا اندر کمرہ کیا ہوا کچھ کے اس زور سے مجھے کھینچا کہ بلکہ گھٹک سے ہنتر پر پھینکا گیا کہ میرے اور ماں خطا ہو گئے۔ میرے سامنے فیصل اپنی پوری شیطانت کے ساتھ کھڑا تھا اور اس لڑکے اکرم کے علاوہ وہ اور دوست بھی تھے جنہی میں جاوید نہفندت لٹیروں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ فیصل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس کے مونہ سے موندنے ہوئے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایک ایسی فاختانہ چمک دمکی کہ وہ کچھ بھی حاصل کرنے سے پہلے سب کچھ جیت چکا تھا۔ چند لمبے تو جیسے ڈار اور خوف نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا اور اس کے بعد جیسے ہی تیزی سے میرے اوپر ماں بجال ہو گئے۔ میں ایک بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اب کوئی بھی کوڑھش میری عزت و عصمت کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی لہذا مجھے ہر طرح سے ہوش سے کام لینا ہوا۔

"اچھا تو یہ سب دریا تیرا امیر لکھا ہوا ہے؟" میں نے کسی قدر اپنے اوپر ان اور حواس متبجح کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ کھیل کھیل کے کچھ نہ کچھ سمجھ تو مجھ میں آ ہی چکی تھی۔

"اچھا ہوتا اگر تو مجھ اکیلے کی بات مان جاتی۔ اب دورے جا چار۔۔۔۔۔" وہ فٹا۔

"اب مجھے فیصلہ کرے گی کہ اگر کچھ ہوا تو وہ کس کا ہو گا؟" اس نے دوسری بار گہری اور ہنگاماتی گروش میں کہا۔ یہ سنتے ہی میں پورے وجود سے لرز گئی کہ کسی بھی طرح اس قسم کی چوہن میں کوئی بھی لڑکی اس طرح کے حالات میں پیدا ہونے والے

بچے کا سوچ کر کتنی بھی دلیر کیوں نہ ہو کمزور پر کتنی ہے اور جی پوچھو تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

"خیر ای بچہ۔۔۔۔۔ ایک کا ہو یا چار جا چار اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو اس وقت بھی حرام کاری کرنا چاہتا تھا اور اب بھی تیرا یہی ارادہ ہے اور اپنی کھٹیا چالوں سے تو نے میرے کسی کر دیا ہے نہ مجھے اب مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ صرف اتنا بتا دے میرے دلوں بمالی کہاں ہیں؟"

"وہ برابر کے کمرے میں بند پڑے ہیں تیرا کام ہو جائے پھر چھوڑ دیں گے انہیں بھی۔" فیصل مکاری اور بے کسی سے بولا۔ شیطان کیا ہوتا ہے اس رات پہلی بار میں نے دیکھا۔

"انہیں چھوڑ دے میری ماں بہت پریشان ہے۔" میں نے جیسے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ دیں گے۔۔۔۔۔ چھوڑ دیں گے۔۔۔۔۔" مجھ کی قوت بات ہے۔

"نہی بولا۔"

"آخری حلا تھا یہی ہے کہ آخری راستہ۔ وہ چاروں ایک ساتھ جتنے ہوئے ہاتھوں پر ہاتھ مارنے لگے۔

"ہم تو چار ہیں اور وہاں پورا قاتل تیرا وہ حشر کرے گا جو تو نے سوچا بھی نہ ہو گا۔" فیصل ہی اب تک میری باتوں کا جواب دے رہا تھا۔

"تم میں سے پہل کون کرے گا؟" یہ کہتے ہوئے میں جواب تک سڑک سٹ کے بیٹھی ہوئی تھی ہنتر پر نہ دراز ہو گئی تو چاروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں ہی کروں گا پہل یہ منصوبہ بھی میرا ہے اور تو مال بھی میرا ہے۔" فیصل کچھ بکھرے بولا۔

"تو؟ تو اکرم ہے اور تم دونوں کے نام کیا

ہیں؟" میں نے ان اچھی لڑکوں کی طرف دیکھا۔
"ہام پوچھ کے کیا کرے گی؟ کام سے مطلب رکھیں پوئیں والوں کو تینا جانتی ہے سالی؟"
فیصل نے ہوشیاری دکھائی۔

"دو کے نام تو معلوم ہیں جو پولیس والوں کو تینا ہوا تو تم دونوں کے نام بھی کافی ہیں۔ میں تو اس لیے پوچھتی تھی کہ....." میں جان بوجھ کر دیر

"بولیوں کی کیا کہنا جانتی ہے اور اب زیادہ یہ مدت لگا۔" فیصل کو لگا کہ میں ہوشیاری کر رہی ہوں۔
"اس لیے پوچھتی ہوں کہ میں بعد میں بھی تم

میں سے کسی ایک سے رابطہ رکھنا چاہوں گی۔"
"بڑی بے شرم ہے مجھی..... میں تو سمجھا تھا تو روئے گی کہ گزرائے گی اور ہمیں زبردستی تیرے....."

"زبردستی میں وہ مرا کہاں جو رضامندی میں ہے....." میں پوری بے شرمی سے بولی مگر کچھ ایسا تھا کہ مجھے اپنی آواز بھی اچھی لگی۔

"میں تو ان ہوں۔" ان میں سے ایک بولا جو کرم صورت اور کسی کی شکل والا تھا۔

"اور تو؟" جو ایک بچا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ سب سے خوبصورت وہی تھا خاموش طبع اور شکل سے کچھ معصوم بھی لگتا تھا۔ "میں فراز ہوں۔" ہم دوہا اتھائی بولا۔

"فراز اگر تو پہل کرے تو مجھے بڑا اچھا لگے گا" باقی بعد میں آجائیں۔" ایک دھماکہ تھا جو ان چاروں کے سچ ہوا۔ سب سے زیادہ فیصل کو اس بات سے تکلف ہوئی۔

"نہیں..... نہیں..... نہیں ہو سکتا۔ تجھ پر سب سے پہلا میرا ہے۔" فیصل نے میری طرف دیکھ کر اور باقی جملہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر ادا کیا۔
"دیکھو دوستو..... سچ ہے نا؟"

"یازدہ فراز کے ساتھ پہلے جانا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے ہم بعد میں....." مجھے بھی دوسرا نمبر تیرا ہی ہو گا۔ مگر اتنا کیوں ہے؟ کیوں فراز؟" کرم نے کہا۔

اس سے پہلے کہ فیصل کچھ بولے فراز بولا۔
"مگر ٹھیک کہتا ہے۔"
"مگر یہ اصول کی خلاف ورزی ہے جس کا مال ہو پہلا تو بھی اس کا ہوتا ہے۔" فیصل غلغلایا۔

"میں تیرے باپ کا مال ہوں جو تیرا پہلا ہو گا؟" میں نے جلتی پر تیل ڈالا۔ "سب برابر ہیں۔"

"فراز..... جو تو نے پہل نہ کی تو میں تجھے نامرد سمجھوں گی....."

اب چاروں میں تو ٹھکارہ ہونے لگی، اکرم اور فراز ایک طرف ہو گئے اور تو از اور فیصل ایک طرف۔ کافی دیر تک چاروں اپنے اپنے طریقے سے کجواس کرتے رہے اور میں اپنی عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتی رہی۔

"اس..... کتنا نے بڑی ہوشیاری سے ہم چاروں میں جھگڑا کر دیا ہے اور اب یہ ہم چاروں کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔" فیصل نے کہا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ فیصل ایسی صورت حال میں اس سارے قصبے کی ختم کر دے گا۔ چاروں کمرے سے باہر چلے گئے مگر میں جانتی تھی مجھے ہماک نظر کا مونیج چھری نہیں لے گا اس لیے ان لوگوں کے کسی فیصلے تک پہنچنے تک میں دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد صرف فراز اکاکیا میرے والے کمرے میں داخل ہوا مگر بولا کچھ نہیں صرف میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میں اپنے ہاتھوں کو پیچھے رکھ دیاں لے کر جانا چاہتی تھی مگر

یہاں صورت میں ممکن تھا مجھ میں کچھ بھی کر دوں کہ کوئی ایسی حرکت نہ کروں جس سے چاروں میں ہر

ایک ہو جائے۔
"تو نے نہیں لڑانے کے لیے یہ حرکت کی ہے؟" کچھ دیر بعد وہ میرے سے بولا۔
"نہیں..... مجھے تو تو اچھا لگا ہے۔"
"مگر فیصل نہیں مانتا۔" وہ بولا۔

اور پھر لمبے کے ہزاروں جیسے میں شاید میں نے وہ فیصل کا جو فراز سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ میں ایک عورت ہوں اور عورت ایسی مخلوق ہے جو آخری سانس تک اپنی خواہشوں کی جنگ لڑتی ہے۔ میں فیصل کی اس کیفی اور شیطانی حرکت کی اسے سزا دینا چاہتی تھی اور اس وقت میری سب سے بڑی اور آخری خواہش یہ تھی کہ فیصل جیت کے مجھ کی ہار جائے۔ اس سارے منصوبے کو میں مٹی ہو کر بھی خاک میں ملا دوں۔ میرا سب کچھ نلنے سے بچا نہیں سکا تھا۔ میں ہر طرح سے ہار رہی تھی مگر اپنی اس ہار سے مجھ کی فیصل کو جیتنے نہ دینا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ساری زندگی کو اس کی اور شکست میں سلا کر رہے کہ میری عصمت کو سب سے پہلے اس کی مراد کا نہیں دے گا۔ فراز سے مجھے نہ عزت ہوئی نہ ہی وہ اس قابل تھا کہ میں یوں پہلی کی نظر میں اس پر اپنی عزت ملا دیتی..... کسی وہ ان چاروں میں بہتر تھا اور میں اس وقت ڈوبے ہوئے تھی اپنی مرئی سے اپنے ڈوبنے والے کا بچا کر رہی تھی یہ بالکل ایسا ہی تھا جسے کوئی خود کشی کرنا چاہتا تھا مگر مرنے کے لیے کسی بھی اختیار کا انتخاب اس کی اس وقت تک کی اپنی مرضی کی جب تک کہ وہ زندہ ہو..... میں فراز پر اس کی سوچ سے مجھے پہلے چھٹی تھی..... "اکتا کہہ رہا تھا یہی طرح اپنے گے اور سانسز کو لگا کر وہ کم سے کم اس لیے میں طوائف نہیں ہوں۔" جیسے فہرت سانسز روکے یہ سن رہا تھا اور اب اس کی سانسیں دفعتاً بحال

ہو گئے۔
"فراز جیسے بے خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارنٹی کی ایکٹنگ بھی کرنا چاہی کہ ایک فیصل اور اکرم دعوئے ہونے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مجھ کو فیصل کا خون ہی کھول اٹھا۔" میں نے آؤ دیکھا تھا اور ایک دور کا لمحہ فراز کے منہ پر بڑ دیا۔ فراز کب یہ برداشت کرنے والا تھا وہ بھی میرا ہی پر اثر آیا۔ ویسے بھی فراز زیادہ جیمس اور طاقتور دکتا تھا۔ اوپر سے اکرم بھی سچ بچاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پھڑپھڑا تھا اور فراز کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ لمحوں میں تو از آ گیا جو فیصل سے زیادہ قریب تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھناتی ہو چکی تھی اور اب وہ ہاتھ کاٹنے سے بے نصیب رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلہ تو چکا دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا اہتمام یہ کہ فراز نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل زلیخا (ماہا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ جگہ بھی جو کچھ فراز اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہذا فیصل کو وہاں سے ذمہ چاہنے کتنے کی طرح خوار اور نامراد وہاں لوٹنا پڑا۔ قدرت کے عجیبے نالے..... ہونا کیا تھا ہوا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور امین کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فراز نے انہیں رہا کیا تھا۔ صرف اکرم اور فراز تھے اور کالی سیاہ رات دانت کھگے اگلاں کی مار کی ایک لڑکی کو کوس لینے پر آمادہ تھی۔

ماہا تھا ایک مہر مجر بہاں پائی گئی اور اس نے

ہو گئے۔
"فراز جیسے بے خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارنٹی کی ایکٹنگ بھی کرنا چاہی کہ ایک فیصل اور اکرم دعوئے ہونے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مجھ کو فیصل کا خون ہی کھول اٹھا۔" میں نے آؤ دیکھا تھا اور ایک دور کا لمحہ فراز کے منہ پر بڑ دیا۔ فراز کب یہ برداشت کرنے والا تھا وہ بھی میرا ہی پر اثر آیا۔ ویسے بھی فراز زیادہ جیمس اور طاقتور دکتا تھا۔ اوپر سے اکرم بھی سچ بچاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پھڑپھڑا تھا اور فراز کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ لمحوں میں تو از آ گیا جو فیصل سے زیادہ قریب تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھناتی ہو چکی تھی اور اب وہ ہاتھ کاٹنے سے بے نصیب رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلہ تو چکا دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا اہتمام یہ کہ فراز نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل زلیخا (ماہا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ جگہ بھی جو کچھ فراز اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہذا فیصل کو وہاں سے ذمہ چاہنے کتنے کی طرح خوار اور نامراد وہاں لوٹنا پڑا۔ قدرت کے عجیبے نالے..... ہونا کیا تھا ہوا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور امین کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فراز نے انہیں رہا کیا تھا۔ صرف اکرم اور فراز تھے اور کالی سیاہ رات دانت کھگے اگلاں کی مار کی ایک لڑکی کو کوس لینے پر آمادہ تھی۔

ماہا تھا ایک مہر مجر بہاں پائی گئی اور اس نے

ہو گئے۔

فراز جیسے بے خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارنٹی کی ایکٹنگ بھی کرنا چاہی کہ ایک فیصل اور اکرم دعوئے ہونے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مجھ کو فیصل کا خون ہی کھول اٹھا۔

میں نے آؤ دیکھا تھا اور ایک دور کا لمحہ فراز کے منہ پر بڑ دیا۔ فراز کب یہ برداشت کرنے والا تھا وہ بھی میرا ہی پر اثر آیا۔ ویسے بھی فراز زیادہ جیمس اور طاقتور دکتا تھا۔ اوپر سے اکرم بھی سچ بچاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پھڑپھڑا تھا اور فراز کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ لمحوں میں تو از آ گیا جو فیصل سے زیادہ قریب تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھناتی ہو چکی تھی اور اب وہ ہاتھ کاٹنے سے بے نصیب رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلہ تو چکا دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا اہتمام یہ کہ فراز نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل زلیخا (ماہا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ جگہ بھی جو کچھ فراز اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہذا فیصل کو وہاں سے ذمہ چاہنے کتنے کی طرح خوار اور نامراد وہاں لوٹنا پڑا۔ قدرت کے عجیبے نالے..... ہونا کیا تھا ہوا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور امین کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فراز نے انہیں رہا کیا تھا۔ صرف اکرم اور فراز تھے اور کالی سیاہ رات دانت کھگے اگلاں کی مار کی ایک لڑکی کو کوس لینے پر آمادہ تھی۔

ماہا تھا ایک مہر مجر بہاں پائی گئی اور اس نے

ہو گئے۔

فراز جیسے بے خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارنٹی کی ایکٹنگ بھی کرنا چاہی کہ ایک فیصل اور اکرم دعوئے ہونے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مجھ کو فیصل کا خون ہی کھول اٹھا۔

میں نے آؤ دیکھا تھا اور ایک دور کا لمحہ فراز کے منہ پر بڑ دیا۔ فراز کب یہ برداشت کرنے والا تھا وہ بھی میرا ہی پر اثر آیا۔ ویسے بھی فراز زیادہ جیمس اور طاقتور دکتا تھا۔ اوپر سے اکرم بھی سچ بچاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پھڑپھڑا تھا اور فراز کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ لمحوں میں تو از آ گیا جو فیصل سے زیادہ قریب تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھناتی ہو چکی تھی اور اب وہ ہاتھ کاٹنے سے بے نصیب رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلہ تو چکا دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا اہتمام یہ کہ فراز نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل زلیخا (ماہا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ جگہ بھی جو کچھ فراز اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہذا فیصل کو وہاں سے ذمہ چاہنے کتنے کی طرح خوار اور نامراد وہاں لوٹنا پڑا۔ قدرت کے عجیبے نالے..... ہونا کیا تھا ہوا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور امین کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فراز نے انہیں رہا کیا تھا۔ صرف اکرم اور فراز تھے اور کالی سیاہ رات دانت کھگے اگلاں کی مار کی ایک لڑکی کو کوس لینے پر آمادہ تھی۔

ماہا تھا ایک مہر مجر بہاں پائی گئی اور اس نے



یہ آرزو تھی، بنانا میں کمر محبت میں
لا جو ہوتا کوئی ہم سفر محبت میں

غریب شہر کے پاس اب کچھ نہیں باقی
نثار کر دیے دل و جان محبت میں

ہمیشہ دور رہے جو در محبت سے
دکھائی دیجئے ہیں وہ معتبر محبت میں

وہ مجھ سے دور ہے، ہے صلا محبت کا
اُسے میں نے چاہا کیا محبت میں

وہ جو کہ گردشِ دوراں میں ہو گھر از آباد
اُسے نصیب سے ملتا ہے کمر محبت میں

زاہد علی جے پوری

کشادہ کرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں تاہم تربیت
دو تین سب ہی کی ایک جیسی ہے۔ فرش پر حسب
استطاعت قاتین اور دریاں خامسے پرانے ہو چکے
ہیں۔ اگر بہت قریب سے محسوس کیا جائے تو ان میں
سے بدبو کی اٹھ اٹھ کر سانسوں میں اترتی ہوئی بھی
محسوس ہوتی ہیں۔ دیوار کے برابر برابر گاؤں کی گلی
ہوتے ہیں۔ ان کیوں کی حالت بھی کہیں گلی جلی
لاوار دہکتی ہے اور کہیں نئے سے خلاف چڑھا کر نہیں
قابلِ برداشت بنادیا گیا ہے۔ محبت سے سناٹا ورودہ
پٹکے لگے ہوئے ہیں اور بعض کمروں میں لمبے ہاتھ
روم بھی ہیں۔ قاتینوں اور درویشوں پر پاؤں دان اناکال
دان اور ایش ٹرے بھی دھرے ہیں تقریباً تمام ہی
طوائفیں پان اور سرگت کا شوق کیتی ہیں، بعض
شراب بھی پیتی ہیں جو کہیں جیتیں وہ اس کا خرچ
برداشت نہیں کر سکتیں، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی
شریف آدمی اس لیے شریف نہیں کہ خدا خلقی اور
عاقبت کی فکر میں مبتلا ہے بلکہ اس کی شرافت کی واحد
وجہ یہ ہے کہ اسے گناہ کرنے کے مواقع اور سائل
مہیا نہیں ہیں ایسے میں شرافت خود بخود دایے آدمی کی
چادر میں جانی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ طوائفوں
میں زیادہ تر اسکی ہیں جنہیں اپنے بٹے پر قابو چکا
ہے لہذا وہ بٹے کے بعد بھی پوری دھندلے سے
گفت و شنید کرنے پر قادر ہیں۔ یہاں موجود
طوائفوں کے بیوسات ٹپوں والی طوائفوں کے برابر
ہوتے نہیں ہوتے، ہو بھی نہیں سکتے۔ اس ذرا سوچئے
باجوری نے دیو داس میں جو طوائف والے کردار
میں بیوسات پڑے وہ یہاں کی طوائف خواب میں بھی
نہیں سو سکتی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جتنے پیسے باجوری
نے ان بیوسات کو سبنے کے لیے ادا کئے تھے؟
بعض ناچنے والیاں اس روٹین ورک سے کسی
قدر اکتی ہوئی بھی لگتی ہیں کہ وہ ناؤ سنگھار کو زیادہ

افسان کو جیتے چلے جانے پر مجبور کیا ہے دور نہ ہزاروں
سال سے زندگی ایک جیسے مشغلوں کی اسکی داستان
بن کر رہ گئی ہے جس سے اب شدید یوریت ہوئے
لگی ہے۔

اب صد دونوں ماہ لقا کے پاس سے نکل کر پھر کسی
منظر کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ ایک کمرے میں ایک
مونی تازی پھینکا رتی شکل والی عورت بیٹھی تھی۔
نہرت جھک کے سلام کرتا ہوا چھپاک سے اس
کمرے میں جا گھسا۔ عورت جو مختصر راحت کے
سے اعزاز سے بھی ذرا بھی ٹس سے کس نہ ہوئی جیسے
وہ نہرت کی اوقات پہلے سے جانتی تھی کہ جیسے ہی
اس نے سانس کو دیکھا تو کچھ مل ہوئی اس کے
بے پیکر وجود میں۔

”ارے؟“ وہ آواز نہرت میاں.....“ کی پھر
سانس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ خوب دھندلے مشغول
کیا۔ چلو اٹھ جا۔“ کھنکھوندہ کی کام کا نہیں ہوتا، پھر
ٹھکانے کے نام بھی۔ ہادی او..... تھیں..... لے
تیری پانی تو آئی۔

سانس اور نہرت دونوں بری طرح چونکے،
پہلے دھندلے والی بات پر پھر یقین پر نہرت
غریب کو اس لیے پناہ بھاری وزن والی عورت نے
سنبھالنا کوشش کیا نہ ہی اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی
مہلت دی۔ سانس کو لگا کر کہیں تو وہ بھی کیا ہے
کہیں کب نہ خنک ہوئی بلکہ خوش فہمی میں یہ پہاڑی خاتون
بتلا چکی تھیں کہ وہ کوئی پارٹی ہے، اسکی کوئی بات نہیں
تھی، جس پر سیدہ دوری اور پرانی دھرائی جانے لگی تھیں
سے فیک لگائے یہ پرانے دھڑوں کی ماہ لقا تھی، کبھی
پڑی تھی اس سے کچھ رینگے سے ایک دھڑا اور
گھر سے نکلے رگوں والا چچا ہوا پردہ پڑا تھا اور اس
کے پیچھے سے تھیں نکل کر لے والی کی۔
یہ گھر زیادہ کشادہ نہ تھا مگر بعض عمارتوں میں

غناغت پوری پوٹ پانی کی خالی کر دی۔ میں اور
نہرت اس کے پھر سے کہانی شروع کرنے کی امید
لگائے بہت کوشش کرتے کہ وہ ادھر ادھر دیکھ کر ایک دم
چونکی۔

”اودھ..... میرے رہا.....! کتنا کون وقت ہو
گیا؟“ دھندلے کا تاہم سر پر ان کھڑا ہوا اور مٹی ٹوکوں
کی باتوں میں مجھے پتا نہ چلا۔ چلو بھاگو یہاں
سے.....“

”مگر ماہ لقا.....! ابھی تو یہ پتا ہی نہ چلا کہ تم
طوائف کیسے بنیں؟ کہانی ادھوری ہی تھیں بلکہ پوری
طرح نشہ ہے۔ اس طرح ذرا بھی بات نہ بنے
گی۔“ سانس نے سخت یابی سے کہا۔

”پر راتیں باؤ میں تمہارے لیے اپنا دھندلہ
خراب نہیں کر سکتی؟“

”آج چھٹی کر لو؟“ نہرت یہ جگت بولا۔
”واہ..... کس آسانی سے کہہ دیا، چھٹی کر لو؟“

پورے دو ہزار کا نقصان ہوگا۔ پہلے سے جنگ ہے
کاٹی ہوئے کی ذمہ دھن انک ہوگا۔ نہ پانا نہ نہرین
نہیں ہے۔ ”وہ ایک دم سے ہی صرف چیخ مچی تھیں
ہوئی بلکہ انی الفور طوائف اور دھندلہ کرنے والی
خوش عورت بن گئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس سے
ہزار تو کیا ایک ہزار بھی نہیں دے سکتے تھے۔

”اچھا تو پھر کس آواز دے گی؟“ وہ بھی کہنے کی جگہ
میں بہت تھیں۔ ”وہ کسمپانی ایک کاٹلی سے بھری
منہ کھول کے اس نے اٹھائی لی اور اٹھ کھڑی
ہوئی۔

”ٹھیک ہے، ہم کل آئیں گے۔“ سانس نے
مجھوس کیا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چادر بھی نہیں
ساتھ ہی سانس نے یہ بھی محسوس کیا کہ طوائفوں کے
پاس گھر یووتوں کو چھوڑنے کے آئے والے لوگ ان
کی ایسی ہی اداؤں پر جان دیتے ہیں۔ محسن سے ہی

عزیم

گزارش آسمان برا

امیر آزاد خیال

جن کو ہمارا بن توفیر و شرف بخشا ہے
وہ رہنم ہیں انہیں طلعہ رسوائی دے

نورانی لبائے میں ملیں شیطان کے کارندوں کا شرم ناک ماجرا

تنگی اور بدی خیر اور شران دونوں ہی کا دھوڑ
روزِ ازل سے ہے اور روزِ ابد تک جاری رہے
گا۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نیکی پھیلانے
لیے جہنم کے دیکھے والا دُکھ دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں
کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ
کچھ شیطان صفت انسانوں نے خواہشات کو بھڑکا کر
شیطان ملعون کے کام کو آسان بنا رکھا ہے اور یہ کم



کچھ بچہ کو مٹھنے ہیں۔ یہ دکان کوئی بھی اس لیے
ہے۔ اس کے لیے میں کوئی جذبات نہ رکھتا ہوں
فیصل طوائف بن چکی تھی یا اسل ریڈی تھی
غریب.....

”نصرت..... تم نے سمجھا یا نہیں یا پہلی بار آ
ہے تمہارا گاہک؟ مگر یہ کون سے سوال ہیں پوچھنے
والے؟“ موٹی نے قدرے برداشت کا مظاہرہ
کیا۔

”اوسے پیسہ لٹاؤ، یہ اس طرح کا گاہک نہیں
ہے۔ یہ تو رانر ہے۔ طوائفوں کی زندگی پر کتب لکھ رہا
ہے۔ جانا چاہتا ہے کہ کوئی بھی عورت طوائف کیسے
بنتی ہے؟“

”چل گھوڑے..... خدائی خوار..... کھنکھو
پتیدی کے..... کم بخت..... میں بھی آج تو کسی کوئی
گاہک پکڑ لایا۔ پتو“ سردار کا مٹ خور ہے۔
سات گھڑی کی آئے تھے پر..... کم بخت نے منہ کا
ڈانٹ ہی کیسلا کر دیا۔ چل پتیس..... کرے میں
جا..... خواہ مخواہ تجھے بھی تکلیف دی۔ آدی بچا پتے
کی صلاحیت بھی کم بخت ہو جاتی ہے جولا کا پردہ
آٹھوں پر آن کرے۔“ موٹی بے تکان اور نام
اسٹاپ بولے چلی گئی۔ بیٹیس اٹھ کے جانے لگی۔
سائرس اور نصرت بھی اٹھ کے کافی قریب ہو چکی
تھی یہ منظر کچھ یوں تھا کہ بیٹیس پردہ سر کا
غزاپ ہوئے والی تھیں اور سائرس جبکہ سر جوتے
پہن رہا تھا۔ نصرت گل ساموئی بے عروت کو دیکھنے
میں بڑی تھا۔ اسی حالت میں سائرس نے کہا۔
”آپ فیصل کو چاہتی ہیں؟“ بیٹیس ایک غیر معمولی
حیرت لیے واپسی کے لیے مڑی اور سائرس نے
اسے جس سے دیکھا۔ وقت کی طمانی ردا دن ہلنے
لگیں۔

(جاری ہے)

دقت نہیں دیتی۔ جس وقت آپ پہلی منزل پر پہنچتے
ہیں تو وہاں ہاں اسی طرح شے کے ٹوکھوں میں
ٹوٹوں کی گھنٹا بجی ہوئی اور بجتی ہوئی گیس کی پیسے
پڑاؤں مار دیکھ کر اچھی میں پرائز پاؤں کا کرتے تھے
شاید اب بھی بکتے ہوں۔ ٹوٹوں کا بکنا کتنا عجیب ہے
یہ تصور کہ ہر ہفتہ ٹوٹوں سے خریدی جاسکتی ہے مگر
یہاں تو ٹوٹ بکتے ہیں۔ اس بازار کی ہر چیز ہی
پکاؤ ہے ٹوٹوں کے بکتے سے یہ مطلب ہے کہ جو
تمنا میں ہزار اور پانچ سو کے ٹوٹ لاتے ہیں وہ
ظاہر ہے ہزار اور پانچ سو کے ٹوٹ ان عام
طوائفوں پر ہمارا تو نہیں سکتے اور میرے کی تو بہت
بہتری ہے کہ جس تک ٹوٹ نہ لائے جائیں۔ بھرا بھرا
نہیں لگا لگاؤ۔ آتش میں ہزار اور پانچ سو والے ٹوٹوں
سے 10 اور 20 والے ٹوٹوں کی گھنٹاؤں بیک میں
خریدتے ہیں اور اس دقت تک لائے رہتے ہیں
جب تک بھرا بھرا قاعدہ ختم نہیں ہو جاتا پھر تمنا میں
کے ٹوٹ اختیار نہیں ہو سکتے۔ اگر تمنا میں
ٹوٹ لائے میں بخوشی سے کام لیتے ہیں تو پوری
دھڑائی سے ہانپنے والی آٹھیں طعنہ دیتی ہے جس سے
ان کی مروا گئی اور فیاضی دونوں کو نہیں پہنچتی ہے اور وہ
زیادہ تیزی سے ہرا دھونے لگتے ہیں۔ عموماً تمنا میں
بہن بازار یا پانچ سو روپے سے زیادہ لائے کی
سکت نہیں رکھتے.....

اس پر وہ سر کا اور ہرے کپڑوں میں بیٹیس
ایک پتہ چھڑے والی عورت نمودار ہوئی اس نے
جانی والا دہ پتھر پر کھاتھا تھا خوب کشادہ تھا
ناگ تھوڑی کی سی تھی۔ وہ تسلیمات کرنی ان
کے سامنے آتی تھی۔

”وقت ہوگا آپ کے پاس؟“ سائرس
نے پوچھا۔

”بڑا عجیب سوال ہے وقت تو کہا، تو بس ہی

نے سائی جواب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

.....

میں ڈینس سوسائٹی میں ایک بڑی بیکری چلا رہا تھا۔ میرے گاؤں میں بڑے بڑے صنعت کاروں کا رو بارباری حضرات سے ملے کر ان کے گھروں کو ملاؤں میں ملاؤں تک بھی شامل تھے۔ صبح 10 بجے کے بعد صبح 10 بجے تک چونکہ گاؤں کی آمد رات کی چنانچہ اس دوران میرے پاس فرمت کے لحاظ بہت ہوتے تھے۔ اس وقت میں میرے پرانے دوست احباب اور وقت کار اکثر پیشتر کپ شپ کے لیے آ جاتے تھے۔ اس طرح فرصت کے یہ لمحات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے اور بہت سی رنگ رنگ اور دلچسپ کہانیاں بھی سننے کو مل جاتی تھیں۔ ان کہانیوں کے رادی زیادہ تر وہ گھریلو ملازمین ہوتے تھے جو اپنے مالکان کے لیے بیکری کا سامان لینے میری دکان پر آیا کرتے تھے اور مجھے فارغ کر دیکھ کر اپنے دکان سے سائے بیٹھ جاتے اور بعض اوقات دل بیلے انداز میں بھی مجھے سنا دیتے مگر صاحب کے قصے اور ان کے علیحدہ علیحدہ خلوت کے لذت انگیز واقعات بھی ٹھیک مروج لگا کر بیان کرنے سے نہیں چھوکتے تھے جن میں بڑے زیادہ تر ان کے احساسات و محرومی اور بیکریوں سے بھی چند بات کے کچھکے ہوتے تھے۔ میں ان کی باتیں توجہ سے مستحقا درستی ان لوگوں کو پاپس نہیں کیا تھا بلکہ بیشمار ان کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی کہ اس میں میرا مدد افادہ تھا کیا تو یہ کہ کہ ایسے ملازمین کہیں اور جانے کے بجائے خریداری کے لیے میری ہی دکان کا رخ کیا کرتے تھے۔ دوسرے فرصت کے اوقات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے۔ میری دکان پر اکثر آنے والوں میں سے ایک صاحب کیپٹن منصور اعجاز بھی تھے جو قریبی ایک دلا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ مرچنٹ

نیوی سے تعلق رکھتے تھے اور ان دنوں ایک غیر ملکی بحری جہاز پر بحیثیت کیپٹن خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان سے میرا تعلق صرف دکاندار اور خریدار کا سا نہیں تھا بلکہ وہ میرے دوست کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے۔ ویلے تو مرچنٹ نیوی کے ملازمین کے پاس وقت ہوتا ہی نہیں کیونکہ وہ طویل بحری سفر میں مصروف رہتے ہیں اور اس طرح وطن اور گھر سے دور ہی دور رہتے ہیں لیکن جب وہ صاحب اپنے ڈیوٹی (اداری) احکامات کے لیے sign off کرتے ہیں تو بہت طویل رخصت پر آتے ہیں۔ ٹھہرنے پہلے تو آپ کو بتا دوں کہ مرچنٹ نیوی ہوتی کیا ہے اور کیا کبھی پاکستان میں بھی اس نام کا ادارہ ہوا کرتا تھا؟ مرچنٹ نیوی ایک ایسے ادارے کو کہتے ہیں جو نہ صرف ملکی تجارت بحری جہازوں کے ذریعے کر کے ملک کی خدمت کرتا ہے بلکہ نقل و حمل کے ساتھ ساتھ اپنے خوبصورت جہازوں کے ذریعے مسافروں کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک لانے کے لیے جہازوں کے ذریعے سفر کو آسان بھی بناتا ہے۔ یہ بحری سفر لوگوں کے لیے سستے ہونے کے علاوہ بے پناہ تفریحی اور دلچسپ تجربا تھے۔ یہ بھی مہر پر ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری مرچنٹ نیوی لوگوں کو ملک کے دوسروں مشرقی اور مغربی پاکستان لانے کے لیے جہازوں کی خدمت دن رات انجام دیتی تھی۔ اس کے علاوہ حج کے زمانے میں مرچنٹ نیوی کے بحری جہاز حجاج کو کراچیاں گام اور کراچی کی بندرگاہوں سے حجاز مقدس تک پہنچانے میں بھی سرگرم رہتے تھے یوں شپنگ کی دنیا میں ہمارے وطن کا بھی ایک بڑا نام تھا۔

اوہ..... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بتانا یہ معذور تھا کہ ہمارے یہ منصور اعجاز صاحب مرچنٹ

دلا میں ان دنوں چیف آفیسر تھے کہ بنگلہ دیش کے ایک گاؤں میں ہندوستان کی طرف سے ہماری کامیابی بندرگاہ پر ہم باری کے سبب ان کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ کئی باقی دالوں کے پیچھے چھڑ گئے اور ہندوستان کے قبضے کے بعد کئی قیدی بن کر ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہنے کے بعد زمین لال کا مرمر گزار وطن واپس آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہیں دو سال کی جیل میں دی گئی تھی کہ وہ ان کی یادوں کو کھلا سکیں۔ ان دنوں وہ زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزارتے اور جنگ اور قید کے دوران پیش آنے والے دلچسپ اور عبرت ناک واقعات سناتا کرتے۔ اہمیت یہ ہے کہ ان سے تعلقات دوستی میں بدل گئے جن میں بے تکلفی کا عنصر بھی گڑھا تھا۔ ان ہی کے ایک قریبی دوست عادل بیگمانی تھے جو ان کے ساتھ ہی چیف انجینئر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ منصور اعجاز کے ذریعے مجھ سے متعارف ہوئے تھے۔ ان دنوں وہ کراچی میں قیام پا رہے تھے اور اکثر کچھ کے اوقات میں میری بیکری میں آ جاتے اور کھینچے دیکھنے میرے ساتھ گزارتے تھے۔ مگر یہ صاحب مجھے ایک آنکھ نہ بھگتتے تھے بلکہ ان کی تنگدستی صرف ان کی زبان اور عین واقعات کے گرد ہی گھومتی تھی جو انہیں پر دن ملک سفر کے دوران پیش آتے تھے اور مجھے ایسے واقعات سے نقلی کوئی وجہی نہ تھی لیکن چونکہ ہمارے ایک مخلص دوست کے دوست تھے تحریک دکاندار کی حیثیت سے بھی میں انہیں یہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ دکان پر نہ آیا کریں سو قہر دوریں بردھان دوریں کے مصداق انہیں برداشت کرتا تھا لیکن ایک دور میری برداشت کی حدوں کی اور میں بھٹ ہی پڑا۔ دراصل ان دنوں وہ روزانہ اپنی ایک نئی

سوال

وہ شام سے بادل کی آگدھ میں پھنسا کاٹل تم کیوں روتے ہو بادل.....؟ کیا!!

مجھے روتے دیکھ کر یا..... تم بھی میرے تنگی سنا سکتی ہو؟

اجالا عادل

واردات سنانے کے تھے جن کا کلب لہاب بے ہوتا تھا کہ کراچی میں سے راہ اور اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ بروز جب گھر سے باہر نکلے تو کوئی نہ کوئی طرح دار حسیہ ان سے آتی ہے اور ان کی عیاشیوں کی داستانوں میں ایک نیا اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں ان کا دن بے حد خوبصورت گزرتا ہے۔ میں آپ کو بتا چاہوں کہ اکثر مرچنٹ نیوی کے افراد چاہے وہ ایک سال تک کا وقت سمندر میں اپنے گھر پر سے دور گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چاروں اطراف سمندر اور کوئی دنیوی تک انہیں زمین اور انسانوں کی (ماسوائے جہاز پر اپنے مسافروں کے) فصل تک دیکھنے کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ان کی انفصا میں چھوٹی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جیسے ہی بندرگاہ پر گزر آغاز ہوتے ہیں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ یہ بات مجھے کیپٹن منصور اعجاز کی بار بار بتا چکے تھے۔ میرا حال میں متواتر تین دنوں سے اُن کی یہ وارداتیں سن کر میں نے زار آگیا تھا لیکن اس روز انہوں نے حدی کر دی جب انہوں نے کہا کہ کل وہ

جب کمرے نکلے تو ایک بے حد خوش اندام لڑکی نے ہاتھ دکھا کر نہیں رکھنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی انہوں نے گاڑی روکی لڑکی نے ٹیکسفی سے دروازہ کھول کر ان کے برابر کی سیٹ پر آٹھٹھی اور بولی۔ ”چلو.....“

”تمہارے پاس کوئی ٹھکانہ ہے چند خوبصورت گھٹے گزارنے کے لیے تو وہاں دور نہ چھر میں لیے جاتی ہوں۔“
انہوں نے ابھی بات یہیں تک سنائی تھی کہ ہم پھٹ پڑے۔

”چٹائی صاحب“ حد ہوگئی ہے اب بس کر بس شہر کراچی کو تو آپ نے کسی بانی کا قصہ بتا کر چٹن کر کے خاکہ لے کر کہا ہے جیسے آپ کوئی پری زاد ہیں کہ پورے شہر کی حسنا میں رات بھر آپ کے فراق میں آہیں بھرتی رکتی ہیں اور صبح ہوتے ہی اپنے آپ کو آپ کی راہوں میں سمجھانے کے لیے نکل پڑتی ہیں آپ میرے تمام اکیس شہر میں پھرا ہوئے اور یہیں بے برسے ہمیں تو جی ایسی لڑکیوں کے واسطے نہیں ہے؟“

”میاں..... ایسی لڑکیوں کو پانے کے لیے دیدہ
 بیٹا چاہیے، دیدہ بیٹا، کیا سمجھے؟“ انہوں نے میرے
 درشت لہجے کی قطعی پروا کیے بغیر میری بات درمیان
 میں ہی کاٹ دی اور ایک نادر و زگار نسخہ بتایا۔

”کیاں..... انرم میں چاہتے ہو کہ کسی شخص
نایاب کی بیٹی کو گناہ کا لوشمر کی بنی میں صرف شاہراہ
کے معروف بس اسٹاپ پر جاؤ؟ تم برس اسٹاپ پر
پان سترھ گھنٹے کا ایک ٹھکانا موجود باگس اسٹاپ کے
چند گز کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کر دو اور اٹھا
دروازا کھلا رکھو اور پھر وہ ٹھکانہ پر وہ غیب سے کیا ٹھہور
لیں؟“ یہ کہہ کر وہ ایک کارنامہ کی سرکڑ چلے
یوں آئے۔ پھر بھیسے تھے۔ خدا خدا کہ کبہ کہ بچے
گئے۔ میں تھا کہ آج آج کے ساتھ میں نے بہت

کردی اب مشکل ہی ہے کہ وہ دوبارہ میری دکان کا رخ کریں لیکن یہ میری خام خیالی تھی چوتھے ہی روز وہ اپنے کردہ وجود کے ساتھ پھر آ موجود تھے۔

”ہاں میاں..... کیسا رپا؟ ہمارا ٹوکہ؟ آزمایا؟“ فیض یاب ہوئے؟“ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر گہرا فاشیائی فرامیٰ۔ ”میاں..... شریف آدی ہو اور ہر شریف آدی بڑل ہی ہوتا ہے۔ چلو، تمہیں آج آسمان سانفختہ تے ہیں کیا یاد کرو گے۔“

وہ آسان سانسہ کراچی کی ایک پوش ہستی کے
ایک مکان کا پتہ تھا اور صاحب خانہ کا نام شاہ
صاحب تھا۔

انہوں نے کردہ اعزاز میں ایک آنکھ دھوئے
ہوئے کہا: "اس پتے پر چلے جاؤ، درخت کی ایک بار
بجاکر اور دروازے سے ہٹ کر کھڑے ہو جانا۔
جب شاہ صاحب طلب کریں تو اندر جا کر ہمارا نام
لکھنا اور پھر دیکھنا کہ عیش و نشاطِ تہارے اس شہر میں
کتنی آسانی سے دستیاب ہو جسے شہرِ پارسا کہتے
ہیں۔" اچھے، "پتھریا صاحب شاید اس روز بہت
جلدی میں اسے لیے فیوضِ جاہیں عینایت کر
کے اگلے قدموں درخت ہو گئے۔

اتفاق سے اسی وقت میرے پاس میرے ایک دوست نما گاک بھی تشریف فرمائے۔ ”کیا بک رہا تھا یہ شخص؟“ انہوں نے بیچواری صاحب کے جاتے ہی دریافت کیا۔ ہم نے الف سے ہی تک تمام کہانی انہیں سنائی کہ کس طرح یہ روزانہ لاف گزاف کرتا ہے۔

”جتنے نہیں اپنے آپ کو کتنا حسین سمجھتا ہے جیسے
 کہ شہر بھر کی لڑکیاں اس پر فریفتہ ہوں؟“ ہم نے دل
 کے پھپھو لے پھوڑے۔

”یار چلو“ کسی روز وقت نکالو چلتے ہیں اس کے شاہ صاحب کے پاس اور پہنچاتے ہیں جموئے کو اس کے گھر تک..... کہا خیال ہے؟“ ان صاحب نے

کہا۔ ہم بھی نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ وعدہ کر بیٹھے کہ کل تین بجے آ جاؤ، چلیں گے۔

اگلے روز ٹیک سائز سے تین بجے ہم پتھوانی کے
وینے ہوئے۔ یہ کوڈھوئٹا ہوا ہے داں پانچپے۔ وہ
ہزار گز کے پلاٹ پر تعمیر کردہ ایک خوبصورت گھر
تھا اور عمارت پر سبز رنگ کے بڑے بڑے علم لہرا
رہے تھے جیسے کہ عمو بزرگوں کی خانقاہوں پر ہوتے
ہیں۔ ہم مذاہب کے عالم میں اس گھر کے عینت پر
کڑے ہو گئے۔

”یار، کہیں یہ ہم سے انتقام تو نہیں لے رہا؟ یہ تو کسی بزرگ کا آستانہ لگ رہا ہے۔ یہاں ایسی باتوں کا کیا کام؟“ ہم شش و پنج میں مبتلا ڈورنیل بھانے سے گر بزاں تھے۔

”جیل یار..... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟ جیل تو بجا کر دیکھتے ہیں۔“ ہمارے سامھی شاہد نے آگے بڑھ کر جیل پر ہاتھ رکھا اور عادل بیٹھواری کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں دروازے سے تھوڑا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک دس گیارہ سال کی بچی باہر آئی۔

”جی فرمائیے؟“ وہ نہایت ادب سے ہم لوگوں سے مخاطب ہوئی۔

”جی اچھا۔“ کہتی ہوئی وہ بچی دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پیغام لے کر آئی۔ ”شاہ

صاحب کہہ رہے ہیں انتظار کیجیے۔“
بیس منٹ بعد ایک بار پھر اسی بچی نے دروازہ

کہو لا۔ ”آئیے“ شاہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔ ”اس سے پہلے ایک خاتون سرخ تاپا سیاہ چادر میں لبوس باہر

باریابی ملتا تھا۔ اس بچی کی معیت میں ہم ایک کشادہ سکرے میں داخل ہوئے اور ہمارے پیچھے وہ بچی بھی دروازہ بند کر کے غالباً عمارت کے اندر ونی حصے میں کہیں غائب ہو گئی۔

”آئیے آئیے۔“ ایک فربہ اندام پہلوؤں کی
 سی جسامت اور لورائی سی قفل و شبابت رکھنے والے
 صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ”تشریف رکھیے۔“
 ہم چاندنی بچے فرشتے پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”ارے یار کیا تکلفات میں پڑے ہو؟
میاں..... آپ تو ہمارے یار کے یار ہیں۔ پنجوانی

نے بھیجا ہے۔ آپ کی خدمت تو ہمارا فرض ہے۔“ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے ایک طویل انگڑائی لی اور

ہمیں گاؤں تکے پیش کیے۔ سر سے عمامہ اتار کر ایک طرف پھینکا اور ارشاد فرمایا۔ ”ہاں بھئی“ کیا خدمت

کی جائے یار کے یاروں کی؟ ارے صبر و جہت پہلے
کچھ چائے پانی ہو جائے پھر کریں گے گل کے

بات۔ ”اہوں نے آواز لگائی۔ ”عذرا۔۔۔۔۔“ شاہ صاحب کی پشت پر بند کھڑکی کھلی اور بوسل کے جن کی

تاج محل

لوگ کہتے ہیں میرا تاج محل رشی ہے
جوڑ کر لاج محبت کی یہاں رکھی ہے

شاہ جہاں کتنی محبت تھے ممتاز سے تھی
تخت و تاج اپنا دل دے وہ گل باز سے تھی

ایسی الفت کہیں دنیا میں نظر آتی نہیں
آئے بھی کر کہیں ایسی تو وفا کیا نہیں

وقت اس یاد محبت کو لرزتا پائے
اس سینہ محبت کو ٹکرتا پائے

وہ جو مغرور محبت ہے یہاں آتی نہیں
اس کی گرتی ہوئی حالت ہے ترس کھاتی نہیں

عشق کی دنیا میں ایسا کوئی معیار نہیں
یاد الفت کو بچا لے وہ پرستار نہیں

وقت تاج محل کے دیتا ہے اک تاج محل
عشق کی دنیا میں اس کا نہیں اب تک تو کوئی بدل

بھارت سرکار کا ذمہ ہے حفاظت اس کی
زار و دین سے لٹائے گا چاہت اس کی

سیلہ تقسیم زہرہ رضوی

ذول سکا تھا۔

میں اسے لے کر سی دیو کے ایک ریشٹروٹ میں
چلا گیا۔ پہلے اس کرم اور پھر کولہ کا پی گھوٹا۔ ادھر
اُھر کی باتوں میں جب کافی درگزر کر گیا تو زور دینے
پوچھا۔ ”بس بائیں سر کرنے کے لیے طلب کی تھی
میں؟“ یہ کہتے ہوئے ایک دلربا سی مسکراہٹ
ہوٹوں پر دھنساں گئی۔ میں سمجھ کر ہنس رہا ہوں۔

”ہاں زور دینے۔“ آج تو بس چھوٹا جانے کا
پرگرام ہے۔ تہا رہی دریافت اگلی ملاقات میں ہی۔“
اس ملاقات میں یہ راز کھلا کر شاہ صاحب کے
ہاتھ بہت لیے ہیں۔ زور دینے جیسی بیسیوں گفتگو اور
توفیر لڑکیاں اس کے اشاروں پر رنجشی ہیں۔ گرچہ
کچھ لکسی کی ہیں جو اپنا اپنی پیٹ پالنے کے لیے
بخوش یہاں آتی ہیں لیکن زیادہ تر جو ان لڑکیاں وہ
ہیں جو اپنے عشق و محبت کے سلسلے میں اپنے محبوب کو
قدوس میں دیکھنے کی خواہش لیے شاہ صاحب کے
دور بارش حاضر ہوئی ہیں اور پھر محبوب قدوس میں
گرے یا نہ گرنے کو خود شاہ صاحب کے حضور کو
جاتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ چل پڑتا ہے۔ زیادہ تر
لڑکیاں معزز گھرانوں کی اور ان کی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں
کاغ اور یونیورسٹی کی آزاد خیال اور آزاد معاشرے
کی پروردہ۔!

اپنے آج کے اپنا گھنٹ بھانے کے ارادے سے آئی
تھیں یا اپنے مسائل کے حل کے لیے شاہ صاحب
سے فیض یاب ہونے؟ یہاں جلدی و چال و ڈھال
کے سی معزز اور باوقار گھرانے کی دکھائی دیتی تھیں۔
اس کے بعد کی کہانی ہمارے لیے تو بہت مختصر
اور سنگین ہے لیکن شاہ کے لیے رنگین ہے ہمواری کی
زبانی سنئے۔

.....
اگلے روز میں مقررہ وقت پر گاڑی شاہ صاحب
کے مقدس آستانے سے تھوڑی دور پارک کر کے
ڈورٹیل بجار کھینچی گاڑی میں آ بیٹھا۔ دو منٹ کے
بعد ایک طرح دار لڑکی گاڑی پر اُتر آئی اور اسے اعتماد سے
گاڑی کا گاڑا دروازہ کھول کر میرے برآمدگی سیٹ پر آ
بیٹھی جیسے کہ میری کوئی عزیز ہو۔

”مہلے۔۔۔۔۔“ اس نے اسی اعتماد سے کہا۔ اے
میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا
کہ وہ کوئی کمال کرل ہے۔ دیکھنے والا بھی سمجھتا کہ کوئی
باپردہ حیا دار لڑکی اپنا کوئی مسئلے کے گرفتار خانہ آئی تھی
اور اب دایں چارہ ہے۔

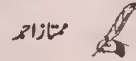
”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“
”ابھی نہیں میں روز پوچھنے کے بعد۔“
”سوری۔“ میں نے کہا۔

اور پھر میں رو پڑا آتے ہی اس نے کہا۔ ”میرا
نام زور دین ہے۔“ اور ساتھ ہی اس نے اپنے وجود کو
چھپائے سیاہ چادر بھی اتار کر پھیکی سیٹ پر پھینک
دی۔ اب اسے کوئی دیکھنا تو بلا مل کہہ سکتا تھا کہ وہ
حیا دار لڑکی نہیں بلکہ کمال کرل ہے۔ نہایت حسین
سراپا دراز سیاہ گائے بالی بڑی بڑی سیاہ پرکشش
آنکھیں سرخ و سپید رنگ دراز قد کاٹھ شاد رو پر
شاگنٹ بک شرت میں وہ ابھرا دکھائی دیتی تھی۔
اس کا حسن اور گلاز جسم دیکھ کر کسی بھی پارسا کا ایمان

اٹھا سکے یہاں آنے جانے والے پر؟ یہاں 25
سالوں سے یہ کام چلا رہا ہوں عزت ہے ایک مقام
ہے آپ کے شاہی کا۔۔۔۔۔ کوئی غلط بات کہنے والے کی
پہلو تو بھاری ہوئی کر ڈالیں گے پھر ہمارے کرم
قریباً کوئی لنگوٹیں نہیں ہیں علاقے کا قحطانے دار
ایس ہیں اور اس کے اوپر کے بڑے بھی ہمارے معزز
گاہک ہیں ان کی بھی ہم حبب منشا خدمت کرتے
رہتے ہیں ان ہی کے زیر سایہ سب کچھ چل رہا ہے
ان کی اپنی عزت کا بھی سوال ہے آخر۔۔۔۔۔ اور اب آپ
اپنی فرمائش بتائیں کہ بہت وقت ہو گیا ہے اور باہر کچھ
اور تر نا ہوا ہمارے کھنکھرتے ہیں۔

تھوڑے عرصہ میں لوگوں نے جان چھڑانے ہی میں
عافیت جانی۔ شاہ نے ہمت کر کے اپنی فرمائش ٹوٹ
کراتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی، لڑکی دراز قد، تعلیم
یافتہ، گوری اور اردو اسپیکنگ ہو چکے روز تو صرف
چند گھنٹوں کے لیے نہیں باہر گھمانے پھرانے لے
جاؤں گا۔ اگر وہ معیار پروری آتی تو پھر آیدہ روز
کی فرمائش اس میں کوئی تکرار ہو گی۔“

”جی آپ کو مطمئن کرنا ہمارا فرض ہے پھر آپ تو یار
کے یار ہیں۔“ شاہ صاحب نے پھر اپنا نیک کلام دہرایا۔
میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ جب شاہ
صاحب ہمیں اور بے عزت کردہ کی سیرک دار ہے
تھے تو ڈورٹیل بھی تھی اور بوسن کی جن خدائے نا پھر کل
کر کی کوشاہ صاحب کی مصروفیت کی اطلاع دی گئی۔
ہم شاہ صاحب سے ہاتھ ملا کر اٹھ کھڑے
ہوئے اور شاہ صاحب نے جلدی جلدی اپنا عامہ
زیبیت کر کے اپنی مسند نشینالی اور ہمہ کرکٹ کی
طرح رنگ بدلے شاہ صاحب کو کیسے رکھنے گئے تھے۔
باہر نکلے تو دو جوان رعنا لڑکیاں جو کہیں کہیں
بے حد اسارت تھیں ہمارے پیچھے اس مقدس خانہ
میں داخل ہوئیں۔ اب یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ



میری بہن اب محبت

مری آم کا خیال

روشنی مجھ سے ہم کلام ہوئی
دل کی گھٹیاں میں بھر نہ شام ہوئی

موسا کا کہنا تھا کہ میں نے اس کا سوا چوبیس کروڑ روپے خرچ کیا



حالا کہ لڑکیاں مجھے پسند ہی گی کی نگاہ سے دیکھیں مگر کسی نے بھی پیار کا اظہار نہ کیا۔ شادی کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ چلاؤ اپنی بیوی سے عشق کروں گا اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کروں گا مگر بد قسمتی سے مجھے جو بیوی ملی وہ ہر لحاظ سے پتھر پرچی۔۔۔۔۔

صرف پانچ چھ ماہ میں پس پانچ عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی واہنجی بھلی و مصورت جس میں ذرا عجیب کشش تھی جیکہ اس کی شخصیت میں رومانس نام کی ذرا سی بھی روح تھی عشق دہشت کے جذبے سے جاری تھی حدود درجہ کی دیکھا تو ہم پرست بھی تھی۔ اسے گھر کے کام کاج سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نہ بیوی کی دیکھنے کا شوق نہ ظلم کا نہ بڑے لکھنے کا اور نہ ہی کسی شوقل ایکٹو شیز کا نہ ہی بے سونے کا کوئی شوق تھا۔ وہ ایک دم پورے عشق کے جذبے کو فضول سمجھتی تھی مزید یہ کہ میرے دہر اور شرمیلی اتنی کیر ایک بیلہ پر میرے ساتھ سونے سے اس کو شرم آتی تھی جتنا ہمارے ازدواجی تعلقات میں کوئی کرم جوش نہ تھی اسی لیے مجھے اپنی بیوی سے عشق تو دور کی بات ذرا سی بھی کبھی نہ رہی۔ گھر میں میرا دل بالکل نہ لگتا تھا میں یہ تجاہد کر سکتے تھے گا کہ تباہی کو والے پان لکھا نہ اور زیادہ وقت گھر سے باہر دوستوں میں تاش کھیلنے میں گزارتا تھا اس کی فکر پر زندگی گزارتے ہوئے ہمارے دوستوں نے مجھ پر ہر وقت مایوسی اور افسردگی طاری رہتی تھی اور میں وقت سے پہلے ہی یوزر حائل نظر آنے لگا۔

ایک دن میں اپنے آفس میں تنہا بیٹھا تھا اور اپنی سوچوں میں تھا کہ میرا موسا کون سا لڑکیاں تیار کرے گا۔ میں نے کان لائینڈ کی تو ایک لڑکی نے بڑے شائقانہ اور مہذب انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ ”میری صاحبہ وہ بات کہہ دو ایں۔“

”سوری۔۔۔ یہ صاحبہ کا نمبر نہیں ہے۔“ میں

موسا کا کہنا تھا کہ میں نے اس کا سوا چوبیس کروڑ روپے خرچ کیا

میرا نام مندر ہے۔ گھر کا پیش کے بعد مجھے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی۔ میں ایک دہرہ مرد جیکہ مردانہ حسن کا نمونہ نہوں۔ میرا گورا رنگ اور لمبا ہنڈ ہے۔ میں فطرتاً رواں پسند شخصیت کا حامل ہوں شاید اسی لیے میری زندگی بھر خوش اور سناور تھا کہ میں کی لڑکی سے پیار کروں اور کوئی لڑکی مجھے نوٹ کر چاہے مجھ سے محبت کرے مگر میں اپنی خواہش کو کبھی عملی جامہ نہیں پہناتا کہ مجھ میں شرافت کے ساتھ جھگ بہت زیادہ ہے۔

خاندان اور محلے میں بہت سی لڑکیاں تھیں اور ان میں کچھ ایسی بھی لگتی تھیں مگر میں جب بھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے زبان انک جانی اور الفاظ جیسے پلٹن میں پھنس کر رہ جاتے۔ میرے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی تھا کہ بچپن سے میری آواز بہت بھاری و بھاری اور گھٹ سے بھرا اس وجہ سے بھی کسی لڑکی سے اور اظہار عشق نہ کر سکا۔ یوں میری زندگی کی کتاب کا عشق و محبت والا صفحہ ہمیشہ خالی رہا اور میری اس تنہائی تکمیل نہ ہو سکی۔ جوں جوں مجھے سرکاری فوکر ملی گھر والوں نے فوراً ہی مجھے شادی کے بندھن میں باغیچہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک دہشتہ دیکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ مجھے ان بات کا شدید ملال تھا کہ کاش۔۔۔ میری شادی لو میرج ہوئی

نے کہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں
 رہا ہوں تو جواب میں میں نے اپنا نام بتایا۔
 ”مگر حاجہ تھے تو یہی نہ ہوا تھا؟“ اس نے
 حیرانی سے پوچھا۔
 ”میں تو کسی حاجہ کو نہیں جانتا؟“
 ”گناہ کے غلطی سے رات گھر نہ مل گیا ہے۔“
 اور وہ معذرت کر کے فون بند کرنے لگی۔
 ”چیز ایک منٹ..... آپ مجھ سے ہی بات کر
 لیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”جب یہ حاجہ کا گھر نہیں ہے تو آپ مجھ سے
 کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”بات دراصل یہ ہے کہ کوئی لڑکی میری دوست
 نہیں میرا بہت دل چاہتا ہے میری کسی لڑکی سے
 دوستی ہو آپ کی آزاد بہت خوبصورت ہے لہذا میری
 التجا ہے کہ آپ مجھ سے دوستی کر لیں۔“
 ”میں آپ کو جانتی نہیں کہ آپ کون ہیں اور کس قسم
 کے انسان ہیں پھر میں کیسے آپ سے دوستی کر سکتی ہوں؟“
 ”میں شریف پڑھا تھا اور سرکاری ملازم
 ہوں۔“ میں نے اپنا نمونہ اور سیدھے بھی بتایا۔
 ”فیک ہے میں سوچوں گی کئی الوقت تو مجھے
 اپنی پہلی حاجہ سے بات کرنی ہے۔ اگر دل مانا تو
 آپ کو سن کال دوں گی۔“ اور پھر اس نے فون بند کر
 دیا۔ اس کی آواز اور بات کرنے کا انداز اتنا دلکش تھا
 کہ وہ فوراً ساعت کے راستے میرے دل میں اتر گئی
 تھی۔ میں رو دینے والے انداز میں دُعا میں کرنے
 لگا کہ کاش..... یہ لڑکی میری دوست بن جائے۔ اس
 کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر میں خود حیران تھا کہ
 میں نے اتنی باتیں کرنے کا ہوش کس طرح کھلیا؟
 خیر میں اس کی سن کال کا بڑی شدت سے انتظار
 کرنے لگا کوئی آدھے گھنٹے بعد اس نے مجھے سن
 کال دی تو میں نے فوراً اسے دنگ بیک کر دیا۔

سلام کے بعد وہ کہنے لگی۔ ”آپ مجھے آپ
 بارے میں تفصیل سے سچ سچ بتائیں کہ کہاں رہتے
 ہیں؟ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“ چوہا میں نے اس
 اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ بھی بتا
 کہ میں شادی شدہ ہوں اور دو بچے بھی ہیں۔
 ”وہ بہت سوچے ہوئے ہوئے آپ کی دوسری لڑکی
 سے دوستی کے خواہش مند کیوں ہیں؟“ اس نے
 حیرت سے پوچھا تو میں نے اسے اپنی بیوی کے
 متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب سن کر اسے میری
 باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل
 سے اسے یقین دلایا۔ قصہ مختصر وہ میرے ساتھ دوستی
 پر آمادہ ہوئی۔ اس نے اپنا نام مہک بتایا تھا۔
 ”آپ کہاں اور کس گھر میں رہتی ہیں؟ آپ کے
 والد کہاں کرتے ہیں؟ بہن بھائی کتنے ہیں؟ آپ خوشک
 کرتی ہیں؟ اسٹوڈنٹ ہیں یا جاب وغیرہ کرتی ہیں؟“
 میرے ان سوالوں کے جواب میں اس نے کہا
 تھا۔ ”آپ کو ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہوئی
 چاہے اور نہ ہی آپ میرے بارے میں کچھ جاننے
 کی کوشش کریں گے۔“ اس کا کافی ہے کہ میں جب تک
 ہوں اور آپ کی دوست ہوں اور آپ سے ہمیشہ
 تخلص رہوں گی۔“
 مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ میں تو خوش
 تھا کہ وہ میری دوست بن گئی تھی لہذا میں نے اس
 سے وعدہ کیا کہ آئندہ میں سب سوالات نہیں کروں گا۔
 اس طرح ہماری موبائل دوستی کا آغاز ہو گیا۔ ہم
 روزانہ کی کئی گھنٹے فون پر بات کرتے اور میں اکثر
 اس کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے مجھ جیسے شادی شدہ
 بھدی کا راز والے مرد سے دوستی کر کے مجھ پر بہت
 بڑا احسان کیا ہے۔ اس پر وہ ایک روز کہنے لگی۔
 ”اگر آپ کی آزاد اچھی نہیں ہے تو اس میں
 آپ کا کیا قصور ہے؟ یہ آپ کے بس میں تو نہیں ہے

مگر اس کے برعکس آپ کی سوچ خیالات اور باتیں
 بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ ہیں۔ آپ سچ بولنے والے ایک
 سچے ہوئے مہذب اور اخلاقی انسان ہیں۔“ اس
 کی بات سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔
 ”وہ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔ اس کی گفتگو
 اتنی دلکش اور مزے دار ہوتی کہ دل چاہتا کہ وہ ساری
 زندگی بولتی رہے اور میں اس کی سترم اور کٹوں میں
 جس کھولنے والی آواز سننا ہوں۔ جب وہ کسی بات
 پر مکالمہ کرتی تو لگتا جیسے ہلکے رنگ کاٹھے ہوں۔
 وہ روزانہ باقاعدگی سے مجھے سن کال کرتی اور
 ہم زندگی کے ہر موضوع پر خوب باتیں کرتے۔ اس
 کے پاس بہت علم تھا وہ مذہب سیاست مکمل کی دینی
 علم معاشرتی معاملات معاشی حالات اور سرکاری
 معاملات پر بے تکان بولتی اور میں بڑی دلچسپی سے
 اس کی خوبصورت باتیں سنتا۔ میں روزانہ اس کے
 فون کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی اسے فون
 کرنے میں دو سو پر ہو جاتی تو مجھے بہت ہی چٹنی اور
 الجھن ہونے لگتی۔ وہ میری زندگی میں بڑا چوک
 جو میری کئی طرح داخل ہوئی تھی اور میری روزی چھلکی
 زندگی کو گھل کر بگڑا دیا تھا۔ اس طرح گزرتے
 رہے اور ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس کی
 محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس دن اس کا فون آیا تو
 میں نے فوراً ڈرتے ڈرتے اس سے کہا تھا۔
 ”جب تک تم سے عشق کرنے لگا ہوں اور تمہیں
 ٹوٹ کر چاہتا ہوں.....“
 ”مجھے بھی پیار ہو گیا ہے اور میں بھی تم سے
 شریعت محبت کرتی ہوں جب تک تم سے بات نہ کروں
 مجھے سکون نہیں ملتا۔“ اس کی زبانی یہ سب سن کر میں
 ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ یہ خیال ہی خوش کن تھا کہ
 کوئی مجھے جتنی محبت کر چاہتی ہے۔
 ”لیکن صفر ہماری محبت ایک انداز کی ہے تم

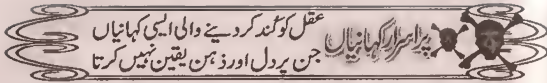
مجھ سے کبھی بھی شادی کا نہیں کہو گے کیونکہ ہمارا ملاپ
 نامکن ہے۔“ اس نے ہم مرتے دم تک ایک دوسرے
 سے بچی اور بلا کیز محبت کرتے رہیں گے کیونکہ
 صرف حاصل کرنے کا نام ہی محبت نہیں ہے۔“ اس
 کی اس بات پر مجھے بھر پور بھی تھا مگر پھر میں
 نے غور کیا تو اندازہ ہوا وہ درست کہہ رہی تھی۔
 ایک روز مجھ نے مجھ سے میرے معلومات
 اور عادت کے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔
 ”اس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ میں سگریٹ چٹا
 ہوں، تمباکو والے پان کھاتا ہوں اور تاش کھیلتا
 ہوں۔ نماز بھی نہیں پڑھتا۔ یہ سب جاننے کے بعد
 اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ باقاعدگی سے
 پانچ وقت کی نماز پڑھاؤں چاروں کام میں پر میں
 نے اسی دن سے نماز پڑھنی شروع کر دی کی پھر اس
 نے میرے پان کھانے بند کر دیے اور تاش کھیلنے پر
 بھی پابندی لگا دی۔ مجھ میں ایک اور بری عادت بھی
 تھی وہ یہ کہ اکثر پانچ باتیں کرتے ہوئے میرے منہ سے
 کالیاں نکال کر بھی چلایا کرتی تھیں۔ اس نے اپنی سچی
 قسم کی سب باتیں سن کر بھی کالیاں نہیں دوں گا پھر اس نے
 مجھے تاکید کی کہ صبح فجر اور مغرب کی نماز کے بعد
 قرآن پاک کی تلاوت کروں۔
 ایک روز اس نے اپنی محبت کا واسطہ رکھا
 تھا۔ ”اگر میں اس سے بچی محبت کرتا ہوں تو سگریٹ
 چھوڑ دوں۔“ اور میں نے اسی وقت سے سگریٹ
 چھوڑ دیے۔ اس کی باتوں میں جانے کیا جاو تھا کہ
 وہ مجھ سے جو کچھ بھی چاہتا تھا وہ اس کی ہر بات
 مان لیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت دن بدن گھڑتی
 چلی گئی پھر اس کے کہنے پر میں نے روزانہ واک بھی
 شروع کر دی۔ واک کے دوران اکثر اس کی کال
 آ جاتی اور مجھ کو ڈیر ہوا کہ میں کتا۔
 اس میں کچھ نمازی بھی گیا تھا۔ تاش پان اور

سگریٹ چھوڑ دیئے تھے جس سے میرے ماحول بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آئی تھیں۔
 ہماری محبت نما دوستی کو اب گھر کو گئے تھے اور میرے دل میں اس لئے اور اسے دل دینے کی خواہش شدت سے اٹھ اٹھانیں لینے لگی تھی۔ سو اب میرا اس سے ملاقات کا اصرار دن بدن بڑھنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے ملاقات کا وعدہ کرتی رہتی مگر بقول اس کے وہ وقت نہیں نکال پاری تھی۔
 ایک دن میں نے ٹھک آ کر اس سے کہا: "مگر تم واقعی مجھ سے کچھ محبت کرتی ہو تو ایسا کہتے مجھ سے ملو ورنہ میں مجھوں کا کرتی مجھ سے محبت کا ناک کر رہی ہوں۔" تب اس نے دونوں بعد لٹے کا وعدہ کر دیا تھا: یہ وہ دن میں نے کس بے قراری میں گزارے تھے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب ملاقات کا دن آیا تو قسمت سے میرے دل کی محبت کشش بے قراری ہو رہی تھی۔ پس اسے اُس روز ایسے آفس سے چھٹی لے لی تھی اور خوب تیار کی تھی۔ اُس دن بارہ بجے ملاقات کا وقت ملے تھا۔ ہماری ملاقات ایک مشہور جنرل اسٹور پر ہونا تھی اور پھر ٹھیک بارہ بجے وہ وہاں موجود تھی۔
 میں نے اسے دیکھا تو دیکھنا شروع کر دیا کہ اس کی آواز جتنی خوبصورت اور نرم تھی اس سے بڑھ کر وہ خود حسن کا شاہکار تھی۔ لگتا تھا جسے کوئی حسین ماڈل ہو۔ میں اس کے گلونی حسن میں ٹھوکر مارتا۔ ہم اس جنرل اسٹور سے قریبی ریستورنٹ کے کھلی ٹیبلن میں جا کر بیٹھ گئے۔ میری نظرس ہر جگہ کے خوبصورت چہرے اور حسین سراپے سے تھی یہی نہیں تھی۔ وہ میرے لیے بہت خوبصورت اور حسین بیٹی گنٹ تھی۔ وہ آتی تھی۔ ہم دو گھنٹے وہاں بیٹھے رہے کھانا وغیرہ کھایا۔ خوب باتیں کیں۔ ہیک کے کپڑوں سے بہت دلربا خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ وہ اس علاقے میں رہتی ہے اور کیا

کرتی ہے مگر اس نے محض اتنا بتایا کہ وہ اسی شہر میں رہتی ہے باقی اس نے مزید کچھ بتانے سے محضرت کر لی۔ میرا سوا یکل کبیرے والا تھا میں نے اس کی بہت ساری تصویریں بنائی تھیں اس کی خوبصورت آواز دیکھ کر اور اس کی محبت اور اس کی مدد بھی بنائی تھی۔ جتنی دیر ہم بیٹھے رہے وہ تمام وقت دلربا انداز میں ہنسی مسکراتی رہی تھی۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ وقت جلد چلے جائے اور وہ ساری زندگی میرے سامنے اسی طرح تھکی رہے باتیں کرتی رہے۔ میں نے رنجے رہے اور میں اسے خوبت سے دیکھ کر ہوں مگر انفس۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت کا کام کرنا ہے اور اس کے دیے ابر کا وقت بھی گزار گیا۔ اس نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے بھی اس کو بہت اچھا گفٹ لے کر دیا اور وہ بارہ بہت جلد ملے کا وعدہ کر کے کھلی گئی۔ کچھ تو یہ ہے کہ اس کے جاتے ہی میں ادا اس ہو گیا تھا۔
 بہر حال ہماری روزانہ فون پر ڈیڑھروں باتیں ہوتیں۔ میرے بازو دست اب مجھ سے ٹھوکر کرتے کہ میں رتو آن کو کھینچ دیتا ہوں اور میری تاش لکھتا ہوں جس پر میں مصروفیت کا بھانہ بنا کر ان سے جان چھڑا لیتا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے شے کھیلے یا سگریٹ وغیرہ پینے کی کوشش کی تو یہ ہیک کی محبت کی توہین ہوئی۔ وہ میرے لیے ایک دیوی کی طرح تھی جس کا ہر کھرجا بلانا میرے لیے کسی عبادت سے کم نہ تھا۔
 تقریباً دو ماہ بعد پھر ہماری ملاقات ہوئی۔ میں اس کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیسے کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے پوچھا: "ہیک کا شے؟" تم میری بیوی ہو تھی یا میری بیوی تم تھیں ہوئی۔
 "تمہاری بیوی تمنا تو ممکن ہے البتہ میں تمہاری بیوی کو کبھی نہ بتا سکتی ہوں۔"

"اچھا وہ کیسے؟" میں نے حسرت سے پوچھا۔
 "پہلی بیوی کا سوا یکل کبیرے تھا۔" اس نے کہا۔
 اس کے پاس سوا یکل نہیں ہے۔
 "ٹھیک ہے تم اسے سوا یکل خرید کر دو۔"
 اس کے کہنے پر میں نے اپنی بیوی کو دیا سوا یکل اور نئی سہ کر دی اور اس کو کال کر کے اور سننے کا طریقہ بتایا۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ اس کو نہ تو سوا یکل کی ضرورت ہے اور نہ ہی شوق۔ نیز بیوی مشکل سے اسے سوا یکل فون کرے پر آ رہا تھا۔
 میری بیوی نے ٹھک کی صفائی اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے ایک ماسی رہی تھی اور وہ کچھ سارا دن بیٹھ رہتی یا کھانا وغیرہ کھاتی جس کے باعث وہ دن دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ سبھی میں سے پہلی تھی نہیں تھا اب وہ سبھی چیزیں جو میری بیوی نے اپنی بیوی کا سوا یکل کبیرے کو دے دیا اور اس نے چند دنوں میں ہی میری بیوی کو اپنی بائیکل بنا لیا اور اسے کبھی کبھی کالز کرتی گئی۔ ایک روز میں نے اپنی بیوی سے اس فون کا کالز کا پوچھا تو اس نے کہا کہ میری بہت ہی پیاری اور گہری کھلی کا فون ہے۔ یہ سن کر میں مسکرا کر رہ گیا۔ ہیک نے پتہ نہیں لایا اپنی باتوں کا کیا جادو چلایا کہ میری بیوی میں بہت ہی تیار پسند رہنا ہوئے لیکن اب وہ مزے مزے کے کھانے لگانے لگی تھی۔ گھر کے کام کا جان خوب دیکھی تھی اس میں سلیقہ بھی آتا جا رہا تھا۔
 ایک دن میں دفتر میں تھا تو ہیک نے فون پر بتایا کہ وہ میرے گھر میری بیوی سے ملنے جا رہی ہے اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس کی موجودگی میں اپنے کمرے نہ جاؤں۔ نیز اس روز میں جان بوجھ کر گھر سے گیا تو دیکھا کہ گھر کا نقشہ بدل چکا ہے۔ فریج اور بیلہ وغیرہ کی سیٹنگ تبدیل تھی۔ سنے پردے لگے ہوئے تھے اور میری بیوی بہت ہی

خوشگوار موزوں میں تھی۔ جب میں نے اس تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگی کہ یہ سارا میری کھلی ہیک کا کمال ہے۔ بہر حال اس روز مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اب میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ جب گھر آتا تو میری بیوی کبھی ہنسی نہ سوری ہوتی اور بڑی خوش دلی اور چاہت سے میرا استقبال کرتی۔ اس کا مٹا پائی دن بدم دن ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ ہر کام سلیقے اور ذہانت سے کرتے لگی تھی۔ باج کچھ نماز پڑھتی۔ اپنے بنناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دیتی رہتے داروں اور عرصہ بڑا قارب سے ہمارا میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔ گھر والے دانے لمباؤں کی خوب تواضع کرتی تھی کہ اس کی سلیقہ مندی دیکھ دیکھا اور اچھے اخلاق کے سبب بھی کچھ کہتے۔
 یہ کمرہ سبب ہیک کی ہے ہوا تھا۔ ان تمام چیزوں کی تفصیل ہیک مجھے فون پر بتاتی جس پر میں اس کا بہت ممنون ہوتا تھا اور اس کا ہر دم شکر ہی ادا کرتا تھا۔ جواب میں وہ خوب ہنسی اور کبھی کہ وہ بے سبب کہ میری محبت میں کر رہی ہے۔ الغرض ہیک کی وجہ سے ہم دونوں سماں میں اس کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں اور خاندان بھر میں سبھی مثالی جوڑا بن رہا جانے لگا۔ ہیک ہمارے لیے بہت ڈسٹن کر رہی تھی۔ یہ اس کی عاؤن محبت ٹھوس چاہت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ ہمارا گھرانہ مثالی بن گیا تھا۔ ہماری دوستی دوسرا سلیقہ تھی۔ ہیک کی شخصیت میں ہیک مقدس تھا یا کیز کی تھی۔
 ہماری بے شمار ملاقاتیں ہوئیں کمرے میں ایک دروازے کو کھاتھک نہیں لگایا۔ اگر کبھی میرے دل میں اس کو چھوئے گا خیال بھی آیا تو مجھے لگتا کہ میرے چھوئے سے وہ کھلی ہو جائے گی۔ اس نے کبھی کوئی عامیانہ بات یا حرکت نہیں کی تھی۔ عالم الزکیوں کی طرح اس نے کبھی سوا یکل نہیں کیا۔ کچھ دنوں میں اس کی باتیں میں کی تھیں۔ میں اسے کوئی تھوڑا سا توجہ دیتی تو بڑی مشکل سے قبول کرتی اور اگلی



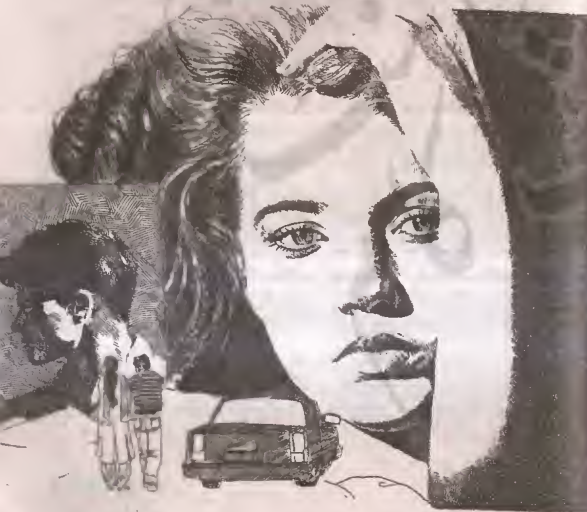
مہتاب خان

دو ایک نشان

غریب حسن کا خیال

ایک آواز اٹھا لے جاتی ہے ہم کو
ایک سائے کے پیچھے ہم بھی چلتے ہیں

ایک پر اہر اہر کی عجب کہانی، آپ کا اس قصے پر اعتبار کرنا پڑے گا



مرتب میرے لیے اس سے بڑھ کر تھی خندے کر آتی۔
پھر ایک روز مہک نے مجھے یہ دوح فرما کر سنائی
کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ شادی کے فوراً بعد
اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک چلی جائے گی۔ میں
بہت پریشان ہو گیا اور مجھ پر اداسی طاری ہونے
لگی۔ جب وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی تو اس کی
چھائی کا سوچ سوچ کر مجھے ہول اٹھ رہے تھے اور
آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ اس
نے مجھے اپنی قسم دے کر دھونے سے منع کیا تھا میں اس
کی ایک ہی درخواست تھی کہ میں ہمیشہ اسے اپنی
ڈھانڈ میں یاد رکھوں۔ آخر چھائی کی کٹھڑی آن پہنچی
میں نے ڈھیروں ڈھانڈ اور نیک تمناؤں کے ساتھ
اسے رخصت کیا کیونکہ اگلے روز اس کی اسلام
آباد روڈ پر تھی جہاں ایک فائیناسٹار ہوٹل میں اس کی
شادی کی تقریب ہونا تھی اور وہیں سے دہلی کے بعد
اس کی بیرون ملک روانگی تھی۔ اس کے جانے کے
بعد میری بیوی بھی اداس رہنے لگی تھی اور میں بھی بہت
منغوم رہتا تھا۔ جب ایک آنکھوں سے آنسو نکلنے تو
مجھے اس کی دی ہوئی قسم یاد آ جاتی اور میں اپنے
آنسوؤں کو روک لیتا اور دل سے اس کی خوشیں بھری
زندگی کے لیے ڈھاکتا۔ جب بھی اس کی یاد آتی
میں اپنے موبائل فون پر اس کی مودی اور تصویریں
دیکھتا اس کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سنتا۔

مگر پھر اس کے دیدار کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا ایک
دن میٹرو سائیکل چلاتے ہوئے میں موبائل فون سن رہا تھا
کہ فون میرے ہاتھ سے پھینک کر گیا اور پیچھے سے آنے
والا گاڑی نے اسے دھمکیا اور فون چھینا چھوڑ دیا۔ یوں
اس کی باتازہ کرنے کا بیڑہ بھی ہاتھ سے گیا۔
گوئی چوہاہ بعد اچانک اس کا فون آیا اس نے
بتایا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اسے بہت چاہئے والا
شوہر ملا ہے پھر مزید چوہاہ بعد اس نے فون پر بتایا کہ

مہک کی آنکھوں کا پتھر ہوا ہے۔ اس کا فون سن رہا تھا
کہ فون میرے ہاتھ سے پھینک کر گیا اور پیچھے سے آنے
والا گاڑی نے اسے دھمکیا اور فون چھینا چھوڑ دیا۔ یوں
اس کی باتازہ کرنے کا بیڑہ بھی ہاتھ سے گیا۔
گوئی چوہاہ بعد اچانک اس کا فون آیا اس نے
بتایا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اسے بہت چاہئے والا
شوہر ملا ہے پھر مزید چوہاہ بعد اس نے فون پر بتایا کہ

اُن دنوں میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور اُن ہی دنوں میرا دفتر سے پنجاب کے ایک علاقے جو ہر آباد تارلہ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے وہاں کرائے کا گھر وغیرہ تلاش کروں پھر میری کوئی کس کس لوگوں کا گھر۔ یہی سوچ کر میں جو ہر آباد روانہ ہو گیا تھا اور وہاں پہنچ کر ڈیڑھ بجے کی گئی تھی۔

جو ہر آباد میں میری رہائش ایک ہوٹل میں تھی۔ یہ ہوا سربز علاقہ تھا اور یہ سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی کڑا کے دار سردیاں پڑ رہی تھیں۔ میرا تعلق چنگہ کراچی سے ہے اور کراچی میں سردی اتنی شدید نہیں ہوتی۔ پہلی بار میرا واسطہ کسی سردی سے پڑا تھا۔ قصہ مختصر میں نے وہاں زور و شور سے مکان کی تلاش شروع کی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اپنے دفتر کے ساتھیوں سے بھی کھد کھد تھا۔

میرے دفتر کے ساتھیوں نے مجھے کافی گھر دکھائے تھے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر مجھے اُن میں سے کوئی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس تلاش میں دو دفعے گزر چکے تھے اور حالیہ جوں کا توں تھا۔ ہوٹل کی رہائش بھی مجھے چنگی پڑ رہی تھی۔ یہی کی کمی فون پر فون آرہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کیا کروں؟

اس روز موسم صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور موسم پہنچا اُٹھا اُٹھا سرد ہو گیا تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا باہر کرج چنگ کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی اس وقت مجھے چاہئے کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی سو میں نے ہوٹل کے حیرے رشید سے ملنے کے لئے کہا تھا۔

رشید بہت شریف انسان تھا۔ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا اور میرے کئی چھوٹے موٹے کام کر رہا تھا۔ مجھے چاہئے دینے کے بعد اس

گاہ میں جانتا تھا کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا مگر جب رشید نے ششی سے بات کی تو وہ اس پر راضی ہو گیا۔ ششی چنگ کے ایک پھال کے لیے اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور نہ اس کی رہائش شہر ہی میں تھی۔ اس نے میرے لیے وہاں ماسٹر ایک کمرہ صاف کروا دیا تھا۔ ساتھ ہی وہاں حیرے لیے دو چار دن کھانے پینے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

وہ بجلہ آبادی سے تھے اور ایک سنان مقام پر تھا۔ شہر سے باہر جانے والی سڑک سے جڑی ایک چھوٹی سی سڑک اس چنگ کے سامنے سے جاتی تھی۔ اُس سڑک پر دن بھر میں شاہی ہی کوئی کبھی ایس وغیرہ جاتی ہو۔ میں تین دن کی چھٹی لے کے وہ چنگ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اُس دن بھی کبھی پھلکی بارش ہو رہی تھی اور بڑی بھندری ہوا چل رہی تھی۔ جب میں چنگ میں پہنچا تو ششی میرے خیر مقدم کے لیے وہاں موجود تھا۔

ششی مجھے بنگہ دکھانے لگا۔ وہ ایک کشادہ بنگہ تھا۔ اُس وقت میں کچھ کمزور محسوس کر رہا تھا اسی لیے تفصیلی معائنہ نہیں کر سکا۔ ہم لوگ اس کمرے میں چلے آئے جو ششی نے حیرے کے لیے ٹھیک کر دیا ہوا تھا۔ اس نے حیرے کے لیے کھانا بھی تیار کر لیا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا جو تازہ و لذیذ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور میں یہاں تنہا رہ گیا تھا۔

میں چنگ کے ایک چکر لگانے کے خیال سے باہر آ گیا تھا۔ اندھیرا بڑھ چکا تھا بارش کم ہو گئی تھی۔ مکان کے پچھلے دروازے سے کوئی چند منٹ کی دوری پر کیراج تھا۔ میں نے اس کا بھی چکر لگا کر اس کے اندر چل گیا۔ اندھیرا کچھ درہل کر میں اندر چلا گیا اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی

ہم سفر

اپنے رستے، سب چلتے تھے

ترے ساتھ

ہم چلتے تھے

اپنے رستے، سب چلتے ہیں

ترے ساتھ

ہم چلتے ہیں

اپنے رستے، سب چاہیں گے

ترے ساتھ

ہم جائیں گے

اے ہمسفر، ہم کون ہیں؟

اور کون تھے؟

ظریف، حسن، بناؤ تم

لکھنے پڑھنے والوں کا

یہ رشتہ ازل سے ہے

ہم ہر صدی کا قصہ ہیں

ہم ہر رستے کا حصہ ہیں

ہم ہر اول کا آخر ہیں

ظریف احسن

تھی۔ سردرات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا تھا۔

”انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔“ اُس نے انجن سے نظر اٹھا کر مجھے غور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا“ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انجن ٹس سے کس نہ ہوا تھا۔ وہ اتنا گرم ہو گیا تھا کہ چمچونے سے ہاتھ جلتا تھا۔

میں نے لڑکی سے پوچھا تھا۔ ”ریڈمی ایٹر میں
یانی ہے؟“

”ضرور ہوگا۔“ اُس نے بڑے یقین سے جواب دیا تھا لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اپنے

گھر سے پانی کی ایک بوتل لے آیا تھا اور یڈی ایٹر کا
 حکم کھول کر جیسے ہی اُس میں پانی ڈالنا چاہا تھا وہ

مل کر باہر آ گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ
 لڑکی کا دل دیر سے ریڈیو ایئر میں پانی ختم ہونے پر بھی
 ایئر کرنے کی چلی جا رہی تھی اور اب انجن بند ہو گیا
 تھا۔ ہم لوگوں نے کان دیر تک انجن ٹھنڈا ہو جانے کا
 انتظار کیا تاہم کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساری رات یہاں
کنارے گا؟“

”اس میں کوئی مشکل نہیں، مطلب..... اگر تم
 جاہلو تو میں اس گھر میں تمہاری میزبانی کر سکتا ہوں۔“

”مگر.....“ اُس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ

”تم رات کے اس پہر اکیلی پیدل کہاں جاؤ
ہر کنہا نہیں چاہتی تھی۔“

دوران اُس سڑک پر کسی گاڑی کی چمکتی ہیڈ لائٹس
میں اِسی جانب آئی نظر آئی تھیں۔

اسک بھی بڑی عجیب سی نگہ داری تھی اس کا
 بتاؤ بھی مجھے غنطری ساگ رہا تھا۔ میں اور
 چہاگر بڑے غلوں سے اس کی مدد کر رہے تھے
 مگر ان کی نگاہ تھاکر ہمارے لیے اس نوزی کے دل

میں کچھ شک ہے۔ پتے کے خاتمے پر جب
جہانگیر کوئی اسٹارٹ کرنے کے لیے بارنگلا خاتون
میں لڑکی سے پوچھا تھا۔ ”تمہیں پسندوں وغیرہ کی
ضرورت تو ہیں؟“

نیل..... میرے پاس ہاں کی ہیں.....
 اس نے بہت رکھائی سے کہا تھا اور میرا انگریز ادا کیے
 بغیر باقی نکال دیا۔

جیسی جی تیار ہوئی کی اور یہ اس میں سے ہوا
 وہاں اس کی کار وکیل کر بیٹھے کہ کراچ میں بیچنا
 تھا جانتے ہوئے کہ کونجی کھانے کے کھانا لے لے جبکہ وہ
 خود اس وقت دوسری گاڑی کے ڈرائیور اس کو جوان
 کے ساتھ شہر جانے کے تیار ہو گئی تھی۔

میں کیراج کی پانی و موٹروں کا قمار اور کار کے ڈرائیور کی ہودے جس کا نام جاکیر تھا اور کی کار وکیل کر کیراج میں پہنچائی تھی اور پھر میں نے ان

دووں سے کہا۔
”رات کافی سرد ہے اس لیے اگر وہ چاہیں تو
اندر چل کر میرے ساتھ گرم گرم چائے پی لیں۔ پھر
اسے سنبھروا دوں گا۔“

جہانگیر نورای میرے مشورے پر عمل کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن میری کچھ جھجک رہی تھی۔ بہر حال میں نے انداز کر چکا تھا کہ میں اب ایک ایک کپ نہیں

دس کروڑھی ان کے ساتھ بنے گا تھا اور چائے
 کے دوران ہی میں نے اس کی ٹو فو سے دیکھا تھا
 وہ تقریباً چھوٹے چھبیس برس کی ہوئی خاصی
 خوبصورت لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجب

141 سچی کہانیاں

﴿ خواب نگر ﴾

ہم بھی
رت جکوں کی نرت میں
ترے خواب نگر
میں گھوما کرتے تھے
اور جن مشغلوں سے
آنکھیں مٹی ہوئی تھیں
ہم وہ منتظر
پلوں سے چوما کرتے تھے

اشعر جواد..... کراچی

”کل رات میں آیا ہے؟ آپ کا دماغ تو
خواب نہیں ہے؟ جو واقعات آپ نے سناے ہیں
ان کو گزرتے ہوئے تو بارہ سال ہو گئے ہیں؟“

آج میں اپنی بیوی اور شادی شدہ بچوں کے
ساتھ ساٹھ گاڑی زندگی گزار رہا ہوں لیکن مہرباں پس پہلے
میں نے اپنے والدین کو آج تک نہیں بھولا ہوں
اور یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وہ
واقعہ میری کوئی خواب یا خیال نہیں تھا کیونکہ میرے پاس
وہ چاہے کاشانی کپ آج بھی موجود ہے اور محفوظ ہے
جس میں اس لڑکی شہناز نے چائے پی لی تھی اور اس پر
موجود تھا نیکلپ اسٹاک کا نشان تو کسی بانی صاحبین یا
میکینکل سے جوئے کے باوجود صاف نہیں ہوا ہے۔

﴿ ۵۶ ﴾

پولیس والے اپنے کام میں بڑے ماہر ثابت
ہوئے تھے انہوں نے دوسرے دن اس واردات اور
جرمہ کے بارے میں میں پتا لگا لیا تھا اور اس لڑکی کی
شناخت کے لیے مجھے پولیس اسٹیشن طلب کیا تھا۔
میں اس وقت ڈیوٹی آفس کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک
پولیس والا بڑی سونپی ناک کے ساتھ آتا ہوا دروازہ
نائل اس نے ڈیوٹی آفس کے سامنے رکھ دی تھی۔
ڈیوٹی آفس نے اس لڑکی کا نام شہناز بتاتے ہوئے
ایک نوٹو مجھے دکھایا تھا وہ تصویر اس لڑکی کی تھی۔ میں
نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔

ڈیوٹی آفس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لڑکی ایک
عادی مجرم تھی اور اپنے شروع کے دنوں میں وہ
شاغ مال دفرہ سے مختلف چیزیں چرانے کے جرم
میں لگی بار پکڑی بھی جا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ
بزموں کے ایک گروہ میں شامل ہوئی تھی اور پھر
بزموں کے دو مختلف گروہوں کے ایک سہ قسام
کے دوران میں اس لڑکی کے ساتھ کوئی بامردی مٹی
تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش کو کار میں لیے وہاں
سے بھاگ نکلنے میں کامیاب تو ہوئی تھی لیکن اس کی
کاوش کے باہر کسی مقام پر خراب ہوئی تھی۔ اس لڑکی
شہناز نے لاش کے ساتھ اس کار کو ایک جنگل کے
کیراج میں چھپا دیا تھا اور خود کی دوسری کار میں
لفٹ لے کر شہر کے لیے چل دی تھی لیکن وہ شہر تک
نہیں پہنچ سکی تھی۔ راستے میں تیز رفتاری کے باعث
وہ کار حادثے کا شکار ہو کر الٹ کی تھی اور وہ ڈائیوٹر
کے ساتھ جس کام کا نتیجہ خیر تھا چلے حادثہ پر ہی
ہلاک ہوئی تھی۔

ڈیوٹی آفس کی زبانی یہ تمام کہانی سن کر میں نے
انتہائی عجب سے کہا تھا۔ ”لیکن آپ کو یہ سب اتنی
جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ واقعہ رات ہی تو پیش
آیا ہے؟“

اس کار میں شہر کے باہر گھومتی رہی ہوگی اور شاید اسی
نے اس کا کل بھی کیا ہوگا۔ مگر اب تو وہ جا چکی تھی اور
میں ایک بہت بڑی مصیبت میں محض کیا تھا۔ میں
نے فیصلہ کیا تھا کہ پولیس کو اس معاملے کی خبر دوں گا
پھر میں نے جب تک انتظار کرنے کے خیال سے
کیراج کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اسے کالا لگائے بغیر
اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔

کمرے میں بدلے سج ہوئی تھی۔ میں پولیس سے
رابطہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر کیراج میں گیا تھا
لیکن کیراج کا دروازہ کھولتے ہی جیسے میری آنکھیں
بھٹی گئیں وہاں میں کیراج خالی تھا وہاں پتھر نہیں
تھا نہ کار نہ ہی لاش..... کیراج کے فرش پر جہاں
رات کو ہم نے کئی گئی وہاں ہم کی بوندیں بھی ہوئی
تھیں اور کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس صورت حال
کے بعد صرف دو ہی باتیں ممکن تھیں یا تو رات میں
اس لڑکی کے جیسے وہ لوگ وہ کار نکال کر لے گئے
تھے یا پھر میں شاید بیوی سے گفتگو کے بعد بستر پر
لیٹے لیٹے اٹھ گیا تھا اور میں نے وہ لڑکی اور اس سے
متعلق سب معاملہ خواب میں دیکھا تھا لیکن پھر فوراً
ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے تو خود ان لوگوں کے لیے
چائے بنائی تھی انہیں پلائی تھی اور چائے کے خالی
کپ، ڈبوں، ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر پڑے رہے
دیتے تھے۔ میں فوراً ڈرائنگ روم میں گیا تھا چائے
کے خالی کپ وہیں موجود تھے۔ اس کا مطلب وہ
سب خواب نہیں تھا وہ لوگ رات میں کسی وقت کار
کیراج سے نکال کر لے گئے تھے۔

دوسری صبح میں سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا
تھا اور تمام واقعہ وہیں جو موجود اس کو سنایا تھا۔ وہ
قدرے حیرانی اور دہشت سے میری باتیں سن رہا
یہ کیا معاملہ ہے؟ آخر اسے کس نے کل کیا تھا؟ اتنا تو
صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکی اب تک اس لاش کے ساتھ

ہینڈل کر دیا ہی تھا کہ یوں لگا کہ جیسے کسی چیز کو اندر
سے کسی نے دھکا دیا ہو دروازہ فورے سے کھل گیا تھا
اور اس میں سے کوئی چیز نکل کر بالکل میرے اوپر آ
گئی تھی۔ اس چیز کے دھکے سے میں دیوار سے جا
کھرایا تھا اور میرے ہاتھ سے موسم پٹی بھی گر گئی تھی جو
گرے میں پھنسی گئی۔ خود پر گرنے والی چیز کو میں
نے ڈرائشل کر دیکھا تھا تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ
کوئی لاش ہے کسی آدمی کی لاش جس کی موت نہیں ہوئی
تھیں کیونکہ میرا ہاتھ اس کے مونچھوں والے چہرے
پر ہی پڑا تھا۔ میرے تو روکنے کھڑے ہو گئے تھے۔
مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں لگتی ہوئی محسوس ہوئی
تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے لاش کو دیکھ کر کار
کے اندر کیا تھا اور کسی نہ کسی طرح دروازہ بند کر دیا
تھا پھر کافی دیر اندر میرے میں کار کے منچھوٹے کے
بعد مجھے بھی ہوئی موسم پٹی اور ہاتھ کی ڈیپا لگی تھی۔
میں نے اسے دوبارہ جلایا لاش کی صورت
گاڑی میں موجود وہ بہت لمبا تھا اتنا لمبا چوٹ
سے بھی لمبا وہ بہت دھاپتا اور سالن تھا اس کا چہرہ
بالکل مرجھایا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو یہ
پتہ چلتے میں درپیش لگی کہ اس کی موت کیسے واقع
ہوئی تھی اس کی کمر میں کوئی بامردی مٹی بھی، کوئی کاپی
سوراج اس کی پیٹھ میں دائیں بازو کے نیچے دکھائی
دیا، کوئی باہر نہیں نکلی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
جیسے پورے میں نہیں انک گئی تھی۔

تلاش کے باوجود مجھے اس کی جیب میں کسی
طرح کا کوئی کاغذ نہیں ملا تھا کہ اس کی شناخت کا پتہ
چل سکے۔ ہاں اس کے قریب ہیڈ پر دھکے سے ٹیک
میں گزار پڑا کہ ٹوٹ ہو جوتے۔ سب دیکھ کر میرا
دماغ جھک کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
یہ کیا معاملہ ہے؟ آخر اسے کس نے کل کیا تھا؟ اتنا تو
صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکی اب تک اس لاش کے ساتھ

نسران رانا



چالیس دن بعد

رہا چٹائی کا خیال
جسے سمجھا نہیں شاید کسی نے
میں اپنے عہد کا وہ سانچہ ہوں

جلد کائے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آنے والا مہرت اثر قہر عجیب



بقاعدہ تیز آواز میں رونا اور چلانا شروع کر دیا تھا۔
اچانک کسی نے پیچھے سے جھولا تمام لایا اور جھولا یکدم
رک گیا۔

”کیا ہوا ہے بی؟“ ماموں کی آواز کانوں میں
آئی۔ میں فوراً جھولے سے اتر گئی۔ ماموں مجھے اعدا
لے گئے۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ خوف
کے مارے پولا نہیں جارہا تھا۔ نانی نے میری حالت
دیکھی تو پریشان ہو گئیں۔

”ارے..... کیا ہوا میری بچی کو؟“
”جانتیں اباں.....! یہ باہر جھولا جھولتے ہوئے
چلا رہی تھی اور جھولا بھی بہت تیز تیز بل رہا تھا۔ اگر
میں فوراً نہیں جاتا تو یہ جھولے سے گر کر زخمی ہو
جاتی۔“ ماموں نے بتایا۔

”ہزار دفعہ کہا ہے دوپہر میں اسکی باہر نہیں جایا
کر؟“ نانی نے مجھے آغوش میں لیے ہوئے ڈانٹا
تھا۔ میں دو دن تک بخار میں جیتی رہی تھی اور اس
دوران نانی نے کتنے ہی مولویوں سے مجھ پر دم کروایا
تھا اور اس دن کے بعد میں نے دوپہر کے وقت باہر
نکلنے سے تو بہ کر لی تھی۔ یا ان ہی دنوں جبکہ میں اس
حادثے سے تازہ تازہ ہمتی ملی تو ایک رات نانی نے
اسی علاقے میں ہونے والے ایک برسر واقعہ کے
بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت نانی کے گرد میری امی
اور میری خالائیں بھی سوچو گئیں۔ واصل ان دنوں
میری چھوٹی خالہ کو طیفے پڑھنے کا شوق چھایا تھا۔ وہ
بچ بچ وقت نمازی تو تھیں۔ نانی نے انہیں ایسا کرنے
سے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسے دھپے نہیں کرنے ہیں۔ صبح نہیں ہوتا۔“
نانی نے چھوٹی خالہ سے کہا تھا۔ اس وقت میں نانی
کے پاس ہی تھی۔

”جانتی ہو مسجد کے پاس والے گھر میں جو
عورت راتی ہے اس کے شوہر نے چلہ کاٹا تھا؟

میرے شہر کی کہانی

شہر کراچی میں جنم لینے والی کہانیوں کا نیا خاص سلسلہ

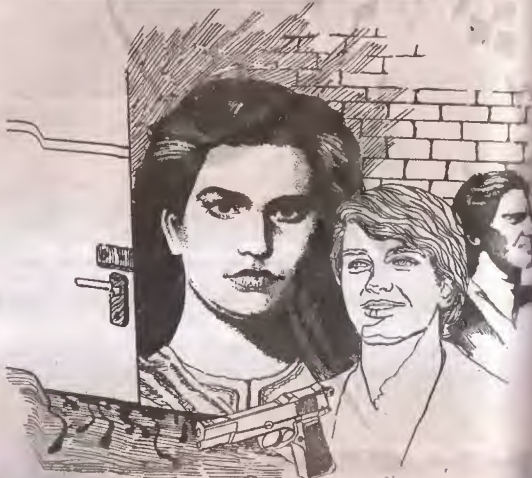
ارم زہرا

اور میرے شہر

پاکستان سپانیا

عجب ہے یہ قماش گو عالم
کہ لہتا بھی یہاں لہتا نہیں ہے

ایک دھارورت اور ایک لہجہ ان کی کہانی، ایسے واقعات اب حائرے کا حصہ بن گئے ہیں



چلیس دن تک وہ اپنے کمر میں بیٹے نہ خانے میں رہا تھا۔ کیا رات دن وہ بیٹے رہتا تھا۔ بیوی کو بھی نہ خانے میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ بیوی بس کھانا دے جاتی تھی مگر نہ خانے میں اندر نہیں جا سکتی تھی۔ دروازے کے نیچے سے کھانا آگے کر دیتی تھی۔ وہ معلوم نہیں کس وقت اٹھاتا تھا؟ چالیس دن تک وہ شخص نہ کسی سے ملا اور نہ ہی بات کی بس نہ خانے میں چلے کانٹے میں معروف رہتا تھا۔ اتنا کہہ کر کافی خاموش ہو گئیں۔

”پھر کیا ہوا اماں؟“ تھوڑی دیر بعد امی نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا اس کے چلے میں کوئی غلطی ہو گئی اور پھر وہ نہ خانے سے باہر نہیں آیا.....“

”تھما؟“ چوٹی نکلنے کے بعد سرت کے بلے نکلا۔ ”کیوں نہیں آیا؟ بیوی نہ ملنے لگی تھی بس سے پوچھا۔“

”ہوا یوں کہ اس نے چلے شروع کرتے وقت اپنی بیوی سے کہا تھا کہ چالیس دن بعد میں خود باہر آؤں گا۔ اس وقت تک موکل میرے قبضے میں آ جاؤں گے مگر چالیس دن سے زیادہ گزر گئے اور وہ باہر نہیں نکلا تو اس کی بیوی پریشان ہو گئی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ نہ خانے میں جا کر دیکھے مگر ایسے شوہر نہیں آتا سو اس خیال کے تحت کہ نہیں چلے خراب نہ ہو جائے وہ نہ خانے میں نہیں گئی مگر تک؟ دن گزرتے رہے تو فکر بڑھنے لگی۔ آخر شوہر تھا اور ایک دن وہ کچھ سوچ نہ خانے کے پاس گئی تو اسے شدید بوجھوس ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گوشت سڑ گیا ہو..... وہ پریشان ہو گئی، کہا کرے پھر بدلو آہستہ آہستہ پورے کمر میں پھیلنے لگی۔ آخر بخیر ہو کر اس نے سکے والوں کو بلوائی۔ جب لوگوں نے نہ خانہ کھولا تو ایک دلہ روز منظر سامنے تھا۔ نہ خانہ بدلو سے

”واہ واہ! کیا خوبصورت جھمکے ہیں“ کتے کے ہیں؟“ شوئیس میں سے مختلف ذہنات میں سے فرحانہ کی نظر سونے کے جھمکوں پر ٹپک گئی۔

”بی بی یہ جڑاؤ ہیں۔“ دکا عمار نے فرحانہ کی حالت پر نظر دوڑاتے ہوئے استہزاء بے نیچے میں کہا۔

میلی ہی جاوڑا رنگتے شلوار قمیض میں وہ چمکی چمکی پیر میں پھنسا کر غصے کا کر نے والی ہاسی لگ رہی تھی۔

”معتل کے اندر..... یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ یہ جڑاؤ ہیں پر ہیں کتے کے؟“ فرحانہ نے دانت پیٹتے ہوئے سامنے بیٹھے قدرے خوش شکل لڑکے کو مخاطب کیا۔

”تمیں ہزار کے۔“ دکا عمار نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”اسے متھے؟“ فرحانہ نے دانتوں میں اگی دہائی۔

”سونے کا ریٹ آسمان سے بائیں کر رہا ہے بی بی.....؟“ وہ سخت کوفت کے عالم میں واپس کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے ارے دکھا تو دو لے کر نہیں بھاگ جاؤں گی۔“ فرحانہ نے اسے پلٹتے دیکھا تو بے اختیار ہنسی۔

”ہیلو خریدنے والی تو ہو پھر دکھا بھی دوں گا۔ اب جاؤ تھوڑی زیادہ دماغ نہیں خراب کرو۔“

”آکر دوئیں گا..... کہ تو ایسے ہاے جیسے دیکھنے کے بھی کتے جیسے ہوں۔ ایسے جان چڑھا رہا ہے مجھ جیسے نظر گدوں کی اس کی دکان کو۔“ فرحانہ نے ایک تہہ زلزلہ دکا عمار پر ڈالی اور باہر لگ آئی۔

”کم بخت! اس کی دکان پر اچھے ڈیزائن نظر آتے ہیں۔ کسی نے ہی کہا ہے جیسے مسکرائیں نہیں آتا آئے۔“ دکان میں کھولنی چاہیے۔“ وہ رکشے کی طرف بڑھتی ہوئی خود سے جھوٹی۔

”.....“

”ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔“ رکشے والے نے سائیکل گھاس میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”نیو کراچی سے سر جانی ڈاؤن ڈیڑھ سو روپے؟ کیا سہیا ہے؟“

”ایک سو تیس میں چلتا ہے تو بیٹھ جاؤ رونا پناہ راہ لو۔“ رکشے والے نے سرگرمیوں میں دباتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

”سوئی گورنمنٹ کا بیڑہ فرق ہو رہا چیز کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بس اپنا تو اپنا دم لٹکنے کی قیمت آگئی ہے۔“ ہاتھ میں پگھلا سبزی کا کھیل سیٹ پر مٹی اب وہ خود بھی بیٹھ چکی تھی۔

”بھیا! ذرا تیز چلتا! پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔“ رکشا اشارت ہوتے ہی فرحانہ نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ کسی خیال کے تحت چمکی اور سواہل بیک سے نکال کر گھبرلانے لگی۔

.....

فرحانہ بیک کو منہ پوٹی سے بازو کے نیچے دے کر اسی سٹار کی دکان پر داخل ہوئی۔ آج اس کے ساتھ ایک سات سالہ لڑکا بھی تھا۔

”لو یہ آج پھر آگئی؟“ زوہیب نے نعمان کی توجہ فرحانہ کی طرف دلائی۔

”ارے.....؟“ فرحانہ نے نعمان کو دیکھتے ہی بے ساختہ بولی۔ ”یہ ہماری دکان ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں ہی سوال کر ڈالے۔

”نہیں یہ میرے دوست زوہیب کی دکان ہے میں ٹیکسری سے فارغ ہو کے اکثر یہاں اس کے پاس وقت گزارنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔“

”اوہ! اچھا۔“ فرحانہ نے طنز پر نظر زوہیب کے سر پر ڈالی مگر آج وہ خود بھی ٹھیک ٹھاک تیار ہو کر آئی تھی۔ صاف تھرے لباس پر نفاست سے کہا

میک اپ اس کی شخصیت کو نکھار رہا تھا۔

”جمعہ جانتے ہو اسے؟“ زوہیب نے نعمان سے آنکھیں سے پوچھا۔

”ہاں یہ میرے ساتھ ٹیکسری میں کام کرتی ہیں۔ ہمارے ڈپارٹمنٹ ایک ہیں لیکن میں ان کو آتے جاتے ہوئے اکثر دیکھتا ہوں۔“ نعمان نے وضاحت کی۔

”اوہ! اچھا۔“ زوہیب نے بھر پور نظروں سے فرحانہ کا سر تاپا جاؤہ لیا جو ابھی تک جھمکوں میں ہی مگن نظر آ رہی تھی۔

”یہاں جو پسند آئے آپ مجھے بتائیں یہ اپنا بار ہے آپ سے زیادہ پرافٹ نہیں لگے گا۔“ نعمان نے فرحانہ کو مخاطب کیا۔

”نہیں بھئی یہ جھکے تو واقعی میری ریخ سے باہر ہیں۔ آپ مجھے یہ سونے کی بالیاں دکھادیں۔“ وہ دوسری طرف شوئیس میں مٹی بالوں میں سے ایک پر اٹھی رکھتے ہوئے بولی۔ زوہیب نے فوراً ہی بالیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

”ارے یہ تو بہت مٹی ہیں۔“ فرحانہ خفیف سی ہو گئی۔

”سناڑے پانچ ہزار کی ہیں یہ محترمہ.....؟“ زوہیب نے مٹی لہوں میں دہائی۔

”یہ..... کاغذ جیسی بالیاں..... سناڑے پانچ ہزار کی؟“ وہ ہنسی سے اب نعمان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ارے یاؤ یہ اپنی جاننے والی ہیں! کچھ ڈسکاؤنٹ تو کرو۔“ نعمان نے زوہیب کو آکھ مارے ہوئے پیارے سمجھایا۔

”وہ ٹھیک ہوں۔“ زوہیب نے بالیاں اپنے سامنے رکھی دینے میں تیار ہو کر دوسرے طرف توف کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے آپ اس کے پانچ ہزار دے دیجیے گا۔“

”پانچ ہزار بھی زیادہ ہیں۔“ فرحانہ منہ بناتی

ہوئی بولی۔

”جائزہ لے رہا ہوں آپ سے یہ تو نعمان کی وجہ سے پانچ سو میں سے چھوڑ دینے کو کہیں کریں اس میں میرا کوئی پرافٹ نہیں ہو رہا۔“ زوہیب اب اسٹول پر بیٹھا فرحانہ کے فیصلے کا منتظر تھا۔ ”ارے آپ اچھی طرح سوچ لیجئے جب تک میں آپ کے لیے گولڈ ڈرک منگواؤں ہوں۔“ نعمان گولڈ ڈرک کا کہنے کے لیے شاپ سے نکل گیا جبکہ فرحانہ کی نظریں گھوم پھر کر ابھی گولڈ کے جھمکوں پر جا رہی تھیں۔

”میں نے ٹھیک ہے یہ بالیاں ہی دے دیجیے۔“ فرحانہ نے بادل آؤ غراستہ جواب دیا۔ اتنی دیر میں گولڈ ڈرک بھی آگئی۔

”یہ لیجئے آپ کی بالیاں۔“ چھوٹے سے سرخ مٹی ڈبے میں زوہیب بالیاں سیٹ کرتا اب فرحانہ کی طرف بڑھا چکا تھا۔

”مقاطعہ ہے رکھے گا آج کل کچھ پتا نہیں۔“ نعمان نے گولڈ ڈرک فرحانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ فرحانہ نے بیک کی اندرونی جب سے پیسے نکال کر زوہیب کے حوالے کیے اور بالیوں کو احتیاط سے بیک میں رکھنے لگی۔

.....

”ارے آپ کہاں غائب ہیں؟ کیسے ہیں؟ میں کافی دن سے آپ کی تلاش میں ہوں۔“ گارمنٹس ٹیکسری کے میں کیٹ پر فرحانہ نے نعمان کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں ہی سوال کر ڈالے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سناڑے سب خیر تھے تو ہے؟“ نعمان متعجب مچا۔

”وہ..... اصل میں مجھے جیلری کی دکان والے زوہیب کا نمبر چاہیے۔“ فرحانہ نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”خیریت زوہیب کا نمبر کیوں؟“ نعمان کے لیے جس ہیرا پھٹی۔

”افوہ وہ دفعہ موسوف کی دکان پر گئی ہوں مگر دونوں دفعہ ہیرا پھٹی سوچا پاب نوں کر کے جاؤں تو بہتر رہے گا۔“ فرحانہ نے بات بتاتے ہوئے کہا۔
”دکان جسے کے ملا وہ کھلی رہتی ہے۔ خیر میں دیتا ہوں نمبر۔“ نعمان نے موبائل جیب سے نکالے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں پلیز۔“ آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ سرجانی ناؤن سے ٹھوکرا پنی چا سخت کوفت میں جھٹا کر دیتا ہے۔“

”کیجیے ٹوٹ کیجیے۔“ نعمان نمبر بتانے لگا اور فرحانہ تیزی سے وہ نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرنے لگی۔

”دیکھ آپ کا دوست بڑا اکڑو قسم کا ہے۔“ فرحانہ منہ بناتے ہوئے موبائل بیک میں رکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھائی نہیں ہوئی نا اس کی جیسی اتنی اکڑ ہے۔“ نعمان ہنستے ہوئے بولا۔

”اکڑ تو اس کی اب میں نکالوں گی۔“ فرحانہ نے آنکھیں میس کرے اور خوشی سے مسکرا دی نعمان اپنے راستے پر چل دیا جبکہ فرحانہ تو کسی اور سی دنیا کی میر کے لیے لکھ چکی تھی۔

”اللہ۔۔۔ موبائل بیچ سسم بنانے والوں کو

سلامت رکھے۔“ فرحانہ نے زوہیب کا نمبر فریڈ کر ایڈ فلیکسٹ میں فیڈ کرتے ہوئے کہا اور فوراً ہی زوہیب کے نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے

زوہیب نے فوراً ہی کال ریسیڈ کر لی۔
”کیسے حراج ہیں آپ کے؟“ فرحانہ نے پری

اداسے کہا۔

”مئی آپ کون؟“ دوسری طرف سے آوا آئی۔

”آپ کی عاشق۔۔۔“ ایک قہقہے کے ساتھ فرحانہ بولی۔

”آپ کی فضول باتوں کے لیے میرے پاس فالو وقت نہیں۔“ زوہیب نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

”اوتے ہوئے۔۔۔ یہ تو کیا اغروٹ ہے۔۔۔ توہنے والا نہیں لگتا ہے اس کے اسٹاپس پر چوڑا پڑے گا۔“ فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے کہا مگر بہت خیریں ہاری اور ایک بار پھر زوہیب کا نمبر ملا بیسی کال ریسیڈ ہو چکی تھی۔

”زوہیب۔۔۔ پلیز۔۔۔ لائن نہیں کا لیجے گا۔“ ورنہ مئی ہوئی آواز بتاتے ہوئے بولی۔

”آپ آخر ہیں کون؟“ اپنا نام سنتے ہی زوہیب بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”آپ جانتے ہیں مجھے کیسے نہیں۔۔۔“
”لیکن کیا نہیں؟“ زوہیب نے سوال کیا۔

”میں کی میرے دل کا حال نہیں جانتے؟“ فرحانہ عبت بھرے لیے جس بولی۔

”سنائیے اپنے دل کا حال۔“ زوہیب کے لیے جس بے زاری تھی۔

”زوہیب میں جب سے آپ سے ملی ہوں آپ کو بول نہیں پائی۔ آپ کی شخصیت میں بار

ہے شاید میں اسی لیے بار بار آپ کی طرف متوجہ رہی ہوں۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی جسے کوئی بہت بڑا جواب دو مانع سے سرک کر ہوا میں تحلیل ہو گیا

”آپ کی مجھ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟“ زوہیب نے اختیار سوال کر بیٹھا۔

”جب میں آپ سے طوں کی تو آپ جاں

ہائیں گے۔“ فرحانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔
”آپ شاید کچھ غلط دیکھ رہی ہیں میرا مطلب ہے آپ جس سے ملی ہیں وہ نہیں ہیں ہوں۔“

”آپ کا گول چہرہ ہے ناں؟ اور داڑھی موٹھیں بھی ہیں؟“ فرحانہ نے مئی فوراً ہی لپٹی کرنا چاہی۔

”ارے۔۔۔ یہ تو مردوں کی شان ہے ہر دوسرا مرد داڑھی اور مونچھوں میں ہی نظر آتا ہے۔“ زوہیب ہنستے ہوئے بولا۔

”بے وقوف۔۔۔“ فرحانہ آہستہ سے بولی۔
”شاید آپ خود ہی بے وقوف بن گئیں۔“

زوہیب زور سے ہنسا۔
”آپ کی سندھی ہوئی کے پاس سنار کی دکان ہے ناں؟“ فرحانہ کا لہجہ خاصا مضبوط تھا۔

”مئی ہاں۔۔۔“ زوہیب نے بے اختیار کہا۔
”مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں آپ

بیک بیچتی تھی میرے لیے باعث خوشی ہے مگر اس میں آپ خواتین کا احترام کرتی نہیں جانتے۔

”ان کے احساسات کی آپ کو بالکل قدر نہیں۔“ وہ گڑے لیے جس میں بولی۔

”اچھا ناں اگر میری وجہ سے آپ کا دل برا ہوا تو سوری۔ سوری میں بھی کسی سے نہیں کہتا لیکن آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ زوہیب نے برن رفتار

سے اپنی بات مکمل کی۔
”اچھا ایک شرط پر آپ کا سوری منظور ہوگا۔“

”کون کی شرط؟“
”آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔“ فرحانہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”ہاں ملنا تو میں بھی آپ سے چاہ رہا ہوں۔“ زوہیب کے لیے جس میں بھی جلد بازی تھی۔

”آپ نے میری شاپ تو دیکھی ہے ناں میں

لائن کاٹ دی۔“ بے وقوف تو اب میں نہیں بنادوں

گی۔“ فرحانہ نے ایک فری مسکراہٹ کے ساتھ موبائل اٹھتے ہوئے کہا۔ موبائل پھر بجنے لگا۔

”کیوں ٹخ کر رہے ہیں آپ مجھے؟“ فرحانہ ناراض سے لیے جس میں بولی۔

”ارے۔۔۔ آپ تو اتنی ناراض ہیں کہ کچھ بھی سننے یا لائن کاٹ دیتی ہیں؟“ دوسری طرف سے

زوہیب کی آواز آئی۔
”ٹھیک ہے اب لائن نہیں کاٹ رہی کیجیے“ کہا کہنا چاہتے ہیں؟“ فرحانہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے گویا ہوئی۔

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“
”آپ کے وزٹنگ کارڈ سے۔۔۔“ ابھی وہ

آگے کچھ بولی کہ زوہیب بول اٹھا۔
”میرے وزٹنگ کارڈ پر میرا سیل نمبر نہیں ہے

صرف شاپ کال پی ای ایل نمبر ہے۔“
”چلیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں آپ

بیک بیچتی تھی میرے لیے باعث خوشی ہے مگر اس میں آپ خواتین کا احترام کرتی نہیں جانتے۔

”ان کے احساسات کی آپ کو بالکل قدر نہیں۔“ وہ گڑے لیے جس میں بولی۔

”اچھا ناں اگر میری وجہ سے آپ کا دل برا ہوا تو سوری۔ سوری میں بھی کسی سے نہیں کہتا لیکن

آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ زوہیب نے برن رفتار سے اپنی بات مکمل کی۔

”اچھا ایک شرط پر آپ کا سوری منظور ہوگا۔“
”کون کی شرط؟“

”آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔“ فرحانہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”ہاں ملنا تو میں بھی آپ سے چاہ رہا ہوں۔“ زوہیب کے لیے جس میں بھی جلد بازی تھی۔

”آپ نے میری شاپ تو دیکھی ہے ناں میں

لائن کاٹ دی۔“ بے وقوف تو اب میں نہیں بنادوں

اسی لائن میں آگے ایک آکس کریم پارلر ہے ہم وہیں کل ملتے ہیں۔“ زوہیب نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔“
 ”مگر میں آپ کو پچاس نوں کا کیسے؟“
 ”میں گرین سوٹ میں آؤں گی۔“ فرحانہ ہوسے سے بولی۔
 ”ٹھیک ہے باقی باتیں پھر میں آپ سے کل مل کر کروں گا لیکن یاد رہے ٹھیک باجئے۔“
 ”جی ٹھیک ہے۔“ فرحانہ کے ہاں بھرے ہی زوہیب نے لائن کاٹ دی۔
 ”یہ بولی کیا بات زبردست فرحانہ..... تم بالکل صحیح جا رہی ہو۔“

 آکس کریم پارلر کے ماحول سے بے نیاز زوہیب نے فرحانہ کا منتظر تھا۔ پانچ سے چھ اور چھ سے سات بجتے کو آئے تھے مگر فرحانہ نہ تو کال ریسو کر رہی تھی اور نہ ہی خود آئی تھی زوہیب آکس کریم پارلر میں بیٹھے جڑوں کو دیکھتا رہتا تو بھی آنے والی لوگوں میں گرین رنگ کے کپڑوں میں ملیں لوگو کو کھوجتا رہا۔ بلا آخر تک آ کر وہ واپس دکان پر آ گیا۔
 ”مب خیریت تو ہے نا؟“ نعمان نے اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”کچھ خاص نہیں یاد نہیں۔ جس کام کے لیے گیا تھا وہ وہاں نہیں۔“ زوہیب نے اپنی ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
 ”میلو یا زہوتا ہے کسی بھی غم نہیں کر دہی میں نکلوں؟ مگر میرا سب میرا نہیں جانے کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔“ نعمان کے جاتے ہی زوہیب کی انگلیاں مشتعل موبائل کی key پر ملیں کر رہی تھیں کہ اچانک ہی کال ریسو کر لی گئی۔

”آئیں کیوں نہیں؟ میں نے کتنا انتظار کیا؟“ زوہیب خاصا برہم تھا۔
 ”سواری زوہیب ایک ایمر جنسی ہو گئی تھی میری بڑوں والی آئی کی ایک سیٹ ہو گیا تھا۔“ جی جی تو بالکل ڈر گئی تھی۔“ فرحانہ بے ساختہ رونے لگی۔
 ”ارے پلیز! اب رونا بند کرو۔“ زوہیب یکدم نرم ہو گیا۔
 ”شکر ہے میری آئی جی سگ نہیں مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔“
 ”اچھا.....“ زوہیب نے اسی پر اکتفا کیا۔
 ”بالکل اتنی ہی عزیز جیسے آپ۔“ فرحانہ کی سڑسڑولی آواز زوہیب کی سماعت سے نکل گئی۔
 ”آپ جی کبہر ہیں؟“ زوہیب کے لہجے میں بے چینی تھی۔
 ”آپ مجھے فرحانہ کے ہر بلائیں کیا آپ آپ لگا رہی ہے؟ اور میں چھوٹ نہیں ہوتی۔“
 ”اب کیسی ہیں آپ کی آئی؟“ زوہیب اب قدرے پر سکون تھا۔
 ”ابا کی بات بہتر ہیں۔ اچھا میں آپ سے لیٹ نائٹ بات کروں گی انکی ٹھوڑا معروف ہوں۔“ فرحانہ نے کمال مہارت سے بہانہ بنایا اور لائن کاٹ دی۔
 ”ہا..... ہا..... ہا.....“ زوہیب تم میرے انتظار میں صرف میرے بارے میں ہی سوچ رہے ہو گے۔ میں یہی تو چاہ رہی تھی کہ تمہاری مجھ سے ملنے کی ٹوپ ہی مجھے مزہ دے گی۔ ایک سیٹ تو بہانہ تھا زوہیب اب تم مجھے چھوڑ نہیں جاسکتے۔“ فرحانہ کے چہرے پر لٹو کی خوشی کی حد تھی۔

 ”یار زوہیب“ خیر خیریت تو ہے نا؟ میں دو تین دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں؟“ نعمان

نے زوہیب کو کریدنا چاہا۔
 ”کچھ خاص نہیں، بس ایسے ہی ایک پریش مسئلہ ہے۔ انشاء اللہ جلدی حل ہو جائے گا۔“ زوہیب نے آہستگی سے کہا۔
 ”اچھا پھر میں نکلا ہوں تم فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا دینے کی سونے کی بوتلی قیمت کے باعث کوئی گاہک تو ہے نہیں۔“
 ”ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے یا زہنا؟“ صحبت باتی۔ میں ہوں ناں تیرے ساتھ دیکھ لوں گا۔“ نعمان نے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”نعمان کی روادگی کے زما دیر بعد ہی موبائل پر فرحانہ کی کال آئی تھی۔ زوہیب نے فوراً کال ریسو کر لی تھی۔
 ”کیا بات ہے آج آواز میں وہ جوش نہیں؟“ فرحانہ نے زوہیب کی آواز سننے ہی کہا تھا۔
 ”بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے مگر میں درد ہے میرے۔“ زوہیب کے لہجے میں سکھہ تھا۔
 ”میرے پاس آ جاؤ میں آپ کا سر دبا دوں۔“
 ”جی نہیں میں ٹھیک ہوں ابھی پوسٹن لوں گا تو بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔“ زوہیب کے بولنے لگے جواب پر فرحانہ زور سے ہنس دی۔
 ”زوہیب“ آپ کا دل نہیں چاہتا جب آپ کی ایسی کیفیت ہو تو کوئی آپ کا سر دبا دے؟ پیار سے آپ کا سر اپنے گاندھے پر رکھ کر آپ کے بال سہلائے؟“
 ”ہوں.....“ زوہیب ہوں پر اکتفا کیے اپنے دل کی بے ترتیب ہڑکنوں کو رہا تھا۔
 ”اف زوہیب“ میرا تو دل کرتا ہے..... وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”تمہارا دل کیا کرتا ہے؟“ زوہیب بے چین ہو چکا تھا۔
 ”کچھ نہیں رہے ہیں مجھے شرم آ رہی ہے۔“
 ”پھر بھی کھو.....“ زوہیب اسرار کر رہا تھا۔
 ”مجھے آپ سے ملنا ہے زوہیب“ کتنے دن ہو گئے آپ کو دیکھا ہی نہیں؟“ فرحانہ گہری سانس لینے سے ہونے لگی۔
 ”لو! نا مجھ سے نا مجھے خود نہیں دیکھتا ہے۔“ عجیب آگ میں جل رہا ہوں۔ تمہاری باتوں نے مجھے امیر کیا ہوا ہے ایسا لگتا ہے تم سے جہنم کا رشتہ ہے۔“ زوہیب وہوش کی سی کیفیت میں بول چلا چلا رہا تھا جبکہ فرحانہ کا سانس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے چلاٹھیں لگتی۔
 ”مجھے نا پتہ اسرار ہو گئے دیکھنے کا شوق ہے آپ کبھی گئے ہیں وہاں؟“ فرحانہ بے ساختہ دل کی بات زبان تک لائی۔
 ”ہاں! جا چکا ہوں چلتا ہے وہاں میرے ساتھ؟“
 ”ہوں.....“ فرحانہ نے آہستگی سے کہا۔
 ”چلو ٹھیک ہے کل چلتے ہیں۔“
 ”کیا ج؟“ فرحانہ کی آواز میں خوشی اور خوشی آ گئی۔
 ”ہاں! بھی! تم میری دکان تک پہنچو پھر وہاں سے ٹیکسی لیں گے۔“ زوہیب نے دوسرے دن کا پروگرام بناتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ آئی لو یو سوچ زوہیب.....“ فرحانہ نے اسے زور سے کہا کہ زوہیب ایک بل کے لیے موبائل کان سے دور کرنے پر مجبور ہو گیا۔
 ”پاکل ہو بالکل.....“ زوہیب اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔

”ارے..... پتہ گھر پر اکیلے رہتی ہو؟ تمہارا بھائی کہاں ہے؟“ زوہیب نے خالی گھر میں اکیلے فرحانہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بھئی، تم یہاں میرے پاس بیٹھو،“ زوہیب نے فرحانہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے ہوئے اسے خود سے قریب کھینچ لیا۔ قادر ابھر کر جب کہیں کہیں کاروبار کر رہی تھی اور کب دوں اس آگ میں جلنے لگے تھے، دوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شیطاں ان پر مکمل حاوی تھا اور پھر جب دوں ہوش کی دنیا میں آئے تھے تو فرحانہ نے زوہیب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پوچھ رہی تھی۔

”تم نے کیا کیا؟“ زوہیب نے کہنے سے پہلے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی بند تھیں۔

”زوہیب..... یہ ہے تمہاری محبت؟ تم نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا.....“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

کہا۔

”مجھ سے کہا تھا، کھنے، پینے، دھوئے میں آنا پھر جلدی کیوں آگیا؟“ فرحانہ نے زہیب کے جاتے ہی معصوم ساجد کے کال پر اپنی ٹھہر رسید کیا تو وہ زور زور سے رونا ہوا کرے سے نکل گیا۔

”شکر ہے میرا پان کا کیا باب ہو گیا..... اگر یہ اور جلدی آ جاتا تو ساری محنت رائیگاں چلی جاتی.....“

“و؟”

”یار تو تو پاگل ہو گیا ہے..... وہ فرحانہ شادی شدہ ہے۔“

”تو صحیح کہہ رہا ہے؟“ زو ہیپ کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔

نعمان اس سے بھی آگے کچھ بتاتا مگر زوہیب نے اسے روک دیا۔ اسے معصوم نظر آنے والی فرحانہ سے اتنے بڑے دھوکے کی امید نہیں تھی۔ وہ فرحانہ سے حقیقتاً سچی محبت کرنے لگا تھا۔

”کیوں شادی نہیں کر رہے تم مجھ سے؟“

”تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا فرحانہ.....؟“
 میں تم سے کبھی محبت کرتا تھا؟“ زوہیب زندگی آواز

”اوہ..... اگر تم نے ایسا کیا تو میں سب کو خاص



انسان میں درویشی

محسن بھالی کا خیال
خون رلا میں کے منظر، مت قریب آئیں
آئینہ کہہ دے، دہر، دُور سے تماشا کر

ایک نقل کی کر، بھر کہا، میں ہے انسان ہستی کی اس سطح پر بھی آسکتا ہے؟

اپنے شوہر اور بڑے بیٹے کے کام پر جانے کے بعد
گھر سے نکل گئی اور واپس نہیں آئی..... اور پھر نرسین
کی لاش تین روز کے دوران سو بجر بازار خانے کی
حدود میں چار مختلف مقامات سے گزروں کی صورت
میں لی گئی۔

نرسین کے قتل کی اطلاع دس مارچ کو لوگوں کو

اس وقت ملی جب سو بجر بازار

خانے کی حدود سے پولیس

ایکادوں کو پوری میں بند متوقولی

لاش کے ٹکڑے ملے..... اس کی

تفصیل چھ مہینوں سے کارڈوں

کے ایک نجی اسپتال کے قریب

واقعہ کچھ کنڈی سے پوری میں بند

خاتون کی لاش کے اعضائے

اطلاع پر پولیس نے انہیں اپنی

تحویل میں لے کر سول اسپتال

پہنچایا تھا۔ متوقولی کی لاش کو نامعلوم

میزبان نے جتنی حد ضرورت کے لیے اس کے مدد سے کاٹ کے

ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔ گیارہ مارچ کو سو بجر بازار

خانے کی حدود میں واقع پھیل پاؤ کی بکھر کنڈی

سے متوقولہ کاڑھ مل گیا جبکہ سو بجر بازار چلی مارکٹ کے

الان ان الحقیفہ!..... دنیا انسانوں کا جنگل بنی جا
ری ہے۔ اب یہاں انسان درویشوں کی شکل اختیار
کرنا جا رہا ہے۔ یہ جدیدی ظاہری نہیں بلکہ فطری طور پر
ہو رہی ہے۔ آپ کے سامنے بظاہر ایک انسان
موجود ہے جسے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے لیکن
یہ انسان کب درویش کی شکل اختیار کر لے گا۔ کب

اور سوچا نہیں جا سکتا۔ وہ کب

آپ پر بھٹ پڑے گا۔ کب

چھری سے آپ کا گلہ اڑا دے

بغض سے آپ کے ٹکڑے

کر دے اور وہ ٹکڑے شہر کے

مختلف مقامات پر کئے اور

بلیوں کے کھانے کے لیے

پھینک دے۔ جیسا کہ شہر

کراچی کے ایک علاقے کا قائد

آبادی کی رہائی خاتون نرسین

کے ساتھ کیا گیا ہے۔

تاکہ آبادی رہائی نرسین نے اپنے قتل سے

ایک روز پہلے 14 سالہ بیٹے کے سامنے نامعلوم

فحش سے سوبائے خون پر بات چیت کے دوران کہا

تھا۔ ”تم کل حراز کا قہر پر آ جانا.....“ اگلے روز وہ

زویب میرا آٹا ہے اور مجھ سے ناچا نہ تعلق استوار
کر رکھا ہے۔ اس کے بعد زویب نے اسے آٹھ
ہزار روپے ملانے دینا شروع کر دیے لیکن اب
تقریباً ایک ہفتے قبل فرحانہ نے زویب کو لون کر
کے کہا تھا کہ اُسے پاناٹش کی ہو گیا ہے اور علاج
کے لیے رہا وہ ہزار کی ضرورت ہوئی۔ زویب
فرحانہ کا یہ پاناٹش بہن کر چراغ ہو گیا تھا؟ اُس نے
ایک منصوبے کے تحت جس میں اُٹمان بھی شامل تھا؟
فرحانہ کو کچھ سوکھ بھلا یا تھا جہاں ایک گھر میں دونوں
نے فرحانہ کو زبانی کا نشانہ بنا کر اُسے اُس کے گھر

میں تار سے پھندہ لگایا تو وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر
دو بچے کی مدد سے اُس کے گلے میں پھندہ لگایا جس
سے وہ آدھی ہلاک ہو گئی اس کے بعد دونوں نے
کفر خانہ کو پوری میں بند کیا اور سر جانی تھانے کی
حدود میں پھینک دیا۔

پولیس فرحانہ کے سوبائے خون پر کال نہیں اور
ڈنکا کی مدد سے دونوں ملتان نوان اور زویب کو
گرفتار کر چکی ہے۔

تائین ”نجی کہاں“..... انعمان اور زویب

کی زندگیوں پر باد ہو چکی ہیں جبکہ فرحانہ اپنی زندگی

سے اچھے دوست بھی ہے۔ اس سارے قصے میں تصور

کس کا تھا ہے؟

فرحانہ کے شوہر میرا احمد کا..... جو اُسے یہاں

ایکلا چھوڑ کر ڈاکہ میں رہا ہٹس پڑیہ ہے؟ مہنگائی

کا..... جس سے تنگ آ کر فرحانہ ایسے معاملات اور

مطالبات پر مجبور ہو گئی اور زویب کو پیسے کمانے کا

زور دینا پڑا۔ سب کچھ سسٹم کا..... جو فاصلوں کو

مٹاتا چلی پل کی جبریں دینے پر مصروف ہے یا پھر

حالات کا ہمارے ملک میں روز بروز ایسے

واقعات اور حادثات بڑھتے جا رہے ہیں جو باعث

نکیر ہے۔

کر تمہارے گھر والوں کو بتا دوں گی کہ تم میرے
ساتھ زبانی کرتے رہے ہو.....“ فرحانہ نے اپنے
انگڑا کر ہر گالہ تھا۔
”اس کی ذمہ دار تم خود ہو.....“ زویب چیخا
تھا۔

”تم مجھے نہیں ہو زویب.....! اور تم جانتے ہو
میں ایسا کر بھی کبھی نہیں ہوں۔“
”تم چاہتی کیا ہو؟“

”میری خاموشی کی قیمت پانچ ہزار روپے ماہ
دار مجھے دو اور.....“

”کیا.....؟ پانچ ہزار روپے ہر مہینے.....؟ تمہارا
دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ تم مجھے بلیک سیل کر رہی
ہو.....“ زویب فرحانہ کی بات کاتے ہوئے غصے
سے چیخا تھا۔

”ہاں..... سچی بھول دیتے ہو تو ٹھیک درویش
کل ہی تمہارے گھر رہی ہو.....“ فرحانہ کی
دھمکی کا رد ثابت ہوئی اور زویب ہر مہینے پانچ ہزار
روپے فرحانہ کو دینے پر رضامند ہو گیا۔

.....

مارچ کا مہینہ تیزی سے اپنے دامن میں دونوں کو
سیٹ رہا تھا کہ ایک شام سر جانی ٹاؤن تھانے کی
حدود میں زبیر تیرہ گان کے سامنے پوری بند لاش ملی جو
متوقولہ فرحانہ کی تھی اور پھر پولیس نے اس قتل کا معمر
فرحانہ کے سوبائے خون پر آنے والی کال نہیں کر کے
حل کر لیا تھا۔

فرحانہ ایک عرصے تک زویب کو بلیک سیل
کرتی رہی تھی اور وہ اُسے پانچ ہزار روپے ملانے ادا
کرتا رہا تھا۔ اسی دوران زویب کی شادی ہو گئی
تھی۔ شادی کے بعد فرحانہ نے زویب کو دھمکی دی
تھی کہ اگر اس نے اُسے دی جانے والی رقم میں
اضافہ نہیں کیا تو وہ اُس کی بیوی کو جاکر تباہ کرے گی کہ

غزل

سرمقل اٹھایا جارہا ہے
مرا لاشہ چھپایا جارہا ہے
ہوا ساکت کٹڑی ہے ڈر کے مارے
دیا پھر سے جلایا جارہا ہے
ابھ کر بچ و دھم میں زندگی کے
تعلق کو جھپایا جارہا ہے
تارے زندگی میں کیا کروں اب؟
مجھے تم سے ڈرایا جارہا ہے
کوئی تو درمیاں ہے تیرا جو
مجھے دل سے بھلایا جارہا ہے
ہاتھ آسمان سے دور بیٹھے
زمین کو آزیایا جارہا ہے
ہم آشاہ

تو دہاں اس نے لاوارث لاشوں کے ریکارڈ میں اپنی بیوی کی تصویر دیکھی تھی۔ ایسی انتظامیہ نے اسے بتایا تھا کہ..... اس خاتون کی لاش نگلوں کی صورت میں ملی ہے۔ بعد ازاں شناخت کے بعد سرسرن کی لاش محمد شریف کے حوالے کر دی گئی تھی جس کی تدفین علاقے کے قریبی قبرستان میں کی گئی۔

اس کیس کے تفتیشی افسر نرزار کے مطابق اس واردات کا مقدمہ نمبر 1276/34 زبردستہ 302/34 کے تحت درج ہوا تھا اور مقتول کے شوہر محمد شریف کو حراست میں لے کر چند روز تک تفتیش کی گئی تھی لیکن یہ ثابت ہونے پر کہ وہ بے گناہ ہے پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ مقتول کے سوبائل فون کا ڈیٹا بھی نکلوا گیا جس کے مطابق اسے آخری تین کالیں بیکسلا سے کی گئی تھیں جو تین مختلف لوگوں نے کی تھیں۔ ان افراد کو کارپس بلایا گیا ہے جن سے تفتیش کے بعد کیس میں مزید پیشرفت ہوئی ہے۔ پولیس افسران اور لیڈی ایم ایل او نے پوسٹ مارٹم کے بعد بتایا تھا کہ..... مقتول سے ایک سے زائد افراد نے زانیہ کی تھی اور پھر گھبرا کر قتل کرنے کے بعد لاش کے ٹکڑے کیے گئے تھے۔

پولیس کی اس کیس کے سلسلے میں تفتیش جاری ہے اور امید تو یہی ہے کہ اس کیس کا مجرم باجمران بہت جلد پکڑے جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو سزا دی ہوگی؟ ہمارا قانون تو انسان کو انسان کے قتل کرنے کی سزا دیتا ہے لیکن انسان درودہ بین کر کسی انسان کو قتل کرنے زندگی سے محروم کرے تو اس کی سزا کیا یہی عام انسانی سزا ہوگی؟؟؟

☆☆☆

کی چابیاں بچوں کے حوالے کی تھیں اور انہیں کہا تھا۔ ”میں ایئر پورٹ جا رہی ہوں شام تک واپس آ جاؤں گی۔ تم لوگ تالہ کھول کر گھر چلے جانا۔ میں نے کھانا پکا کر کچن میں رکھ دیا ہے۔“ مقتول کے شوہر محمد شریف نے دورانِ تفتیش بتایا تھا۔ ”ایئر پورٹ کے علاقے میں سرسرن کی ایک منہ بولی بہن رہتی ہے وہ اکثر اس سے ملنے کے لیے وہاں جاتی رہتی تھی۔ میں نے بھی بار بار اپنی بیوی کو وہاں جانے سے منع کیا تھا لیکن اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ مورخہ دس مارچ کو میں گھر پہنچا تو بچوں نے



مقتول سرسرن

موائل فون مسلسل بند جا رہا تھا۔“ محمد شریف اور اس کے بیٹے کو مقتول کی منہ بولی بہن کے گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا..... آخر کار محمد شریف نے قاتل آباد قلعے میں جا کر اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی اور اپنے تمام رشتے والوں کو بھی اپنی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی۔ بعد ازاں اس نے شہر کے تمام سرکاری و دینی اسپتالوں میں اپنی بیوی کی تلاش شروع کر دی کہ کہیں وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار نہ ہوئی ہو اور پھر جب محمد شریف اپنی بیوی کی تلاش میں ایسے ہی سردخانے گیا تو

قریب سے مقتول کا سرا مل جو ایک چھلی میں بند کیا گیا تھا۔ پولیس نے جانے وقوعہ پہنچ کر مقتول کا سرا اپنی تحویل میں لے کر سول اسپتال پہنچایا تھا۔ بارہ مارچ کو مقتول کے ہاتھ اور پاؤں کا رڈن کے قریب واقع کچرہ کڈڑی سے ملے تھے۔ انہیں بھی چھلی میں بند کیا گیا تھا اس لاش نگلوں کی صورت میں ایسے ہی سردخانے منتقل کیا گیا تھا اور پھر ایسے ہی سردخانے میں سول مارچ کو مقتول کی شناخت 39 سالہ سرسرن زوجہ محمد شریف کے نام سے ہوئی تھی۔

مقتول سرسرن باج بچوں کی ماں اور قاتل آباد کی رہائشی تھی۔ مذکورہ کیس کے حوالے سے SHO سولہ بازار انہیکڑ خوشنور نے بتایا کہ مقتول سرسرن سے محمد شریف نامی شخص سے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی پہلی شادی فیصل آباد میں پولیس نامی شخص سے ہوئی تھی اور پھر میں برس قبل پہلے شوہر سے علیحدگی کے بعد مقتول سرسرن فیصل آباد سے کراچی آ گئی اور قاتل آباد میں کرائے پر گھر لے کر رہائش اختیار کر لی۔ یہاں سرسرن کی ملاقات محمد شریف سے ہوئی جو اسے پسند آیا تھا اور وہ بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ بعد ازاں دونوں نے شادی کر لی تھی۔ محمد شریف شطالیف میں واقع ایک کیران میں کام کرتا تھا۔ ان کے بچوں میں چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ دس مارچ کو گھر سے نکلنے کے بعد مقتول سرسرن اپنے بچوں کے اسکول گئی تھی۔ اس نے گھر

سنگ کہانی جیسے جگتے دوڑتے بھاگتے سچے منظر کی آنکھوں کی رزوا

رخسانہ سہام مرزا



ایک سہ ماہی کے بارے میں

ارتقاء دار فی خیال

نہ نرا وہاں کی حاجت نہ شمع منزل کی
ہے فاسق سرور کوئین رہبری کے لیے

ایک سہ ماہی کا روح پرور آنکھوں دیکھا احوال، رخسانہ سہام کے قلم سے

اب ہمیں بھائی مسعود کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اور وہاں تقریباً بیس سال بعد اپنی بیاری خالہ بی بی سے ملنا تھا۔ ہمارا بچپن اور ان کا لڑکپن ساتھ کرنا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی مشتاق دیدہ تھیں۔ سو دن میں پانچ مرتبہ فون پر پوچھ چکی تھیں۔
”رخسانہ! تم کب آ رہی ہو؟“
ان کی بے نیالی ان کی محبت کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ راپا انتظار تھیں۔
مکہ معظمہ سے جدہ کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا۔ ہم مغرب کی نماز کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ بہترین سڑکیں صاف ستھرا ماحول، ایک گھنٹہ کب گزر گیا؟ پتہ ہی نہیں چلا۔ راستے میں پھر خالہ کا دو ہاتھوں آیا تھا۔ ان پر یہ گھنٹہ بہت ہماری گزر رہا تھا اور پھر جب لوگ وہاں پہنچے تو وہ سر راپا انتظار نظر آئی تھیں۔ انہوں نے سب بچوں کو بلا لیا تھا۔ خالہ بی بی تو مجھ سے والہانہ اعزاز میں لپٹ گئی تھیں۔ بار بار میرا چہرہ دیکھنے اور پیار کرتی تھیں۔ شاید ان کو اب بھی میرے اندر وہ چھوٹی شریک زرخندانہ نظر آتی ہو۔

آری تھی۔ میں نے کہا تھا۔ ”خالہ بی بی! اب میں بڑی، سچی ہوں۔“
”تم کتنی ہی بڑی ہو جاؤ میرے لیے؟“ وہی.....
میں نے درمیان سے بات ایک لی۔ ”نفسی جاسوس.....“
میرا کام صرف خالہ بی بی کی جاسوسی کرنا ہی تو تھا اور دوسری خالہ جنہیں میں گڈی خالہ کہتی تھی، کو رپورٹ دیتی تھی کہ میری جاسوسی کا اصل محرک وہی تھیں۔ جب خالہ بی بی گھر سے باہر ادھر ادھر پاس بڑوں میں محوم کراتیں اور میں جو رزوا سے پر خوش آن کا انتظار کر رہی ہوں، دل ہی دل میں کہتی تھی۔ اب آئیں خالہ بی بی کی کہ پتی.....! اور پھر وہ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئیں تو میں گڈی خالہ کے سامنے اپنی جاسوسی کا چارہ کوئی بھی اور پھر میں خالہ بی بی کی ایک تھی دیتی تھیں۔
”چھوٹی آ!.....! میں نے ایسا نہیں کیا۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کسی ایسا نہیں کہا تھا کہ رخسانہ چھوٹ بولتی ہے بس وہ اپنی من مانی پیش کرتی رہتیں اور پھر جب اس کے باوجود ان کو سزا مل جاتی تھی گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگ جاتی تو وہ مجھ سے ناراض ہونے کی بجائے کہتیں۔
”چلو آؤ کہانیاں سناتی ہوں۔“
ارتقاء دار فی خیال



رخسانہ سہام، مسجد نبوی کے دروازے کے سامنے

اور پھر وہ مجھے شہزادی شہزادے جن دیوار دیوار کیوں کہانیاں سناتے تھیں۔
”دیکھو! سب کچھ نہیں کہانی ہے۔“
”تم میں غصے میں ان کے کان دے کر کات لیتی۔“
”نہیں..... نہیں.....“
وہ فوراً ہار مان کر کہتیں۔ ”اچھا! میرا کھانا تو چھوڑ دو۔“
میں کوئی خالہ بی بی کی اصل دشمن تو نہ تھی اور

مگر وہ مجھے ہٹا کر دم لیتیں! بس یہی میری دشمنی تھی۔ میں فوراً جا کر گڈی خالہ کے کہتی تھی۔
”خالہ بی بی! اپنی دوستوں کے ساتھ چائیں کیا باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے وہاں نہیں بیٹھنے دے رہی ہیں۔“ بس یہی میری جاسوسی تھی۔
گڈی خالہ کہتیں۔ ”اچھا! آئے دو۔“
اور پھر خالہ بی بی آئے کے بعد لاکھ کہتیں۔
”چھوٹی آ!.....! میں نے ایسا نہیں کیا۔“



زین کا بھائی اور سید مصطفیٰ کے ساتھ

Mail لے گیا تھا کہ تمہیں جو چیز بھی پسند آئے صرف اپنے لیے ہی نہیں دانیال کے لیے بھی خرید لیا۔ وہ لوگ مال کے تو منزروہ اور خالد کی بیگم عاشرہ کے ساتھ چلی گئی تھیں بس میں اور خالد بی بی وہیں کافی شاپ میں بیٹھے رہ گئے تھے اور پھر بس وہ لوگ ہی تھیں میں سستی رہی تھی۔ درمیان میں ایک خط بھی نہیں بولی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف مجھ سے بولنا چاہتی ہیں۔

پوچھا تھا۔
”بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے کیونکہ تم جو چارٹی ہو۔“
خالد بی بی کے چہرے پر ایک ہنسکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی۔
”خالد بی بی..... میں تو جانے کے لیے آئی تھی۔“
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“
”تو پھر دکھ کیوں؟“

”دکھ تو ہوگا بس۔“ خالد بی بی نے ہنسکی مسکراہٹ اور ہنسکے لیے جس کچھ ایسے کہا تھا کہ میں نے بے اختیار اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ خالد بی بی نے میرے سر پر ہاتھ پھر کر کہا تھا۔
”بھگوانا کاشا مالہ!“
میں منزروہ اور زین کاؤٹی میں بیٹھ گئے تھے اور

پوچھی تھی۔

”حلیب تہوہ“

مگر وہ ایک نہ سنیں اور سزا کا اعلان کر دیتیں کہ اب تم کمرے سے قدم نہ نکالنا اور خالد بی بی کو خوشی خوشی سزا قبول کر کے گھر میں بیٹھ جاتیں اور خرچے کی بات یہ ہوتی کہ پھر میں اُن کی پیٹام برہن جاتی اور وہ پیٹام جو خالد بی بی اپنی سیلیوں کو دیتیں، میں لے جاتی اور اُس کی کوکڑ نہیں ہونے دیتی تھی۔ یہ بھی



میری بھاری خالد اور میں

میری اور خالد بی بی کی محبت!!
لے لانے کا سلسلہ ختم ہوا تو خالد بی بی کی سیڈ (maid) نے تہوہ اور بہت سارے خشک میوے حلوے میز پر سجادیے تھے۔ ہم پھر سے چائے پینے والے۔ جب دودھ کی چائے مانگی تو اُس نے پوچھا۔
”حلیب تہوہ“

”دوسرے دن خالد بی بی کا چھوٹا بیٹا خالد ہمیں سمندر پر لے گیا تھا۔ وہاں ہم نے بڑا لذیذ کھانا کھایا تھا پھر وہ زین کو یہ بیچارہ احکم دیتے ہوئے



جدہ ساحل..... کچھ وقت بعد وقت کے لیے

باب ریگت روا تھا کہ اکثر مسافر کھڑے ہو گئے دیکھئے گا۔

تھے۔ یہاں مستقل کھد پاتا تھا۔

”جب تک جہاز رک نہیں جاتا سیٹ نہ لیں۔“

مگر جناب..... وہ اللہ کی نہیں سننے تو پاکستان

صاحب کی کیا سنیں گے۔ جہاز میں اینڈریش

ہوئیں گے۔ پاکستان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی

اے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ نہیں سمجھ پائے۔

خاتون نے کہا: ”بیٹھے جاؤ بیٹھے جاؤ۔“

”ارے بی بی!..... ان کو ان کے حال پر چھوڑ

دیتے۔“ میں نے دل ہی دل میں مشورہ دیا تھا اور یہ

کر کرنے لگی تھی کہ..... ہمارا بیٹھ کچھ کوئی دوسرا

لے جائے مگر اس سب کے باوجود ہماری ایک ذم زہم

کی بوس غائب تھی۔ اپنے وطن واپسی پر کوئی پاکستانی

خاتون تھا تو سہل گیا۔ اس بوس پر زین کا نام اور یہ

لگا تھا۔ ہم نے بوس لے جانے والے کو معاف کیا

مگر ہمارا ذم زہم پتے پتے وقت بوس پر لکھے نام کو سن کر دوا

کراچی پہنچ کر میں نے سب سے پہلے خالہ بی

بی کو سمجھایا کہ فون کیا تو وہ اس وقت ڈاکٹر کے پاس

پہنچی تھیں۔ میں نے دل میں کہا۔ ”برخسانہ۔“ اہم

دہا کیوں کی تھی؟

پھر دوسرے دن میں نے فون کیا۔ طبیعت

پوچھنے پر بولیں۔

”تمہارا چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خالہ بی! ابھر آؤں گی انتہاء

اللہ!“

وہ بولیں۔ ”مکمت جانا۔ میرے پاس آنا۔“

میں نے کہا۔ ”وہاں بھی جاؤں گی اور آپ کے

پاس بھی رہوں گی۔“

یوں خوش ہو گئیں جیسے ابھی کل پھر میں ان کے

پاس پہنچ رہی ہوں۔

لڑنے والیاں انگریزی زبان میں ایک دوسرے
تا پوتو بٹلے کر رہی تھیں۔ انگریزی بولنا ہمارا
فریضہ بنے دنیا کے تری یافتہ ملک اپنی زبان پر
ہیں اور اس وقت وہ تری کے لحاظ سے کہاں ہیں
اور ہم..... پس جانے دیجئے۔

ایک خاتون کو بورڈنگ لاؤنج میں یاد آیا کہ

اپنا پرس اچھروم میں بھول آئی ہیں وہ دنوارہ دار

روم جانے کے لیے سیر جیوں کی طرف بھاگیں

کے کھڑے ہوئے پوچھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”میں اپنا پرس بھول آئی ہوں۔“ بیوی کا ذہن

ن کر شوہر صاحب نے ڈانٹا شروع کر دیا تھا۔

”نست جاؤ پھوڑو دم کو پکڑ لیں گے ہاتھ

بھڑکایاں ڈال کر تیل بیچ دیں گے۔“

خیمہ نہ تھیں اور نہیں لینے چلی گئیں۔ شوہر

فروری اپنے پاس کڑی والدہ سے کہا تھا۔

”یہ سچی عورت نے میری شادی کر دی تم کو

ہی کی تھی؟“

چند منوں بعد وہ خاتون اپنا پرس لے کر آ

تھیں مجھ سمیت سارے لاؤنج کے مسافر ان

ہاتھ میں جھکڑیاں تلاش کرنے لگے تھے لیکن

تو ان کے شوہر کی خواہش تھی مگر کوئی تماشہ نہ

بہر حال یہاں مجھے میرے مزدور بھائی یاد آیا کہ

تھے۔ کیا لیتا کیا فریضہ تھا نہ جہاز میں سوار ہوئے

جلدی دنا تھے میں نے بے مبری..... جن جلال کا

اور کھانے والے ایسے ہی ضابطہ ہوئے ہیں۔ میرے

پھر جب گاڑی چلتی تو ہم نے مرکز نہیں دیکھا تھا۔
جدہ ایئر پورٹ پر کافی رش تھا۔ لوگ عہر کر کے
آکر بیٹھے لیکن وہاں ایک طوفان بدتمیزی تھا وہاں
کوئی کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا نہ
بچوں کا خیال نہ عورتوں کا لالچا یہ سب لوگ عہر کر کے
جا رہے تھے لیکن ادب، تہذیب اور لحاظ کے دامن
سے غاری لوگوں نے کوئی سبق نہیں لیا تھا۔ سیکھا نہیں

تھا جہاز پر سوار ہونے کے معاملے میں جلد بازی

بدتمیزی کا یہ عالم تھا کہ امان الحفظ لان نہ سمجھ لوگوں

کو کون سمجھاتا کہ جہاز انہیں کسی بس کی طرح چھوڑ کر

نہیں جائے گا۔ خالی روانہ ہو کر اپنا بیڑا نہیں

چلائے گا مگر وہاں تو نہ زبان پر لگا مٹی نامی ہاتھ

میدوں پر اٹھتا..... ایک وقت تو مجھے ایسا لگا تھا کہ

اب مار پیٹ شروع ہو جائے گی سو مجھ سے ذرا ہلایا

تھا۔ میں نے کہا تھا۔

”اللہ کے واسطے خاموش ہو جائے یہاں

ایک دوسرے کی چوکیاں مت اچھالنے میں چار

کھٹے کھٹے کے بعد آپ پاکستان پہنچ جائیں گے وہاں تو

آپ اور پدر آؤں ہیں ساری ٹھڑاس نکال لیجیے

گا۔“

مگر میری صدا تو وہاں بٹار خانے میں طوطی کی

آواز تھی، تنویری دیر میں کاؤنٹر کل گئے تھے اور لوگ

ایک دوسرے سے فارغ ہونے کے اور بورڈنگ کارڈ

لی لے لگے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بورڈنگ کارڈ

ملنے کے بعد بھی لوگ دھکم بھل میں لگے ہوئے تھے

جبکہ بورڈنگ کارڈ ملنے کے بعد تو جہاز نے ان کو لے

کر ہی جاتا تھا۔

ایک کاؤنٹر پر ہماری دو خواتین ہالوں کی طرح

لڑ رہی تھیں اور سووری ایئر لائنز کے دفتر بند کر کے

تماشہ دیکر ہاتھ عربوں کی خاصیت سے کردہ بہت

کم بولتے ہیں، اس خاموشی سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

نعت

طیبہ کی ہواؤں کی تاثیر زناں ہے
محبوب کی گلیوں کی تصویر زناں ہے
شہاں زمانہ بھی دیکھے ہیں گداؤں کے
طیبہ کے گداؤں کی تقدیر زناں ہے
جنت بھی خدا اُن پر قرباں ہے کعبہ بھی
محمد ﷺ کے رونے کی توفیر زناں ہے
قرآن کی صورت میں الفاظ گئے دھلتے
سلطان مدینہ کی تقریر زناں ہے
قیہ میں لائیکہ بھی نرسل بھی امیران اُن کے
محبوب کی زلفوں کی زنجیر زناں ہے
مکرم مصور کا عکاس ہے ہر پہلو
بے مثل مصور کی تصویر زناں ہے
رونے پہ نگاہیں ہیں اور گلیاں مدینہ کی
فرحانہ ترے خوابوں کی تعبیر زناں ہے

✽

مولانا شہید الاسلام المصری

اب یہاں واپسی کے بعد یادوں کی کتاب
اور وہ چہرے جو میرے اپنے تھے۔ خالہ بی بی
پاس بیٹھنے کے بعد پہلے دن سے ستر کے آ
سرے تلک میرے چھوٹے بھائی حسین ہمار
ساتھ رہے اور پھر منہ تمام وقت اُن کے ساتھ
رہی۔ ہر گئے ماموں کی پکار گئی۔
”ماموں.....! آؤ کس کریم کھانی
ماموں.....! مجھے تھکا چاہے۔ ماموں.....! یہ
کیسے ہوگا ماموں.....! ماموں.....! اور ماموں
واقعی محبت پر کسی کی اچارہ داری نہیں
محبت کرنے وہی اپنا ہو جائے۔ یہ منظر دیکھ
میرا دل چاہتا تھا کہ میرے ماموں بھی سارے
آجائیں۔ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرے
تھے۔ میری ہر ہر بات پوری کرتے تھے۔
کہتے تھے کہ ”خزانہ کے پاس ہر مرض کا علاج
ماموں ہیں۔“
کل میں اپنے ماموں کے ساتھ جہاں تھی
آن منہ زانہ حسین ماموں کے ساتھ وہی تھی اور
حسین تو اس ستر کے آغاز میں اس ستر کی منہ زانہ
کارروائی سے لے کر ہمارے سعودی عرب
خروج تک کسی ٹیلی فون مشوروں تو کبھی بذات
ہمارے ساتھ ساتھ تھے اور لگ رہا ہے کہ جیسے
بھی ساتھ ہی ہیں۔
حسین کی طرح مسعود نے بھی کوئی کی
چھوڑی۔ مدینہ میں ہوئی کی بنگ سے لے کر
تک ہمارے جدہ جانے تک ہر قدم پر ساتھ
رہے۔ مسعود بھی ایک رشتے سے میرے ماموں
بھی ہیں اور بھائی بھی۔ ماموں.....! ماں
منہ.....! واقعی بہت پیارا رشتہ ہوتا ہے اُس سے یہی
قضا بھی حقیقت تھی۔

☆☆☆

میری کہانی میری زبانی سچی کہانیاں کے لکھاری اور قارئین کی کہانی لفظوں کی زبانی

انور فرہاد

رونگی لکھاری اور قارئین

حادثہ سید کا خیال
زبان رکھتے ہیں پھر بھی چٹائیں ہوتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں ہوتی ہیں

ہمارے ستر ترین لکھاری کی پھر رونگی کی کہانی کا آخری حصہ

فرہاد.....! میں تو نگار چھوڑ کر جا رہا ہوں میں نے
بھائی الیاس سے بات کر لی ہے تم میری جگہ کام
شروع کر دو۔“
”مگر آپ کیوں نگار چھوڑ رہے ہیں؟“ میں
نے گھرنہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا کوئی پریشانی ہو گئی ہے
یہاں؟“
”جیہاں! ایسی کوئی بات نہیں بات دراصل یہ ہے
کہ فیض احمد فیض اور سید سبط حسن ایک سیاسی ہفت
روزہ ”میل و نہار“ نکال رہے ہیں۔ مجھے اس پرچے
کی آخر آئی ہے۔ میری اہلی فلیف وہی ہے یہاں تو
میں بس وقت گزار رہا تھا۔“
اس طرح حسین اعلیٰ اپنی کرسی پر مجھے بٹھا کر
خود ”میل و نہار“ چلے گئے۔ میں نے نامہ نگاری
حیثیت سے ”نگار“ سے جو رشتہ جوڑا تھا کوئی ایک
عشرے کے بعد وہ میرے سب ایلٹیرین بن جانے
کے بعد مزید بڑھ گیا تھا۔ یہاں اس حیثیت میں
میں نے کم و بیش چار سال تک ملازمت کی پھر ایک

وقت آیا کہ اس ادارہ سے علیحدہ ہو گیا لیکن کسی ناممکنی یا تجاز سے کہ سب نگار کی ملازمت نہیں چھوڑی تھی بس زیادہ آمدنی کے لالچ میں یہ لوگ بھی چھوڑی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اس ملازمت کے دوران ”قلم اور فیشن“ کے نام کے ایک مفت روزہ میگزین میں مجھے پرتے پرتے نوکری مل گئی تھی۔ میں نگار سے شام پانچ بجے چھٹی کر کے پریس چیئر چلا جاتا تھا۔ ”قلم اور فیشن“ کا دفتر تھا۔ یہ جریدہ صرف قلم جزمیہ اقبال احمد خان کا تھا جو شادی کے بعد مستقل طور پر لندن سدا رہے تھے جاتے وقت اپنا یہ میگزین فروخت کرتے خریدنے والے عمدا اور خان اور طاہر رشوی (غالبان کے بہن نام تھے۔) تھے جو بنیادی طور پر کاروباری لوگ تھے اور ان کی طرح کے کام کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک پرچم پر بھی نام آباد میں تھا۔ انہوں نے پرچے کی خریداری کے بعد اپنے طور پر ایک اشاف تو رکھ لیا تھا مگر انہیں ایک تجربہ کار کی ضرورت تھی۔ یہاں چند مہینے میں جڑوئی طور پر کام کیا تو مالکان نے بہت متاثر ہوئے اور اسرار کرنے لگے کہ آپ ہمارے پاس نقل نام ملازمت کر لیں نگار کو چھوڑ کر ہمارے پاس آ جائیں۔ نگار والے آپ کو کیا دیتے ہیں؟

”ہم آپ کو چھوڑ دوں گے۔“

واقعہ رہے کہ وہ شام کے دو گھنٹے کے مجھے دو سو روپے تحفہ دیتے تھے جو اس وقت کے لحاظ سے خاصی معقول رقم تھی۔ میں نے بھائی الیاس رشیدی کے سامنے ساری صورت حال بیان کر دی تھی۔

”اکرم تم اپنے بہتر مستقبل کے لیے جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں روٹوں کاٹیں دے مجھے نہ تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں اور ذہنی شاید مجھ سے نہیں کوئی

شکایت ہوگی۔“ انہوں نے میری بات سن کر کہا تھا۔ اس طرح میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نگار چھوڑ قلم اور فیشن چلا گیا تھا۔

میری بیگم میرے اس فیصلے پر خوش نہیں تھیں۔ ”میرا خیال ہے آپ نے اچھا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ نیا ادارہ ہے نئے لوگ ہیں۔ نگار کی منظم ادارہ ہے۔ ہر کسے کو وہاں تحفہ یہاں سے تمہیں مگر ملازمت کی سیکورٹی تو تھی۔“

اس وقت تو مجھے اپنی المیہ کی باتوں کی اہمیت سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر ایک سال کے بعد یہ جب ”قلم اور فیشن“ کو چھوڑنا پڑا تھا تو مجھے یہی بات شرت سے یاد آئی تھی۔ ”قلم اور فیشن“ میں میں مکمل طور پر ایڈیٹر کا کمرے ساتھ جو اشاف تھا اس کا مجھے مکمل تعاون حاصل تھا۔ پرچہ بڑے اچھے اعزاز میں پابندی وقت کے ساتھ نقل رہا تھا۔ مالکان مجھ سے بہت خوش تھے، میری جوانی کے بعد دفتر پر میں جیسے میرے شفٹ ہو کر نام آباد نمبر ایک آ گیا تھا جہاں ان کا ایک پرچم پر میں بھی تھے۔ ان کے پریس کا کام بھی بہت ٹھیک تھا کہ طریقے پر چلتا تھا۔ ایک صاحب جو پریس کے سینیئر تھے انہیں بھی کچھ لکھنے کھانے کا شوق تھا۔ ان کا ایک کام بھی ”قلم اور فیشن“ میں چھپتا تھا۔ وہ مالکان کی گڈک میں شامل تھے۔ پریس چپس کھتے چلتا تھا۔ کیش کیش پوزیشن اس کی بہت اچھی تھی مگر جب دو تین مہینوں کے بعد پریس سے متعلق حساب کتاب ہوتا تو معلوم ہوتا کہ منافع کی بجائے گھانا ہو رہا ہے۔ بات دراصل یہی کہ سینیئر اور پریس کا کچھ آپریٹر دووں ل کر مالکان کی آنکھوں میں حوصلہ جھونکتے تھے۔ رات کی شفٹ میں جب دن کا کوئی ٹیکہ نہیں ہوتا تھا دووں شراب اور جناب کے شوق میں بڑی بے دردی سے ادارہ کا پیسہ خرچ کرتے تھے۔

جب مالکان کو درون خانہ کی گڑبگڑ کا احساس ہوا تھا تو شاطر سینیئر نے انہیں ”قلم اور فیشن“ کے مسئلے پر انجمنہ انور پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ مالانہ میٹنگ کے دوران سینیئر صاحب بھی شریک ہوتے اور پرچے کے بارے میں مختلف مزا نات سے اعتراض اور کرتوت جن میں خاص پرچم کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا اور کہا کہ جاتا کہ کتاب اتنی ملتی کی کہ پلٹ پر اس کا نقصان بڑھ کر سامنے آیا ایڈیٹر صاحب نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے پرچے کی ساکھ پر ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے۔ جن انہی منافع عادت سے مجبور ہو کر یہ بات آگے نہیں بڑھاتا کہ ”ٹھیک ہے آئیہ آئیہ میں اس باتوں پر مزید توجہ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی غلطی دوبارہ نہ ہو۔“

میری اس منافع جی ڈی سے میرا اشاف خوش نہیں تھا۔ ایک دن ان سب نے میرا ٹھکانا دیکھا اور کہا: ”انور صاحب!..... آپ کیوں اپنے ناکردہ کاموں کا عذاب اپنے سر لے لیتے ہیں؟ آپ کمال کر بات کیوں نہیں کرتے؟“

”کیا بات کروں مکمل کر؟ اس طرح معاملات بگڑتوں جائیں گے؟“

”معاملات بگڑتے ہیں تو بگڑنے دیں مالکان سے کہیں ہم پر غلط اثرات لگنا بند کریں۔ صورت دیکھ ہمارا کتنی قبول کریں۔ آپ کے ساتھ ہم تمام لوگ بھی استغنی دے دیں گے۔“

ایک وکیل صاحب تھے جو مالکان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے انہوں نے بھی کہا: ”ہاں انور صاحب!..... اپریس والے اپنا ملہ آپ پر اور آپ کے اشاف پر ڈال رہے ہیں اس موقع پر خاموش رہ کر آپ نہ صرف اپنے آپ پر اور اپنے اشاف پر قلم کریں گے بلکہ مکمل جرم کو مزید مکمل کھینچ کر مرنے دیں گے۔“

اس کے بعد ہم نے ایرائی کیا! اجتماعی طور پر اسے استغنی مالکان کو کھادے جس کے بعد نہ صرف ”قلم اور فیشن“ بند ہو گیا بلکہ کچھ دنوں کے بعد وہ پریس بھی اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا۔

”پورے کے لالچ میں آدھے سے بھی گئے؟“ بیوی نے انہی بات یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”جو ہونا ہوتا ہے وہ ہونا ہو کر رہتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے انہیں جھاننے کی کوشش کی۔ اب میری در بدری اور پریشانی کا دور شروع ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد سینئر صاحب نے میری علوی نے روزنامہ ”مصلحت“ لگایا تو وہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے ایڈیٹر مل سکھ میں میرا فقر ہوا تھا مگر علوی صاحب ہر طرح کا مجھ سے لے لیتے تھے۔ ادارے کے کھانا سے اس کے ساتھ ساتھ ریوڑی کر دیا لیتے تھے۔ اگرچہ وہ بڑے سینئر سماں تھے لیکن مگر بار دوستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ ان سے باری دوستی کا سلسلہ اب دیکھ کر شروع ہو گیا تھا قابل ذکر بات ہے۔

جن دنوں میں ”نگار“ میں ایڈیٹر کیا کرتا تھا ایک لڑکا اپنے انہی منافع میں کے کمرے سے پاس آتا تھا۔ اس کا پورا نام تو ایڈیٹر رہا الیاس کے نام کا ایک حصہ ”مردود“ یاد رکھیے۔ ایک بار اس کے ساتھ جن بھوتوں کا تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے کہا۔ ”مجھے بھی کراچی کے چند بھوتوں کا قصہ معلوم ہے۔“

یہ سنتا تھا کہ وہ ایک دم میرے پیچھے پڑ گیا۔ ”انور صاحب!..... بھلی فرمت میں یہ مجھے کچھ لکھ کر دے دیجیے۔“

”ارے یار!..... اچھی ہے قصے کیا کرو گے؟“

”میں تمہیں بتاؤں گا انہیں اپنے گلے میں نہیں ڈالوں گا۔ میرے ایک کرم فرما پیسہ میری علوی وہ

”مضعل“ ڈائجسٹ کے نام سے ایک پرچہ نکالتے ہیں۔ میں اس پرچے میں ان کی معاونت کرتا ہوں آپ کی کہانی ہی امی ”مضعل“ ڈائجسٹ میں چھاپیں گے۔

”اگر یہ بات ہے تو میں لکھ دوں گا“ دو چار دن بعد آکر لے جانا۔“ اور پھر میں نے دو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ دیں جو میں نے نگار ہی کے ایک قلم کار کی زبانی سنیں۔

عروج نے بتایا۔ ”نیرولوی صاحب کو آپ کی کہانیاں بہت پسند آتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اب ہر شمارہ کے لیے ان سے ایسی ہی کہانیاں لکھواؤ۔“

”اگرے بار..... اتم نے تو مجھے اچھی مصیبت میں ڈال دیا مجھے کہانیاں وغیرہ لکھنے کی فرمت کہاں ہے؟“

مگر وہ بعد کہ کہانیاں تو آپ کو لکھنی ہوں گی۔ اب جان چڑانے کے لیے میں نے کہا۔ ”بھئی یہ کام میں غصے میں نہیں کروں گا۔“

انکی ملاقات میں عروج نے کہا۔ ”علوی صاحب آپ کو معاوضہ دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ کو ایک کہانی کے 35 روپے پیش گئے۔“

یہ 73-1972ء کا دور تھا اس زمانے میں یہ 35 روپے ہی بڑے پڑے قیمت تھے۔ میں رضامند ہو گیا اور ”کراچی کے نبوت“ کے مستقل عنوان کے تحت ہر مہینے میری کہانیاں شائع ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک نئے عنوان ”شاہک رات“ کے تحت بھی کہانیاں لکھوانے لگے۔ اس طرح ہر مہینے 35 روپے کہانوں کے معاوضے ملتے گئے۔ اپنا سلسلہ مستقل ہونے کے بعد میں خود ”مضعل“ کے دفتر جانے آئے گا اور نیرولوی صاحب سے بڑی اچھی انٹراسٹینڈنگ ہوگی۔ اس پرچے کے مالک

انتخاب باتری تھے اور نیو چالی کے علاقے میں واقع ان کے گھرانی اخبار کے دفتر سے ہی ”مضعل“ شائع ہوتا تھا۔ کوالی ڈیڑھ سال کے بعد بوجہ یہ پرچہ بند ہو گیا لیکن نیرولوی سے میری دوستی برقرار رہی۔

”مضعل“ کے بند ہونے کے بہت بعد انہوں نے ”صدقات“ نکالا تو اسی پرانے حوالے سے مجھے اس ادارے میں رکھا۔ یہ اخبار کی زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ ایک بار پھر دو بددی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد روزنامہ ”انجام“ کا بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ اہرام ہوا۔ اس کے قلم نویسین کے انچارج کے طور پر میرا فخر ہوا مگر ابتدائی دنوں میں ہی یہ غیونہ کیلے مگر جمایا۔ انجام درانی المعروف ڈیڈی کے ہاں میں نے اس اخبار کا قلم شروع کیا۔ ہماری خوش حالی میں ہی کچھ بدحوالی میں بدل گئی اور ایک بار پھر میں بے کاری کے شب و روز گزارنے لگا۔

ایک دن ہمارے ایک دیرینہ دوست ایم ایس اس نے مجھ سے کہا۔ ”میرے ایک دوست غلام محمد غوری ہیں وہ ”ست رنگ“ ڈائجسٹ نکالتے ہیں۔ انہیں ایک بندے کی ضرورت ہے۔ چاہو چل کر دیکھ لو کہ تم ان کا مطلوبہ کام کر سکتے ہو یا نہیں ان کے ہاں بنیادی کام تو پروف ریڈنگ کا تھا مگر اس کے ساتھ وہ مجھ سے کہانیاں بھی لکھواتے اور انگریزی ناولوں کی تصنیف بھی کرواتے۔ یہی پارٹ نام مجھے طبیعت میں دس سے ڈیڑھ بجے تک۔ اسی دوران میں منیر حسین صاحب کے قلمی ماہنامہ ”قلم الہی“ کے لیے لکھنے کی مضامین لکھ دیا کرتا تھا جس کے معاوضے وہ بڑی پابندی سے دیتے تھے۔ ایک دن منیر صاحب کہنے لگے۔ ”آدھے دن کی نوکر ہی ہمارے قلم ایشیا میں بھی کرلو۔“ اس طرح میں ”ست رنگ“ کے دفتر سے نکل کر قلم ایشیا جانے لگا تھا۔ کچھ عرصہ گزرا تھا تو ایک روز منیر صاحب نے

کہا تھا۔ ”ہمارے پاس ہی نفل ٹائم چاب کرلو۔“ اور میں نے دو پارٹ نام چاب کی جبکہ ایک نفل ٹائم ملازمت کرنی اور کوئی سولہ سترہ سال ان کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں نے فنی لائسنس کے طور پر مختلف پرچوں اور ڈائجسٹوں میں لکھا جن میں ”ٹی وی ناٹس“ اور ”مودی ڈائجسٹ“ کے علاوہ سپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی دنیا بھی تھے۔

قلم ایشیا میں نے اس لیے چھوڑا تھا۔ ان دنوں میں سخت مشکل تھا جوڑوں کے روز کارنامہ پر اصرار تھا جو ان دنوں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مجھے مکمل علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ چھ مہینے کے مکمل علاج کے بعد میں صحت یاب ہوا تو ”لہریں“ نام کے ایک ماہنامہ جریسے سے وابستہ ہو گیا۔ یہ سارا چھ مہینے اکیلے ایڈٹ کرنا پڑتا تھا۔ ایک سال تک اس کا پرچہ دیا۔ ابھی ”لہریں“ بند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ماہنامہ ”مرکزگشت“ ڈائجسٹ کے لیے ایک قلمی مضمون سابق شرقی پاکستان کے سابق اداکار رحمان پر لکھ کر دفتر بھجوا دیا۔ ”مرکزگشت“ سپنس ڈائجسٹ کے ادارے سے نکلنے والا ڈائجسٹ تھا اس کے ایڈیٹر انچارج انور فراز کو یہ تحریر بہت پسند آئی۔ انہوں نے مجھے دفتر بلوایا اور یہ پچھا۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“

”ایک غیر معروف پرچہ ہے ”لہریں“ اسے ایڈٹ کر رہا ہوں۔“

”کیا پیسہ دیتے ہیں وہ؟“

”تین ہزار روپے۔“

”اس پرچے کو کوئی ماریں اور ہمارے ہاں مستقل لکھیں۔“ آپ کو اس سے زیادہ پیسے ملیں گے۔“ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے کوئی مارنے سے پہلے ہی ”لہریں“ کی ٹیلی موت واقع ہو گئی۔ میں

نے ”مرکزگشت“ اور اس ادارے کے لیے بہت لکھا اور بہت کمایا مگر 1992ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا جس کے بعد میں شہر سے نکلنے والے دیگر ڈائجسٹوں اور میگزینز کے لیے لکھنے لگا اور فنی لائسنس ہی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں ”اسکرین ڈائجسٹ“ کے نام سے ایک نئے قلمی ڈائجسٹ کی ادارت بھی کی۔ الف سے ی تک ساری تحریر میری ہی ہوتی تھی۔ وہ خوبصورت جریہ تھا مگر اس کے مالک اپنے دیگر کاروبار کی وجہ سے اس پرچے پر توجہ نہیں دیتے تھے انجام کار کی شاروں کے بعد ہی اسے بند کر دیا تھا۔

ایک دن میں روزنامہ ”ایکسپریس“ کراچی کے دفتر میں اپنے بچہ سمائی دوستوں سے ملنے کی غرض سے گیا تھا جن میں محمد صوفی اور حیات عزیز فنی وغیرہ سرپرست تھے۔ میں رپیشن میں بیٹھا ان لوگوں سے باتیں کر رہا تھا کہ ”ایکسپریس“ کے ایڈیٹر نیرولوی دفتر میں داخل ہوئے تو مجھ پر نظر پڑتے ہی میرے پاس آ گئے۔

”اگرے بازو تم کہاں ہو؟ ایکسپریس کے اجرا کے زمانے میں شہر کے صحافی آ کر مجھ سے ملے مگر تم نہیں آئے؟“

میں نے ان کی محبت کا شکر یہ ادا کر کے ہوتے کہا۔ ”اب یہ نہیں آتا مجھے ملازمت نہیں کرنی ہے۔ اس میں فنی لائسنس کر کے ہی دال روٹی کا بندوبست کر لیتا ہوں۔“ اور پھر ان کے کہنے پر میں نے کچھ دنوں تک وہاں بھی کھار کھار پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ایک دن میں صفت روزہ ”نور جہاں“ کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ میرے نو جوان سمائی دوست شہنشاہ حسین رضوی آئے انہوں نے کہا۔ ”ایک بیک ہی خبر لے کر آیا ہوں اور وہ خبر یہ ہے کہ نگار نگار کا رول اور ڈ



تجھ کو شاید نہیں خبر سائیں
عشق کرتا ہے معتبر سائیں
تیرے قدموں میں رکھ دیا خود کو
اب جو چاہے سلوک کر سائیں
اپنے صدمے سے مار دیتا ہے
عشق مٹا نہیں اگر سائیں

تجھ کو چاہا نہیں، خدا کی قسم
تجھ کو پوجا ہے عمر بھر سائیں
بھول جاؤں میں کس طرح سب کچھ
زور چلتا ہے عشق پر سائیں

ساٹوں کی ہوا ہوں آج مجھے
اپنی مٹھی میں قید کر سائیں

عکاشہ محرم

کر آؤں۔ بہن حسن نگار کا تعلق نہ صرف الیاس
بھائی سے بڑا پرانا تھا بلکہ رشتہ حقیتاً انہی کا پرچہ تھا جسے
بھائی الیاس نے خرید کر اخباری صورت میں جاری
کیا تھا جبکہ دانش دیوی جس زمانے میں قائم رہا ہوا
کرتے تھے ان دنوں ایک عرصہ تک نگار کی ادارت
سے وابستہ رہے تھے۔ بہن حسن نگار صاحب نے تو
اپنا کام یہ کہہ کر میرے سر قہقہہ دیا تھا کہ ”یار.....!
الیاس صاحب سے رفاقت طویل عرصے پر محیط
ہے۔ ایسا کر کہ میں تمہیں کچھ فوٹس لکھ کر دے دوں
گا مگر تم انہیں مضمون کی شکل دے دو۔“ مرحوم میرے
ایسے سینئر میں تھے جن کی محبت اور شفقت مجھے
ہیش حاصل رہی تھی۔ میں ان کی بات ٹال نہ سکا۔
ان کے دینے ہوئے فوٹس پر میں نے ایک طویل
مضمون ”نگار کی کہانی“ نگار کی زبانی“ کی صورت
میں لکھا جو گولڈن جوبلی نمبر میں شائع ہوا..... جبکہ
دانش دیوی مرحوم سے ملنے کے لیے مجھے ایامنامہ
”جی کہانیاں“ کے دفتر جانا پڑا تھا۔ وہ میرے
سینئر تھے اور بڑی محنت اور شفقت سے ”جی کہانیاں“
دالوں میں تھے۔ میں ان کے پاس جوں کا توں کر گیا
تھا اس پر تو انہوں نے سرسری کی بات کی البتہ مجھ
سے اس بات کی زبردست شکایت کی تھی کہ.....

”انور فرہاد..... اہم شہر بھر کے ناٹکچمنوں میں
لکھتے ہو مگر کبھی ہمارے پرچے میں نہیں لکھتے؟“
”آپ لکھتے کو کہیں کے تو لکھوں گا۔“

”تو لکھو نا..... اس طرح ایامنامہ ”جی کہانیاں“
کے لیے بھی میں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دی
تھیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری دسارے کے آگے چ
دانش دیوی عرصہ ہوا ہم سب سے ناتواں ذکر یادوں
کی دنیا میں جا بے ہیں۔ سن انہوں نے ایامنامہ ”جی
کہانیاں“ سے میرا جو رشتہ جوڑا تھا وہ اب بڑا
ہوا ہے۔ یہ سلسلہ جڑے کتنے سال گزر گئے۔ مجھے اس

کے لیے مجھے جڑو قبی لازم رکھ لیا تھا لیکن زیادہ
دنوں میں ان کا ساتھ نہ دے سکا پھر خاصے دنوں
کے بعد خالد چاؤلہ نے ایک دن قلم ایلیا کے دفتر
میں مجھے کہا۔ ”انور صاحب.....! سنتوش کمار پر
ایک مضمون لکھ دیجیے۔“

سنتوش کمار کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا۔ میں
نے مرحوم کے بارے میں مضمون لکھ دیا تھا..... اور
یوں اگلے ہفتہ خالد چاؤلہ کا پھر موجود تھے۔ ”انور
صاحب..... آپ پر ہفتہ نور جہاں کے لیے ایک
مضمون لکھ دیا کریں۔“

”جاؤلہ صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میں
کوئی شوقیہ قلم کار نہیں، جی لکھنا لکھنا میرا پیشہ
ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ لکھیں تو..... میں اپنی
استغاثت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔“ مگر
اُن کا..... ”کچھ نہ کچھ“ یوں کہے کہ کچھ نہ ہونے کے
برابر تھا مگر میں نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ
سلسلہ اُن کے انتقال کے بعد نور جہاں بند ہونے
کے بعد ہی ختم ہوا۔ ہاں تو بات نگار کی ادارے نوکسی
سے شرمز ہوئی تھی جس کے دوران ”نور جہاں“ کا
قصد بھی آگیا۔ مرحوم الیاس رشیدی صاحب کو اب
دنیا سے گئے تقریباً بارہ تیرہ برس ہو رہے ہیں میں
ان کے انتقال کے اگلے ہفتے سے لے کر آج تک
نگار کے ادارے کے ادھر آ کر لکھ رہا ہوں جبکہ درمیان میں بھی
کبھار کوئی مضمون بھی لکھ دیا ہوں۔

اور اب بات ہو جائے ایامنامہ ”جی کہانیاں“
سے میرے تعلق اور رشتے کی۔ جن دنوں نگار کا
گولڈن جوبلی نمبر ایک ضخیم رسالے کی صورت میں
نکلنے والا تھا مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں اپنی
حسن نگار اور دانش دیوی صاحب سے مل کر نگار کا
الیاس رشیدی کے بارے میں ان کے حواشی لے

کے بانی جناب الیاس رشیدی جنت آشیانی ہو گئے
ہیں۔ میں یہاں سے سیدھے ان کی میت میں
شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔“

”یار.....! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔
مجھ سے بھی تو ان کا بڑا پرانا رشتہ تھا۔“ جب ہم
دو دنوں بی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کی رحمانی مسجد
پہنچے تو میت خیری آرام گاہ پہنچانے کے لیے گاڑی
پر مچی جا رہی تھی۔ ہم دونوں بھی اس گاڑی پر سوار
ہو گئے جس میں شہر کے تمام ہی قلمی صحافی اور قلمی
شخصیات موجود تھیں۔ تدفین کے بعد صلاح الدین
پراچا اور مرحوم کے صاحب زادے اسلم الیاس نے
مجھ سے کہا تھا۔

”اچھا ہوا آپ آگئے نہیں آتے تو ہم آپ
کے پاس آتے۔ آپ کل نگار کے دفتر ضرور
آئیں۔“

میں اگلے روز وہاں پہنچا تو اسلم الیاس اور صلاح
الدین پراچہ نے کہا۔ ”اب آپ کو ایک ذمہ داری
سنبھالنی ہوگی اور وہ ذمہ داری ہے ادارے نوکسی کی۔
آپ کو تو معلوم ہے کہ کسی پریم گری کی وفات کے
بعد الیاس صاحب خود ادارے چھٹے تھے۔ اب یہ کام
آپ کو کرنا ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ لوگوں کو علم ہے
کہ میری ہفت روزہ ”نور جہاں“ میں بھی ادارے اور
ایک نمونہ عرصہ دراز سے ادھر رہا ہوں۔“

”آپ وہاں بھی لکھتے رہیں، ہمیں کوئی
اعتراض نہیں۔ ہفت روزہ ”نور جہاں“ بھی نگار کی
طرح ایک پرانا قلمی اخبار تھا۔ اس کے بانی اور
باک ایس اے چاؤلہ تھے جن کی وفات کے بعد
ان کے دو بیٹوں سعید چاؤلہ اور خالد چاؤلہ نے
پرچے کو زندہ رکھا۔ سعید دفتر کی امور چلائے۔ خالد
باہر کے کام کرتے۔ سعید چاؤلہ نے اپنی معاونت

کا حساب کتاب یاد نہیں۔ پہلے دانش دروی بہام مرزا شمس لویہ مرحوم وغیرہ جگر سلیم فاروقی پرویز بگلاری اور اب مزہ بہام (جنہوں نے مرزا صاحب کی وفات کے بعد ادارہ سنبھال کر بیٹی ہونے کے بعد دوسرے والا لاق ادا کر دیا ہے) اور اب سر مرزا سے یہ درست قرار ہے۔

میں نے ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ اور دیگر میگزینز اور ڈائجسٹوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھی ہیں لیکن کئی صورت میں اب تک نہ کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے نہ کوئی شعری مجموعہ۔ اگرچہ میرے کچھ دوست اور بہی خواہ مسلسل اصرار کرتے ہیں کہ ازم شعری مجموعہ تو پچھوالو کہ تہا ری شاعری محفوظ رہ جائے مگر ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت سی باتیں چاہئے کہ باوجود ممکن نہیں ہوتیں۔ میرے بچوں کو شکایت ہے کہ آپ نے ہمارے لیے کیا کیا؟ ایک گھر تک نہیں بٹکتا ہے، ہم لوگ آخر کب تک کرائے کے مکان کا غلام جھیلے رہیں گے؟ بیوی کو بھی بھٹکھوہہ ہی رہا کہ تہا سے گھر میں کھے؟ کیا آرام؟ میں اُن سے بس یہی کہتا ہوں کہ اللہ جسے جس حال میں بھی رکھا ہے اس کا بڑا احسان ہے۔

پرنٹ میڈیا جب سے بحران کا شکار ہے اس سے وابستہ تم جیسے لوگ پہلے سے زیادہ پریشان ہیں۔ میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ابتدا میں سے میری طبیعت اور مختلف رہی ہے وہ جو کچھ لوگ بیچیں میں کس کراہی جگہ بنا لیتے ہیں اسے آپ کو نمایاں کر لیتے ہیں۔ ”فرنی“ مجھ میں نہیں جس کی وجہ میں دوسروں کی طرح اپنے آپ کو آکسانا فائدہ نہ پہنچا سکا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ نقصان ہی پہنچایا خود کو بھی اور اپنے کو اٹھن کو بھی۔

اب میری عمر کا آخری بھر ہے متعدد بیماریاں

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

اں منتخب شدہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں جاسکتے ہیں

انتخاب

تقلید

انسان کی جبلت میں بھی شبہ ہے۔ ذہن میں خوش نہ تیرہ میں۔ قدرت نے ہمیں اشراف انکوائٹ بنا کر جہاں دنیا کی تمام کفایت پر فضیلت بخشی ہے وہیں کچھ ایسے جذبات بھی ہماری طبیعت میں شامل کر دیئے ہیں کہ ہم اکثر اوقات اپنے ہی خالق کی ہانگری کر جاتے ہیں۔ ہم حالات و واقعات کی پریشانی پہ چلوے تو جی تقدیر کے ہاتھوں گلت کے گلے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب ہمارا اپنا ہی کیا حرا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری زندگیوں میں بارہ مہینے کا مضر اس حد تک شامل ہو چکا ہے کہ اب ہمیں سوائے چمک دک کے کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ بڑے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اس معاشرے میں لمبے لمبے والے ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ ایک ہی خاندان کا گناہ گزرتا تھا۔ ہماری اقدار دم و روان اور روایات ہی ہماری پہچان تھیں لیکن ترقی کے تیز رفتار پہرے نے ہمیں آسائشیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کو سہل کر دیا ہے وہیں اس نے ہماری اہمیت کو بھی کم کر دیا۔ اب میری طرح سے سب کو دیا ہے کہ خود اپنی پہچان

شراب ہونی چاہیے۔ خون سے کبھی کسی کا علاج کیا گیا ہے؟ یقیناً سرخ شراب ہی ٹھیک ہے مگر اس شدت اور قہر کی پیاس آخر کیوں؟ شکست اور ناکامی کا علاج خون کیوں؟ وہ گرز کیا۔ اس نے اپنے آپ کو کھلی دی۔ ہاں اسے ارغوانی کو گر تھامت غصہ کیا جائے بالکل بخیر نہ تو وہ خون کی رنگ کی سنے ناب کشیں دے سکتی۔ اس کے بے کسی کے اندر کوئی کھد رہا تھا۔ سرد اسیر کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ یہ توجہ بہ غلط ہے۔ یہ مطلب فضول ہے۔ یہ بات کذب ہے۔ شاید وہ خودکامی میں اس حد تک متہنگ اور اپنے ساتھ مہاشے میں اٹھا ہوا تھا کہ اسے اپنی بات کا جواب اپنے عقب میں آتی ہوئی اجڑے ہوئے کسی ایک صورت نے دیا۔ خون اور شراب دو الگ چیزیں ہیں اور جو پیاس خون سے بجھے گی وہ خون ہی سے بے کسی کے پیر ملے۔ یہ خون ناحق ہو کہ اس کی سرمدیں تک پالنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جیلر ہائی کی تعریف ”دھت نسوس“ سے اقتباس
انتخاب: زاہر محبوب کراچی۔

نفسوانی غرور

کھور ناہید پہلی نظر میں مجھے سخت بدلتی لڑکی لگی تھی اور واقعی وہ بدلتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اچھے آداب کا علم نہیں۔ وہ کھڑا طور پر علاقائی صوفیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ہماری محفلوں میں ایسی حرکات کرے جن پر لوگ ملامت کریں۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتی۔ وہ ہر ایک کو لٹا لٹا دے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے جانے کے بعد تمام کورس اور مرد جی بھر کر اس کی برائی کریں۔ اس سے خار نکالیں۔ اس کو نفرت سے یاد کریں مگر اس کو کبھول نہ لیں۔ اس نے نفرت سے جو وہ محفلوں کے دلوں میں اپنے لیے پیدا کرتی ہے اس کا انسانی غرور ہرگز بگا ہے۔ وہ جھلک بھر کر ان کے دائرے سے نکل جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ”دیکھو“

”تم میں سے نہیں۔“ وہ مردوں سے کہتی ہے۔ ”میں ایک بیچہ ہوں۔ میں تمہارے مجبور جسموں کو نہیں مانتی۔ میں تمہارے ہم وادار کے ساتھ نہیں ہوں۔ تم مصلحت کن کسے بنے ہو۔ تم ایک چائنا کاکر روئے اور انسانے کھنے لگتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔“ اور مرد اپنا گال سہلاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں یا اس کے گرد حمال ناچنے لگتے ہیں۔ کھور ناہید اس طرح محفلوں اور مردوں کے درمیان پل پر کھڑی دونوں کو بھاتی ہے۔ وہ کسی ایک کے دائرے میں چلنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جس سے دوستی کرنا چاہتی ہے اس کو مختلف طریقوں سے اشتعال دلاتی ہے اور سوچنے کرتی ہے تاکہ وہ اس سے چڑ جائے۔ نفرت کرے اور گالیاں دے۔ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے پھر مردوں سے کرید کرید کر پوچھتی ہے۔ میرے بعد کس نے کیا کیا تھا؟ ”وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی نفل اس پر ملامت کے بغیر اٹھ جائے۔

احمد نیر کی تعریف ”مختار چمری“ سے اقتباس
انتخاب: فردا آکٹن نعب۔ ملتان۔

فوائد ہی فوائد

ایک صاحب پرانی کار کے فوائد اور ہی کار کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے بولے۔ ”کار جب بھی خریدیں پر پرانی خریدیں۔ اولڈ ایز گولڈ۔ پرانی کار کی تو بات میں کچھ اور ہے۔ کیا ابھی شے ہوتی ہے۔ نہ کسی کا پی لٹائے نہ کوئی طرح بد ڈالے نہ کوئی ہاتھ لگائے۔ ایک شیش نہیں چڑتا نہ چڑے کوئی بات نہیں۔ کوئی پتھر سے گھیر کھینچا چلا گیا تو کیا ہوا کسی نے کیل سے اپنا نام گرا کر ایسی جلی حروف میں لکھ ڈالا اچھا کیا برا نہ کیا۔ باہر کھڑی ہے کھڑی رہے۔ کون ہے جائے؟ کسی کی مت تو داری نہیں کی۔ چیل جی چاہے نہ چلا۔ جتنی دے جا ہے کھڑی کر دو۔ اطمینان سے اپنا کام کر دو۔ جب بھی لوٹ کر آؤ وہیں ملتی ہے جہاں کھڑا کرتے ہو۔ چور اچکے بھلا

کیوں لٹ دیتے گئے ایسی کار کو باڈی اتنی مضبوط کہ ہزاروں سروس نہ کر سکیں۔ نہ لگے بڑے۔ جتنا چاہیں لٹوا ڈھکیں۔ سینٹ کی بوریاں انٹینس کاکھ کاکھ جو چاہیں ڈکی میں بھر کر لائیں۔ جتنی چاہیں سواریاں بٹھائیں۔ کسی جال سینٹیں بچوں بھی کر جائیں۔ جیسے بے غمرا جائے کھیا کر جائے گا کار کا بال بھی پکا نہ ہوگا۔ ایک ڈراما ڈیفنڈ پڑ گیا تو پڑ گیا۔ چوٹی کار والے تو خود ہی اسٹرا ایک طرف ہو جاتے ہیں جیسے کسی سرمایہ کی کار ہو۔ واللہ بات ہی کچھ اور ہے پرانی کار کی۔ یہ پران ہی زیادہ نہیں کرتی۔ پٹرول بھی کم کھاتی ہے۔ آکر دیکھو جو گلوٹنی ہے۔ دیکھ لکوانا کوئی سب نہیں اس میں کچھ فوائد مضمر ہیں۔ گھر کے بیشتر افراد کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ اسی بھانے ورزش ہو جاتی ہے۔ رند اس مشینیں ”رند میں وقت کہاں ملے اس کاموں کے لیے؟ دل کے ریشوں کی تکفیں میں مدد دیتی ہے انہما کا کتا مریض زہاد صکا لگا کر تو دیکھ فوراً چلنا جائے گا۔ کتا فرخ نصیب ہوتا ہے پرانی کار والا۔ بیکسی پرسکون زندگی گزارتا ہے۔ بے کسیے مرے سے ہوتے دے دنیا دانیہا سے بے خبر ہو کر۔ نہ کیراج کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ چونکداری کی۔ گلی میں کھڑی کرتا ہے اور بے فکر ہو کر چلا۔ پرانی کار کم خرچ بالکل پائیدار فائدے سے بھرا۔

ڈاکٹر محمد حسن کی تعریف ”دھت ا“ سے انتخاب
انتخاب: نعیم احمد کاشمیر خیر آباد۔
نظر ثانی
جو شخص ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز تر بناتا ہے ہمارا اختلاف ہمارا مددگار ہے۔ سوچنے کے دو انداز ہیں ایک یہ کہ جو شخص آپ پر تنقید کرے آپ کی مخالفت کرے آپ اس کو فوراً اپنا دشمن سمجھ لیں اور اس سے نفرت کر لیں دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید اور مخالفت پیش آنے کے بعد آپ اپنے اوپر

نظر ثانی کریں۔ آپ جھنجھلاہٹ کے بغیر اصل معاملے پر غصے طرے سے غور کریں۔ پہلی صورت میں تنقید اور مخالفت آپ کے لیے ذہر ہے دوسری صورت میں وہ آپ کے لیے آپ کی خوراک بن جاتی ہے۔
مولانا وحید الدین خان کی تعریف ”ہزاری“ سے اقتباس
انتخاب: اشعر جواد کراچی۔
افصولی حشر افشاہ
مستطری باتیں
☆ غصہ کبھی بھی تھامت قابل اور ذہین انسان کو بھی بے وقوفی دلا نکالت پر مجبور کر دیتا ہے۔
☆ ظلم ایسا دیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہرتی ہے۔
☆ ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والا بہت بڑا تحفہ ہے۔
☆ انسان کی سب سے بڑی دشمن حرص اور لالچ ہے۔
☆ انسان بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑ دیتا ہے۔
☆ عذاب کے ڈر سے گناہ بھی چھوڑ دیتا ہے۔
☆ صدمت کو اپنی ساری محبت دو دگر دار نہیں۔ یہ عمل اسے کل آپ کا سب سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے والا دشمن بننا سکتا ہے۔
☆ پاؤں پھل جائے تو جسنانی چوٹ لگی گی مگر زبان کو نہ بھٹے دئے تو دعا ہی چوٹ کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

مرسل: حنا خان۔ کراچی۔
افصول ہوتی
☆ صکت ایک درخت ہے جو دل میں آگ سے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔
☆ کامیاب ہے وہ انسان جو ضروریات زندگی سے وقت نکال کر خدا کا شکر ادا کرتا رہے۔
☆ جن چیزیں انسان کو چاہ کر دیتی ہیں۔ حرص

حد اور دم۔

☆ ضرور ہے بھی ہے کہ اپنے نیک کام اپنی نظر میں پسندیدہ اعمال کو کئی دیں۔

☆ دنیا میں اُن لوگوں کی بہت عزت ہوتی ہے جنہوں نے اپنے استاد کا احترام کیا۔

☆ کامیابی کا ایک بڑا راز خود ادا کی بھی ہے۔

☆ آخرت کا کام ہر صورت میں آج کر دینا چاہیے کیونکہ کل آپ کی زندگی کا بھر دماغ نہیں۔

☆ عاشر شجر جو ادہ کراچی۔

☆ زندگي کيا ہے؟

☆ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ زندگی ایک سفر ہے جس کا آغاز مہد اور انجام لہر ہے۔ (حضرت امام غزالی)

☆ زندگی نام ہے اپنے کلمات کے اظہار کا۔ اگر تمہارے اندر یہ قوت نہیں ہے تو تم زندہ نہیں ہو۔

(علامہ اقبال)

☆ زندگی ایک پیٹھوں کی طرح ہے جو آنسوؤں اور تھوہوں کے درمیان بھولتی ہے۔

☆ زندگی ایک شمع کی مانند ہے جسے ہوا میں رکھ دیا گیا ہے۔ (بلطیسوس)

☆ زندگی ہر نفس کو عزیز ہے لیکن بہادر انسان کے لیے عزت زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ (دکلم)

☆ زندگی ایک ہیرو ہے جسے ترش انسان کا کام ہے۔ (چارل ہنڈشا)

☆ زندگی میں تپکے والے اور بپے

☆ آنسو آنکھ کی سیپ میں تپکے والے اور بپے

☆ آنسو دل کی آواز ہے مگر انہیں سے نکلنے والا

☆ حیات کا چشمہ ہیں۔

☆ آنسو آرزوؤں کے صحرا میں گلستان کا مژدہ

☆ کھانے لگے؟

☆ آنسو تہائیوں کے سب سے بہترین ساتھی

☆ اور رشتی ہیں۔

☆ آنسو دھواؤں کی تخلیق کی نوید بھی

☆ ہیں۔

☆ آنسو زندہ دہی کی منزل تک پہنچانے والا

☆ راست ہیں۔

☆ آنسو انسان کی ایسی ستار ہے بہا ہے جسے

☆ کوئی چرا نہیں سکتا۔

☆ آنسو خوش دہم دلوں صورتوں میں اظہار کا

☆ سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

☆ مسرت: رضوان کلا۔ لاہور۔

☆ مسرت کی وہ سطر جو اسے زعمہ جاوید بنا

☆ دے اُس کی تمام تصانیف پر ہماری ہے۔ (دراخت)

☆ اگر دنیا کی تمام سلطنتوں کے تاج میری

☆ کتابوں اور میرے مطالعے کے شوق کے عوض

☆ میرے پاؤں پر رکھ دیے جائیں تو میں اُن سب کو

☆ ٹھکرا دوں گا۔ (بائل)

☆ آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے مکالمے

☆ نے اُس میں تیز آتی ہے اور لکھنے سے اُس کی

☆ شخصیت گہر جاتی ہے۔ (ایمرسن)

☆ بیکڑے چاہے انسان پرانے ہی کیوں نہ

☆ ہیں لیکن نئی نئی کتابیں ضرور خریدے۔ (آسٹن

☆ فلیس)

☆ آنسو دیکھا گیا ہے کہ کتابوں کے

☆ مطالعے نے انسان کے مستقبل کو بنا دیا ہے۔

☆ مسرت: عارفہ مسعود لاہور۔

☆ تلاش گم شدہ

☆ شریعت کی گلی میں ہمارا ایمان کو گھیرا ہے

☆ کھانے لگے؟

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ عقل کی باتیں

☆ ابراہیم کی طاقت ہے کی طاقت سے زیادہ

☆ ہے۔ چیرا اگر پاور ہے تو ارادہ پر پاور ہے۔

☆ جو چپکے مژدہ دیکھتا ہے وہ بھی کیا بایا نہیں

☆ ہوتا۔

☆ جس کی بجائے رنج کرے

☆ کچھ اکتا ہوا تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام

☆ دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ ساتھ سے کمانے والا بھی محتاج نہیں

☆ ہوتا۔

☆ مسرت: جمینو۔ جوہی۔ لاہور۔

☆ فو اس سگو ایٹے

☆ سوال

☆ ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے

☆ لیے بڑے کے سامنے پہنچا ہوا۔ بڑے کے کمرے میں اُس

☆ سے پوچھا: ”تم کسی جگہ میں ہو اچانک تمہارے

☆ سامنے تیز آ جاتا ہے۔ تاؤ اُس وقت تم کیا کرو

☆ گے؟“

☆ امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ مہر نے اپنا

☆ سوال دہرایا وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ بھی

☆ سے بولا: ”جواب کیوں نہیں دیتے؟“

☆ امیدوار نے جواب دیا: ”میں بھلا کیا کروں گا“

☆ کچھ کرنا ہے وہ تو خیر کر لے گا۔“

☆ لندن میں ایک پلیمبر نے اپنے برفب کس میں

☆ سے چند اوزار کٹال کر ذرا سی دیں وکیل صاحب

☆ کے گھر کا نکل درست کیا اور لپٹا بل آئیں تھا دیا۔

☆ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے

☆ بولے۔

☆ ”دو سو ڈالرز کی سند؟ میں تو دن بھر میری بھی

☆ اتنی رقم نہیں کماتا؟“

☆ ”آپ! بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پلیمبر نے

☆ پورے غلطی سے تائید کی۔ ”وکالت کے پیشے میں

☆ میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔“

☆ مسرت۔ شازیہ۔ لاہور۔

☆ برقی چیز

☆ بچے شرب پینے کے اہرام میں لائے جانے

☆ والے غصے سے کہا: ”میں پلیمبر یہاں یقیناً شرب

☆ نوشی کی وجہ سے لائی ہے؟“

☆ ”آپ کا اندازہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔!“

☆ شرابی نے جواب دیا: ”شراب انتہائی بری چیز ہے

☆ نئے میں بہت سے نقصانات ہیں آدمی کھینے کھینے لگا

☆ ہے وہ دوتوں سے بے ہوش ہوجاتا ہے یہاں تک کہ

☆ کوئی اپنی بیوی پر کوئی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا

☆ ہے۔ میں خود اس بار یہ کوشش کر چکا ہوں۔“

☆ بحث

☆ ایک گاؤں میں بڑی ریشو سے گدھا مانگتے

☆ آیا۔ ریشو نے ہنسنے ہنسنے ہنسنے کہا: ”گدھا تو بیچ

☆ سے تو لے گیا ہے۔“

☆ اسی دوران اندر سے گدھے کی آواز آئی۔

☆ ہنسنے لگا: ”ریشو! تم یہ کیا کہہ رہے ہو جبکہ

☆ تمہارا گدھا تو اندر سے بول رہا ہے؟“

☆ ریشو نے نہایت غصے سے جواب دیا: ”میں

☆ ایسے غصے سے ہرگز بحث نہیں کرنا چاہتا جو میری بات

☆ کی بجائے گدھے کی بات پر یقین کرنا ہو۔“

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ تلاش گم شدہ

☆ شریعت کی گلی میں ہمارا ایمان کو گھیرا ہے

☆ کھانے لگے؟

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ عقل کی باتیں

☆ ابراہیم کی طاقت ہے کی طاقت سے زیادہ

☆ ہے۔ چیرا اگر پاور ہے تو ارادہ پر پاور ہے۔

☆ جو چپکے مژدہ دیکھتا ہے وہ بھی کیا بایا نہیں

☆ ہوتا۔

☆ جس کی بجائے رنج کرے

☆ کچھ اکتا ہوا تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام

☆ دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ ساتھ سے کمانے والا بھی محتاج نہیں

☆ ہوتا۔

☆ مسرت: جمینو۔ جوہی۔ لاہور۔

☆ فو اس سگو ایٹے

☆ سوال

☆ ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے

☆ لیے بڑے کے سامنے پہنچا ہوا۔ بڑے کے کمرے میں اُس

☆ سے پوچھا: ”تم کسی جگہ میں ہو اچانک تمہارے

☆ سامنے تیز آ جاتا ہے۔ تاؤ اُس وقت تم کیا کرو

☆ گے؟“

☆ امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ مہر نے اپنا

☆ سوال دہرایا وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ بھی

☆ سے بولا: ”جواب کیوں نہیں دیتے؟“

☆ امیدوار نے جواب دیا: ”میں بھلا کیا کروں گا“

☆ کچھ کرنا ہے وہ تو خیر کر لے گا۔“

☆ لندن میں ایک پلیمبر نے اپنے برفب کس میں

☆ سے چند اوزار کٹال کر ذرا سی دیں وکیل صاحب

☆ کے گھر کا نکل درست کیا اور لپٹا بل آئیں تھا دیا۔

☆ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے

☆ بولے۔

☆ ”دو سو ڈالرز کی سند؟ میں تو دن بھر میری بھی

☆ اتنی رقم نہیں کماتا؟“

☆ ”آپ! بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پلیمبر نے

☆ پورے غلطی سے تائید کی۔ ”وکالت کے پیشے میں

☆ میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔“

☆ مسرت۔ شازیہ۔ لاہور۔

☆ برقی چیز

☆ بچے شرب پینے کے اہرام میں لائے جانے

☆ والے غصے سے کہا: ”میں پلیمبر یہاں یقیناً شرب

☆ نوشی کی وجہ سے لائی ہے؟“

☆ ”آپ کا اندازہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔!“

☆ شرابی نے جواب دیا: ”شراب انتہائی بری چیز ہے

☆ نئے میں بہت سے نقصانات ہیں آدمی کھینے کھینے لگا

☆ ہے وہ دوتوں سے بے ہوش ہوجاتا ہے یہاں تک کہ

☆ کوئی اپنی بیوی پر کوئی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا

☆ ہے۔ میں خود اس بار یہ کوشش کر چکا ہوں۔“

☆ بحث

☆ ایک گاؤں میں بڑی ریشو سے گدھا مانگتے

☆ آیا۔ ریشو نے ہنسنے ہنسنے ہنسنے کہا: ”گدھا تو بیچ

☆ سے تو لے گیا ہے۔“

☆ اسی دوران اندر سے گدھے کی آواز آئی۔

☆ ہنسنے لگا: ”ریشو! تم یہ کیا کہہ رہے ہو جبکہ

☆ تمہارا گدھا تو اندر سے بول رہا ہے؟“

☆ ریشو نے نہایت غصے سے جواب دیا: ”میں

☆ ایسے غصے سے ہرگز بحث نہیں کرنا چاہتا جو میری بات

☆ کی بجائے گدھے کی بات پر یقین کرنا ہو۔“

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ تلاش گم شدہ

☆ شریعت کی گلی میں ہمارا ایمان کو گھیرا ہے

☆ کھانے لگے؟

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ عقل کی باتیں

☆ ابراہیم کی طاقت ہے کی طاقت سے زیادہ

☆ ہے۔ چیرا اگر پاور ہے تو ارادہ پر پاور ہے۔

☆ جو چپکے مژدہ دیکھتا ہے وہ بھی کیا بایا نہیں

☆ ہوتا۔

☆ جس کی بجائے رنج کرے

☆ کچھ اکتا ہوا تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام

☆ دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ ساتھ سے کمانے والا بھی محتاج نہیں

☆ ہوتا۔

☆ مسرت: جمینو۔ جوہی۔ لاہور۔

☆ فو اس سگو ایٹے

☆ سوال

☆ ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے

☆ لیے بڑے کے سامنے پہنچا ہوا۔ بڑے کے کمرے میں اُس

☆ سے پوچھا: ”تم کسی جگہ میں ہو اچانک تمہارے

☆ سامنے تیز آ جاتا ہے۔ تاؤ اُس وقت تم کیا کرو

☆ گے؟“

☆ امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ مہر نے اپنا

☆ سوال دہرایا وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ بھی

☆ سے بولا: ”جواب کیوں نہیں دیتے؟“

☆ امیدوار نے جواب دیا: ”میں بھلا کیا کروں گا“

☆ کچھ کرنا ہے وہ تو خیر کر لے گا۔“

☆ لندن میں ایک پلیمبر نے اپنے برفب کس میں

☆ سے چند اوزار کٹال کر ذرا سی دیں وکیل صاحب

☆ کے گھر کا نکل درست کیا اور لپٹا بل آئیں تھا دیا۔

☆ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے

☆ بولے۔

☆ ”دو سو ڈالرز کی سند؟ میں تو دن بھر میری بھی

☆ اتنی رقم نہیں کماتا؟“

☆ ”آپ! بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پلیمبر نے

☆ پورے غلطی سے تائید کی۔ ”وکالت کے پیشے میں

☆ میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔“

☆ مسرت۔ شازیہ۔ لاہور۔

☆ برقی چیز

☆ بچے شرب پینے کے اہرام میں لائے جانے

☆ والے غصے سے کہا: ”میں پلیمبر یہاں یقیناً شرب

☆ نوشی کی وجہ سے لائی ہے؟“

☆ ”آپ کا اندازہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔!“

☆ شرابی نے جواب دیا: ”شراب انتہائی بری چیز ہے

☆ نئے میں بہت سے نقصانات ہیں آدمی کھینے کھینے لگا

☆ ہے وہ دوتوں سے بے ہوش ہوجاتا ہے یہاں تک کہ

☆ کوئی اپنی بیوی پر کوئی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا

☆ ہے۔ میں خود اس بار یہ کوشش کر چکا ہوں۔“

☆ بحث

☆ ایک گاؤں میں بڑی ریشو سے گدھا مانگتے

☆ آیا۔ ریشو نے ہنسنے ہنسنے ہنسنے کہا: ”گدھا تو بیچ

☆ سے تو لے گیا ہے۔“

☆ اسی دوران اندر سے گدھے کی آواز آئی۔

☆ ہنسنے لگا: ”ریشو! تم یہ کیا کہہ رہے ہو جبکہ

☆ تمہارا گدھا تو اندر سے بول رہا ہے؟“

☆ ریشو نے نہایت غصے سے جواب دیا: ”میں

☆ ایسے غصے سے ہرگز بحث نہیں کرنا چاہتا جو میری بات

☆ کی بجائے گدھے کی بات پر یقین کرنا ہو۔“

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ تلاش گم شدہ

☆ شریعت کی گلی میں ہمارا ایمان کو گھیرا ہے

☆ کھانے لگے؟

☆ مسرت: انور شہید لاہور۔

☆ عقل کی باتیں

☆ ابراہیم کی طاقت ہے کی طاقت سے زیادہ

☆ ہے۔ چیرا اگر پاور ہے تو ارادہ پر پاور ہے۔

☆ جو چپکے مژدہ دیکھتا ہے وہ بھی

بیویاں

امریکا کے ایک شہر کے میئر کو پتا چلا کہ اس کے علاقے میں رہنے والا ریڈ انڈین بیٹھے عدد بیویوں کا شوہر ہے تو فوراً وہ اس کے گھر پہنچا۔

”دیکھو میئر.....!“ میئر نے ریڈ انڈین سے کہا۔ ”ہمارا قانون ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ قانون کا احرام کرنا سیدھے گھر جاؤ اور اپنی پانچوں بیویوں کو تازہ کر آج سے وہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں۔“

ریڈ انڈین نے چند لمحوں تک میئر کے مشورے پر غور کیا اور کہا کہ اس طرح کا کہنے لگا جیسے اس پر جازا چڑھا گیا ہو پھر وہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہوئی آواز میں بولا۔

”میری بیویوں کو یہ بات آپ ہی تاہم“ دوسری صورت میں مج کے اخبار میں میری تصویر شائع ہوئی اور نیچے لکھا ہوگا۔

”وہ ریڈ انڈین جو پانچ بیویوں کے ہاتھ مارا گیا۔“

مرسلہ: شریل القدس۔ جبک آباد۔

سرکاری ملازم

ایک سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے ایک صاحب دھتے دھتے سے فون کر رہے تھے۔ فون سے دوسرے ایک انہیں مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ صاحب بس آئے ہی والے ہیں۔ کچھ دیر پہلے صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ جی ہاں وہ آئے تھے لیکن ابھی ابھی بڑے صاحب نے انہیں بینک کے لیے بلا لیا ہے۔ جی۔ وہ ابھی بینک سے نہیں آئے۔ اب تو وہ بج کے لیے چلے گئے ہیں۔“

دوسرے دن سب کے بعد ان صاحب کو مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”میں وہ بیچنے ہی والے

ہوں گے۔ جیسے وہ ابھی تک نہیں آئے آپ پتہ نام دے دیجیے۔ وہ ملک میں ہی نہیں ہیں۔ ان کی واکٹ کری پر لگی ہوئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں مجھے پتا نہیں ہے کہ وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ جی ہاں ان کا موبائل آف ہے۔ ان سے جواب دہ آئے تھے لیکن بس دو منٹ پہلے ہی جھٹی کر گئے ہیں۔ اب تو دینے کی آفس بند ہی ہو رہی ہے۔ میرے ہاتھوں میں تالاب۔“

مسلم

بچے کے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا حال ہے ڈیڈی میں اصرے گزار رہا تھا میں نے سوچا ڈیڈی کو سلام کرتا جاؤں۔“

”کوئی کام نہیں بیٹا“۔ ”اب نے غلطی سانس لے کر کہا۔“ ”تھوڑی دیر پہلے تمہاری اہلی جی اصرے گزری تھیں انہوں نے بھی سوچا کہ مجھے سلام کرنی چاہیے۔“

”جیب میں موجود بارے پھینک دے۔“

مرسلہ: نوین نقوی۔ بمبک۔

چند اہل لفظ

خدا ہم کو ایسی خدا کی نہ دے کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے خطاط دار بھی مجھے کی دنیا تجھے اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے کہ آج اتنا کہ اس شور سے صداسکول کی سناٹی نہ دے غلامی کی برکت سمجھنے لگیں اسروں کو ایسی رہائی نہ دے مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے خدا ایسے احسان کا نام ہے کہ ہمارے سامنے اور دکھائی نہ دے

(نثر برد)

حسن انتخاب: دو بیٹے سید کرنا چاہیے۔

☆

دکھ فائدہ نہیں کہ تجھ سے کہیں دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں آج تک اپنی بے گلی کا سبب خود بھی جانتا نہیں کہ تجھ سے کہیں بے طرح حال دل ہے اور تجھ سے دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں ایک تو حرف آشنا تھا مگر اب زمانہ تو کہ تجھ سے کہیں قصدا ہم فقیر لوگوں کا اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

(احقر فراز)

حسن انتخاب: رابعہ مظفر کرنا چاہیے۔

☆

دکھوں کی شرمیں زخموں کی گہرائی مجھے دے دو مسیحا تم ہو آؤں سنبھال مجھے دے دو تم اپنی ذات میں خود انہیں ہو تم کو کیا غم ہے تم تمہا ہوں یہ ذوق پرآم آرائی مجھے دے دو تم اپنے دل کے درد ازلے منتقل شوق سے کرلو بس اپنی ذات سے آؤں شامانی مجھے دے دو تمہارے بعد ہر منظر مجھے بے رنگ لگا ہے یہ آنکھیں مجھیں لوی اپنی بیٹائی مجھے دے دو میں ماسوں میں مسلوں کا تمہاری ہر امانت کو یہ دشت ناگ سناٹے یہ تمہاری مجھے دے دو

(اختیار مساجد)

حسن انتخاب: شیدا قیوم کرنا چاہیے۔

☆

میری ساری زندگی کو بے غمراں نے کیا عمر میری تھی مگر اس کو بھر اس نے کیا

میں بہت کھڑا کروں ملک میں ہجرت کے بعد پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے مجھ کو سیدھے راستے سے دو بدراں نے کیا شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا پھر مجھے اس شہر میں ہانستر اس نے کیا شہر کو برادر کر کے دکھا اس نے منبر شہر پر یہ غلم میرے نام پر اس نے کیا (منبر نیازی)

حسن انتخاب: شعیب جی الدین فریدی۔ لاہور۔

☆

ستارے بانٹا ہے وہ ضیاء تقسیم کرتا ہے سنا ہے جس موسم میں ہوا تقسیم کرتا ہے تمہاری یاد کو ایسے میرے دل پر اترتی ہے کہ جیسے روشنی شب میں دیا تقسیم کرتا ہے اسے روکو کہ باز آئے سراسر بے پاگل پن جو بہروں کے غلوں میں صدا تقسیم کرتا ہے اسی سے ناگ تو عرفان چھوڑ دے سب کو جو پھر میں بھی کیڑوں کو غذا تقسیم کرتا ہے

(عرفان صادق)

حسن انتخاب: فیضان علی۔ اسلام آباد۔

☆

شاہد نکل ہی آئیں خضوں کے حصار سے اب کے نہیں امید بہت ہے ہمارے جگنو کی گرد آ کے ہا داتے تیرگی گھبرا گیا ہوں طوطا فب اختار سے معصومیت کی حد ہے کہ ہم اہل کارواں منزل کی راہ پر چھ رہے ہیں غبار سے خوراخت عظیم جھٹکن سے ہوشیار عزم کر نہ دیں فخر سامیہ وار سے

(منشی عظیم آبادی)

حسن انتخاب: اقبال حسین کرنا چاہیے۔

ماہنامہ جہانگیر

عذیبو.....

ماہنامہ جہانگیر آخر کار پینڈگی معنوں میں اہم ہے، خصوصاً اُن معنات کے لیے جو عملیات میں دخل رکھتے ہیں۔ اس کا شمار "آئی" ہے۔ ایسے تعویذات اور دعا میں جو کسی مسئلے میں اُن کی تباہی اس ماہ میں سرچلے لائیں جانی ہے لیکن اس کے لیے کسی کی رہبری اشور ضروری ہے۔ "آئی" مفت تعویذات میں نقصان کا احتمال نہیں۔

اس ماہ کی بیسویں تاریخ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بزرگوں کے مطابق اسی تاریخ کو حضرت یعقوب کو حضرت یوسف کے زندہ ہونے کی خبر ملی۔ اسی تاریخ کو گریہ الوب کا اختتام ہوا۔ اسی تاریخ کو حضرت صاحبزادی حضرت فاطمہؑ اثر بردار دنیا میں تشریف لائیں۔ اس روز روزہ رکنا صدقہ دینا اعمال خیر بجالانا بزرگانِ پشت کا دیرہ را۔ اس روز خداوندِ عالم سے مغفرت طلب کرنا حد درجہ افضل ہے۔ طلب حاجت کے لیے مندرجہ ذیل دعا کا پڑھنا افضل ہے لیکن اس کے پہلے دو رکعت نماز بجالائیں اور بعد سلام مندرجہ ذیل دعا کرادیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ بِاَنَّكَ مَلِکٌ وَّ اَنَّكَ عَلَمٌ کُلُّ شَیْءٍ قَلْبِیُّہٗ مُقْتَدِرٌ وَّ بِاَنَّكَ مَاتَمَسَّا ؕ وَّ مِنْ اَمْرِ یُجَوِّزُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتُوْجِّعُ اِلَیْكَ بِیَتِیْکَ مُحَمَّدٌ نَّبِیِّ الرَّحْمٰتِہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نَارِیْ وَّلَیِّ اللّٰہِ اِنِّیْ اَتُوْجِّعُ بِکَ اِلَیَّ اللّٰہِ زَیْنُکَ وَّ ذُوْمِیْ یَسْجَعُ لِیْ بِکَ کَلْبَتِیْ اَللّٰهُمَّ یَتِیْکَ اَنْجِعْ لِیْ کَلْبَتِیْ یَسْجَعُ
پھر اپنی حاجت طلب کرے جو انشاء اللہ پوری ہوگی۔

□ زیرِ پندی۔

☆ بی بی اللہ تبارے مسائل حل فرمائے نماز کی پابندی رکھو اور روزہ شریف بہت پڑھو۔ جو ہوا ہوا عمر یاد رکھو زبانی کرنے والا بہت دکھ اٹھاتا ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے تم سے اس بارے میں پوچھا جائے گا لہذا جو بیت گناہ ختم ہو گیا۔ خوب اپنی ہی زندگی کا نڈر اب اللہ سے بہت دعا میں کیا کرو۔ بے شک وہ تمہاری مہربان آقا ہے۔ بی بی! نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 بار سورۃ قویہ آخری آیت نقل جی اللہ سے لے کر عرض العظیم تک ضرور پڑھا کرو۔ سب اچھا ہوگا۔ لاجل و لا توہ کا بہت ورد کرو۔

□ شاہدہ پروین۔ لاہور۔

☆ بی بی شاہدہ اللہ حسین اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ سب سے اہم نماز کی پابندی ہے۔ ہر مسئلے کا حل قرآن میں موجود ہے۔ تمہارا اللہ اور اس کی کتاب پر اعتقاد ہی کامیابی دلائے گا نماز فجر کے بعد 1000 بار سورۃ ادریس کا ورد کیا کرو اولاد کا خرد روزہ شریف۔ اس کے علاوہ دن میں باج بار سورۃ الناس سورۃ قلقل اور آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر تصور میں دم کرو۔ کچھ نہ کچھ صدقہ خیرات ضرور کیا کرو جو کسی کی خبر ہو جی کیوں نہ ہوں۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ طاہر خان خوشاب۔

☆ بی بی امین آپ کا بہت پرانا علاج ہوں۔ جب بھی کوئی مشکل درپیش آتی ہے میں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔ بی بی! امیری بی بی بہت ناراض ہوتی جا رہی ہے اپنی ماں سے بہت بدچہری کرتی ہے۔ مجھ سے کافی ڈری بھی رہتی ہے۔ کوشش کرتی ہے کہ کم از کم سامنے آئے مگر اس کی ماں بہت عاجز آج بھی ہے۔ چنی اب بڑی ہوئی ہے بار پیت بھی نہیں

کی جاسکتی۔ آپ مجھے اس کے لیے تعویذ ارسال کر دیجئے۔ لڑکی ذات ہے خدا اور بہت دھری انسان کا باعث ہوگی۔ میں خود بھی سن ہوتا ہوں۔ بی بی! ماں اور دادی کے ساتھ رہتی ہے۔

☆ بی بی طاہرہ اقبال تبارا مسئلہ بہت اہم ہے مگر بی بی! تصور زانو درد فکر کرنا کوشش کرو یہ جاننے کی کردہ ایسی کیوں ہوگی ہے؟ تعویذ دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر تم مسئلہ کی جڑ کو تو جانو تم مجھ سے دنوں کے لیے چھینوں پر آتے ہو تمہاری موجودگی میں حالات ٹھیک رہتے ہیں مگر یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہاری بیوی اور والدہ کا رویہ آپس میں کیا ہے؟ یہ بہت اہم ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کیا تمہاری غیر موجودگی میں گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہو جس کا اثر چنی پر ہو رہا ہے؟ گھر والوں سے بات کر کے پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ شاہینہ سلطان۔ لاہور۔

☆ بی بی اللہ آپ کو بہت اچھا رکھے۔ میرا اصل مسئلہ میری شادی کا ہے۔ میری عمر 33 سال ہے۔ تمام چھوٹی لڑکی کی خدائیاں ہو چکی ہیں۔ میں نے خاندان میں آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میری میرے والدین سے صرف میری شادی کے بارے ہی میں پوچھتا رہتا ہے۔ مجھے میں اب لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ میری دلوں بڑی نہیں اور تینوں بھائی شادی شدہ ہیں۔ بی بی! آپ مجھ سے کہیں گے کہ کہا بیویوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہے؟ مجھے ایسا عقیدہ دیں جس کی برکت سے جلد از جلد میری بھی شادی ہو جائے۔

○ شہدۃ اللہ آفندہ لڑائی اکرھو
کا لمتیکہ و اولوا الیوہ کا لمتیکہ
بالفیض لڑائی اکرھو العزیز
الکبیر
☆ شاہینہ مندرجہ بالا آیت میں نماز کے بعد 33

بار پڑھو اور دعا کرو۔ بایں ہونے کے بجائے پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ دعا کرو۔ لوگوں کے رویے سے کبھی بھی دلیبرداشت مت ہونا۔ اللہ بھی انہی کی حد کرتا ہے جو اس کی رشا میں راضی رہتے ہیں۔ زندگی مدت ایک ماہ ہے۔

□ ہمیں خبریں۔ بچاؤ۔
☆ بنی کسبم اوزن کم کرنے کی دوا ان جگہ تیار نہیں کر رہا ہوں۔ اشیاء متباب نہیں۔ جیسے غی متباب ہوں کی مصلحت کیا جائے گا۔

□ فاطمہ سلیمان۔ بشار۔
□ بابا جان! اللہ تعالیٰ میں اپنی محنت کو نہ کر بہت پریشان ہوں سچہ ماہ ہو گئے ہیں کھانسی ٹھیک نہیں ہوئی، کم ہو جاتی ہے مگر ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر دو کی دوا کھا کھا کر ٹھیک آچکی ہوں۔ کھانسی رات میں بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے نوبی رات سو بھی نہیں پاتی۔ آنکھوں کے نیچے بہت گہرے چھلکے پڑ گئے ہیں۔ منہ دیکھنے میں سرخیش ہوئی ہوں حالانکہ بابائی امیری خوراک بھی اچھی ہے اور ٹھنڈا یا کٹھا میں پہلے بھی نہیں کھاتی تھی۔ مجھے کوئی دوا بتادیں میں بہت شک آچکی ہوں۔

☆ بنی فاطمہ۔ اللہ نہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پبندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بہت سہل طریقہ تیار رہا ہوں پابندی سے استعمال کرواؤنا۔ اللہ ضرور شفا ہوگی۔ اور کھانا کھان کی صورت میں باریک باریک کات لو پھر ان پر پکا سامک چھڑک کر توے پر بھون لو۔ نہار منہ 4-5 قاشق کسم اللہ پڑھ کر کھا لیا کرو۔ سیسافاضی کا بہت درد کرو۔ اللہ ضرور کرے فرمائے گا۔

□ مکی نذر۔ شیو پورہ۔
□ بابائی! آپ کو سخت دے۔ میں شادی سے پہلے سے آپ کے ابلے میں ہوں۔ ہمیشہ آپ

سے ہی رہنمائی کی درخواست کی اور اللہ کا احسان ہے بڑا کریم رہا۔ بابائی! آپ کی یہ بیٹی اب بڑی دگی ہے۔ میری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میری اولاد نہیں ہے۔ بڑا طویل عرصہ صبر کر کے گزارا مگر اب کب نہیں چاہئے۔ دیتے میرے شوہر بھی اکلوتے ہیں بیٹے لہذا جیسے میں سب کو بہت آرزو ہے۔ میری ساس تو بہت اچھی ہیں مگر پھوپھی ساس بہت تکلیف دہ باتیں کرتی ہیں حالانکہ وہ خود غیر شادی شدہ ہیں اور ساری زندگی ان کی اپنے بھائی کے ساتھ ہی گزری مگر پھوپھی مجھے طے دیتی ہیں سر بھی بہن کی باتوں میں آ جاسے ہیں لیکن بابائی! آج تو یہ بے کہ بہت وقت گزر گیا ہے اب تو میرے مگر والے بھی پریشان ہوئے ہیں۔ آپ اکثر تعویذ کا ذکر کرتے ہیں مجھے بھی ارسال کر دیں۔

☆ بنی مکی! خوش فہم نہ ہاؤ۔ تعویذ میں ضرور تیار کروں گا مگر اس کے لیے مجھے تفصیل درکار ہے۔ اپنا اور زانیہ والدہ کا نام شوہر اور شوہر کی والدہ کا نام میرا تار تار پیش ارسال کرو۔ جوانی لگانے پر واضح اور صاف پتہ لکھو تاکہ جواب تمہیں بھیجا جاسکے۔

□ زباب۔ کراچی۔
□ بابائی! میں نے پہلے بھی آپ کو کئی بار اس مسئلے کے لیے خط لکھا اب پھر لکھ رہی ہوں۔ میں ایک لڑکے کو بہت چاہتی ہوں وہ بھی مجھے بہت جانتا ہے مگر شادی نہیں کرتا۔ ہماری عہدیت کو 5 سال ہو چکے ہیں دونوں خاندانوں میں تقریباً تمام بڑے سے بات جانتے ہیں۔ بابائی! اگر میری اس سے شادی نہیں ہوئی تو میں مر جاؤں گی۔ سلیئر! آپ اللہ والے ہیں کچھ کریں۔

☆ بنی زباب۔ ایک شخص تم سے عہدیت کرتا ہے مگر چاہتا نہیں جانتا یہ کبھی عہدیت ہے؟ تمہیں اس

بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ تمہیں صرف بنام کر رہا ہے۔ غفلت بائیں کل ہے۔ اب بھی وقت ہے اپنا راستہ بدل لو۔ اپنے والدین سے عہدیت کر دو بہن بہنیاؤں سے عہدیت کر دو اللہ اور ان کے نبی سے عہدیت کرو۔ کامیاب رہو گی۔ نماز پابندی سے پڑھا کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اور ضرور دم کرو تاکہ شیطان سے محفوظ رہو۔ کوئی کم پور صرف شیطان حادی ہے اور کچھ نہیں۔ اللہ تمہیں محفوظ رکھے۔

□ تنزیلہ اہم۔ خانیوال۔
□ بابا جان! میں سینڈائز میں پڑھتی ہوں پچھلے 3 سال سے امتحان پاس نہیں کر پارہ ہوں چاہے کتنی محنت کروں انگریزی کے سبب میں قفل ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھے تعویذ دے دیں تاکہ میں پاس ہو جاؤں۔ سب لوگ بہت مذاق اڑاتے ہیں۔
☆ بنی تنزیلہ! تعویذ کے بجائے تم کسی ایسے استاد سے پڑھو۔ تمہیں درست سمت میں عہدیت کی ضرورت ہے۔ خوب دل لگا کر محنت کرو گی تو ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔ کثرت رب زب زب دلی بڑھا کرو۔ باوجود برا کرو اور اللہ سے کامیابی کی دعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی عطا ہوگی۔

□ مجاہدین۔ لاڑکانہ۔
□ بابا سائیں! میں صرف آپ کے کالم کی وجہ سے ”جی کائنات“ خریدتا ہوں حالانکہ یہ احر ہمارے شہر میں بہت مشکل سے ملتا ہے۔ بابا سائیں! میرا مسئلہ بڑا سنگین ہے۔ کاروباری معاملات بہت خراب ہو رہے ہیں بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ جس شخص کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں وہ دھوکہ دیتا ہے۔ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں جتا ہے کیا کروں؟

☆ بنی مجاہد! اللہ تمہارے حق میں بہت فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت

پڑھو۔ پریشان مت ہوا اللہ سب بہتر کرے گا۔ جب رزق میں بندش محسوس ہونے لگے تو اللہ کے بندوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا کرو رزق دائر ہو جائے گا۔ یہ انتہائی سہل طریقہ ہے اور اللہ کی نظر میں بہت محبوب بھی۔ تم کوشش کیا کرو کہ کثرت یتاؤ! کیا کاروبار کیا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ شائستہ زمان۔ پٹنہ۔
□ بابائی! میں بہت پریشان ہوں مجھے کسی نے آپ کا پتہ یا تو آپ کو کوئی لکھ رہی ہوں اللہ کرے یہ آپ کو مل جائے۔ بابائی! میں اپنی شادی کے 2 ماہ بعد ہی بیوہ ہوئی۔ میرا خاندان کراچی میں گاؤں کا کام کرتا تھا۔ کسی نے اس کو کوئی رادی۔ میں 6 ماہ بعد بہت تلاش کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کو لاوارث جان کر دیں بھی کر دیا۔ آپ مجھے کہتے ہوں کہ مجھ پر کیا کرنا ہے۔ میرے ساس سسر بہت بڑے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا راز بھی کراچی میں ملازما چاچا تھا۔ یہی اسے بچا ہے۔ بچوں کے ساتھ رہ رہی اب بھویں بیوہ ہو گئی کوئی کسانے والا بھی نہیں۔ جب تک شوہر لا پڑے تاہم امید بھی کہ شاید واپس آ جائے مگر اب تو وہ بھی ختم ہوئی۔ بابائی! مجھ ایسا بڑھنے کو دیں جس کے بڑھنے سے بھوک نہ لگے۔ ہم کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے اور اب تو لوگ جب تک جنازہ دیں مذہبی نہیں کرتے۔ میرے ساس سسر بہت ہیں۔ میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی۔ میرے شوہر کے والدین ہیں۔ کیسے چھوڑ دوں؟ آپ بہت نیک انسان ہیں۔ میرے لکے کو کم جائیں اور میرے حال پر رحم فرمائیں۔

☆ بنی شائستہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تمہارے شوہر کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جس ماندگان کو میر جیل عطا فرمائے۔ بنی!

خیال کرنا

پچی کہانیاں کے تعلق اور کہانیاں میں پچی اور خیال کا گھس بھوستہ

لمبی مدد

اللہ جانے

رات کے تقریباً 10 بج رہے تھے۔ میں اگلے دن ہونے والے پہلے کی تیاری میں مصروف تھی کہ چاکر میرے سوپاں کی کچل ٹون بنی۔ چوتھی میری دوست کا تھا کہ بیٹھ جلدی سے نڈو چھل گاؤ۔ میں نے ایک لمحہ خارجے کی بھڑکی دئی کھولا تو دیکھا وہی مارواڑی جلاؤ لھیرا ڈاکو قازمک کی خیریں چل رہی تھیں جو میرا لاکھ پیچہ لٹوی ہونے کا عندیہ دے رہی تھیں۔ یہ آج کل روز کا تماشا ہے ہوا ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے کراچی میں معمولات زندگی مصل رہے۔ ان ہی حادثات و واقعات کی بنا پر ایک میرے دو پرے پستی ہو گئے ہیں اور اب یہی سوچ میری پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی کہ ہم لوگ کس سمت جا رہے ہیں؟ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے جسے ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے جہاں ہمیں نہ صرف مذہبی آزادی حاصل ہو بلکہ اللہ پروردار نسبت کا فیصلہ کرنے کا بھی اختیار ہو۔ ہم پر سکون ماحول میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ ہمیں حسبِ مشافہ معاش حاصل ہو اور ہم مرضی کا طرز زندگی بسر کر سکیں میرا کیا ہے؟ پاکستان اپنے قیام کے وقت سے بلکہ ہمارے پینٹنے ہی انتہائی پیچیدہ مسائل کا طرز زندگی بسر کر سکیں میرا کیا ہے؟ پاکستان اپنے قیام کے وقت سے بلکہ کی سہارے کا منتظر ہے۔ بھی یہی امریکہ کی طرف دیکھتا ہے تو بھی چین کی طرف..... میں اللہ کی طرف نہیں دیکھتا جس کے نام سے تباہی و شرد سے لے کر آج تک پاکستان کے تمام حکمران مصلحت اور بھوتوں کا شکار رہے ہیں۔ یہی وہ بھوت ہے ہیں جو قوم کے وسیع تر مفاد کے نام پر قوم کا گلہ گھونٹے جا رہے ہیں۔ کراچی مصلحتوں اور بھوتوں اور قوم کے وسیع تر مفاد کا سب سے بڑا شکار ہے۔ یہاں ہمیں والی مختلف تو نہیں اپنے لیے کو مضبوط بنانا چاہتی ہیں اور یہی سیاسی منافات عوام کی بھڑکی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اب ملکوں کے تعلیمی سال تباہ ہو رہے ہیں۔ آئے دن کے پستی و انتقام ظالموں کے مستقبل سے ایسے رو رہے ہیں۔ اللہ جانے ہم اس بھوت سے کب نکلیں گے؟ کیا بھی نہیں ہم ہمارے نکلیں پر سکون پاکستان دیکھیں گی؟ اللہ جانے.....!

ملک مفرد عباس اعوان خانواد

یقین اور امید

جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اسی طرح وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں حالات کے ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی نہیں سے آئی ہوتی ہے۔ وہ انسان کا سیاق ہوتا ہے جس نے انتہائی کار نیکیوں میں امید کا چراغ روشن رکھا اور امید اس خوشی کا نام ہے جس کے انتظار میں تم کے ایمان بھی کٹ جاتے ہیں۔ امید کہ واقعہ کا نام نہیں ہے تو صرف مزاج کی ایک بات ہے قدرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام امید ہے۔ بقول ناصر کاظمی

دستِ اجماعی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ہوں وہ ہماری برادری کا ہی ہے۔ میرے والدین اور بھائی اور لڑکے کے گھر والوں کو کوئی امتیاز نہیں۔ وہ رزم کرنا چاہتے ہیں میرے بھائی اس رشتے کے خلاف ہیں حالانکہ وہ اس لڑکے کے اچھے دوستوں میں ہیں لیکن مین کے ذریعے میرے والدین کو بلکولایا ہے کہ اگر شادی کی تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ ہم سب لوگ بہت پریشان ہیں۔

☆ بی صوفی!

☆ بیٹے غیم.....! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی باندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 سچ زب۔ زندگی عسلی کا پڑھو اور عاکرو۔ بہار منہ دیکھ سات بادام ضرور کھائی کرو۔ مدت 40 روز ہے۔

جن دادو۔

○ بابائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ میری بی بی ایک بچی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں بڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہی خطہ میں دوسرے سے گھورا رہا ہوں جب ناکہ آپ ”پچی کہانیاں“ میں لوگوں کے مسئلے کرتے ہیں تو سوچا میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا بیٹا نہیں بھی معلوم نہیں۔ میں آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے میں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں دیتا ہوں گا۔

☆ بی جن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوانی لگانے پر واضح پتہ لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام صحیح والدہ اور بیوی کا بھی مل نام لکھو۔

☆ بی جن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوانی لگانے پر واضح پتہ لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام صحیح والدہ اور بیوی کا بھی مل نام لکھو۔

○ قُلْ اَلَيْسَتِى الْيَتٰمٰى وَالْمَسْكِيْنَ وَ اَلْقَلْبَ ذَكْوً اَفَعَجَلَكَ كَلْفَةُ الْفَقِيْهِ؟ قَا نَعُوْا اِلٰهَ تَاٰبِلٰى اَلْقَلْبَ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سُوْا

مفرد بابا آیت نماز فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو اور عاکرو۔ معاملات کو تمہارے بڑوں کو سمجھنا چاہیے۔ ماں باپ کو دودھ نہ دینے سے حالات کو سنبھالنا ہوگا۔

□ غمِ احمد۔ کراچی۔

☆ بیٹے غیم! تمہیں براہِ راست بھی جواب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد تو دے صرف اس لیے کہ غلام نہ ہو سکے کہ چپا نہ ہو بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کر دیتے ہیں وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہر حال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! میں جو بھی ہو سکے وہ ضرور کروں گا۔

□ غیم خان۔ نواب شاہ۔
○ پیارے بابائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ

اس دنیا اور اس ساحرے میں کوئی کچھ شرارت کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: ”کسے مال باپ ہیں جو یہ درد لے کر ہے؟“ مال کا پیلے آٹے ہائے اکل اس طرح کی پچا کر اچھا کر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: ”کیا یہ مال باپ کی اولاد ہوگی؟“ مال کا نام پیلے اور باپ کا نام بعد میں آتا ہے۔ میں نے اس بات پر بہت سوچا اور غور کیا کہ کیا بات ہے اولاد کی پرورش میں مال اور باپ شانہ بہ شانہ ہوتے ہیں دونوں مل کر اولاد کو پروان چڑھا لے ہیں لیکن جو نمبر دینے کی باری آتی ہے تو اس کو ترجیح دی جاتی ہے اور بے پارے سے باپ کو دوسرے نمبر پر رکھا کر دیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مال کی عقلیت کے مقابلے میں باپ کی کچھ کم تر حیثیت رکھتا۔ بچوں کی پرورش میں باپ مال سے زیادہ وقت و مشقت کرتا ہے۔ جن بچوں کے لیے کسی بے فکر سے لٹکا ہے روز کی کمانے کے لیے جا رہا ہے میں درد میں جا سم تو رہا ہوں بخار یا شہر کے حالات خراب ہوں بارش ہو مگر ہیکے ہی حالات کیوں نہ ہوں مال کا کام کرتا ہے۔ مزدوری کے لیے لٹکاتا ہے۔ وہ سارا دن کام ڈھونڈتا ہے اور دل میں دعا میں کرتا ہے کہ کوئی کام لے جائے تاکہ میرے بچے بھوکے نہ سوئیں۔ صرف یہ ہی نہیں بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے چوری کرتا ہے رشوت لینے کے لیے کہ نہیں کرتا ہے پیرا پچھری کرتا ہے رشیک ہر چھاپا کا نام اپنی بیوی اور لڑکے کے لیے کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ وہ جو مرا کام کر رہا ہے وہ غلط اور نکاح ہے لیکن اولاد کی محبت میں یہ پاگل باپ گناہ کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اتنا شب کچھ کرنے کے بعد بھی محنت اور محبت سے پروان چڑھنے والے بچے وقت پڑنے پر مال کا بھی ساتھ دیتے ہیں۔ شوہر کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس وقت میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر بیوی طلع لیتی ہے تو بھی میں اسے اپنا کاغذی ساتھ دیتے ہیں۔ باپ اگر دوسری شادی کر لیتا ہے تو بھی اولاد والی مال کا کاغذی ساتھ دیتی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی میں لڑائی ہو جائے اور بچوں کو کھلوم بھی ہوتا ہے کہ اس میں غلطی کی مال کی اس لیے کہ پھر بھی اس کی حمایت لینے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر باپ کی شفقت کو قبول جاتے ہیں۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ باپ کا بھی بہت ہی اہم درد ہوتا ہے۔ ترب و ذرا لالہ لے کر لایا کہ مال کی طرف سے بھی تنہا ہے۔ مال کے قدموں سے جنت ہے لیکن اللہ پاک یہ بھی فرما رہا ہے کہ باپ کی ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔ باپ کا احترام کارہ عطا کیا گیا ہے۔ اگر مال اولاد کی خاطر اپنی راتوں کی خندہ پر کارتی ہے تو باپ اتنا دیکھنا اور سکون غارت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مال مگر کی روٹی ہے تو اس گھر کا چراغ باپ ہے۔ کسی نے کہا کہ مال قش کا قش پھول ہے تو میں کہتا ہوں پھول میں شمس شمس ہے وہ درخت باپ ہے۔ مال کی خلق میں محبت اور مہربانی کا نمبر شامل ہے تو باپ بہت شفقت اور عفت کا مجموعہ ہے۔ مال کا دل اتنا وسیع ہے کہ اس میں کائنات سما جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ باپ کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ کائنات کا ہر دکھ اور غم اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ میرے سامان چند الفاظ کا مقصد یہ ہے کہ میں آج تکوں کو والد کی کیا اہمیت ہے۔

کیا ہم نے بھی سوچا ہے کہ ہمارا قی کو کون اور حقیقی خوشیاں کیوں درد چلی گئی ہیں؟ ہمارے رزق میں ہر کم کیوں نہیں رہی؟ کیونکہ ہم نماز سے گریز ہیں۔ بہت معروف زندگی ہے ہماری تعجب ہے ہمارے پاس تو مال ہے وقت نہیں؟ تلاوت قرآن مجید کرنا ہم نے ترک کر دیا ہے۔ فضول شمس کے لڑ پچھو سارا دن پڑھتے رہے۔

ہر گھر آج بچہ سے دور بھاگتے ہیں۔ والدین کا احرام نہیں کرتے۔ انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ نافرمانی کو ہم نے سول بنا لیا ہے۔ بوقت میں ملاوٹ یا پھر نہ اپنائی کرتے ہیں۔ دوسرے مسلمان بھائی کو گھر کو نہ لے کر جاتے ہیں اور لوگوں کی فرصت میں یہ کام فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسلام سے دوری اللہ اور اس کے رسول کے فرمان سے دور گردانی کر دینے کو تو ہم کسی کس مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے؟ آج بے سولہ سے خدا کے حضور ہر گھر کے سب سے سرب سے ایمان داری اور فرض شامی سے زندگی گزارنے کا عہد کر رہے۔ وہ گورہا میں لوگوں کو چھوڑ کر ہر طرح کی چیزیں تاکہ لڑکی رخصت اور طلاق عدا کی ڈھانچے میں لے کر جاتا ہے۔ یہ مال باپ ہوں پھر ہمارے پاس ناکی خوشیاں اور یہ سکون کی زندگی کے لحاظ تعصیب ہونے لگے۔

اگرچہ ”دوست“ چار حرفوں کا مجموعہ ہے پر اس کی وسعت اور گہرائی کو جاننا ناممکن ہے کیونکہ اس کی گہرائی سمندر برابر دھوا رہی ہے۔ عظمت آسمان سے بھی بلند ہلا ہے۔ رشتے تو سارے ہی عقلم ہوتے ہیں لیکن زندگی کا شوق عقلم دل کا ساتھ ساتھ ساتھ انسانی ناگہم بھی ہوتا ہے جو ہلکی سی جوت سے روز بروز ہوا جاتا ہے تو بچے وقت اس رشتے کا دل اس میں گہم ہوتا ہے۔ غیب اس حساس ہونے سے اس وقت تک بہت دور ہو جاتی ہے مگر زندگی کا چھپتا ہوا ہونے سے اور گہم ہونے سے ہلکی سی جوت سے لطف دے دیتا ہے۔ میں نے بھی بہت سے دوست بنائے تھے اس کے بعد دوستوں کے بغیر زندگی اور حسی کے لطف دے دیتا ہے۔ بہت دوست بہت ہی خاص دوست بنائے تھے پھر زندگی کے ساتھ ساتھ ساتھ ہم پچھلے جتنے جتنی کے شب و روز گزرتے گئے۔ کچھ دوستوں کو کو وقت کے بدل بدل دیا۔ کچھ منہ لیا اور کچھ دور ہو گئے۔ میری انٹے لٹنے دی باپ میں سوچتا ہوں جو میں نے دوستوں کے ساتھ وقت گزارا وہ غریبوں کی تھاپہ وہ پوسر تائیں باپ دادی ہیں۔ اگرچہ آج ہم تو دور ہیں لیکن ایک دوسرے کی یادیں تو ہمارے پاس فطرت کا یہ قانون ہے کہ کوئی چیز کی عینہ قائم نہیں رہتی یہاں ہر ایک کے مقدر میں ہوتی ہے۔

زندگی کی مثال سفر کی طرح ہے۔ اس زمین پر ہر انسان ایک مسافر ہے۔ مسافر یا مسافر کو ڈھونڈنا ڈھونڈنا ہے۔ ہر لے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ زندگی کے اصول سفر کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرے۔ قلعہ کی راہ وہ جو بہت سہل ہے دکھائی آتی راہ پر سفر کرنے والے مسافروں کی آسانی کے لیے روٹ کتاب عطا فرمائی وہ وہ واحد ہے جس کی حفاظت اس ذات پاک کے ہاتھوں میں ہے جس سے بڑا حافظہ کوئی نہیں۔ مسافروں کی تیز راہ کے لیے اس زمین و زمین و زمین و زمین کے لیے اس کتاب کا ملکی نمونہ جی اخرا لے کر اس کی صورت میں دنیا کے لیے ہمارا گھر سمجھا جاتا کہ قلعہ کی راہ اختیار کرنے والے یہ مسافر سفر کے مشکل مرحلے میں آپ سے رہنمائی حاصل میں اور اس سفر کی تمام منازل خوش اسلوبی سے طے کر کے منزل منزل پر کار نامہ لکھیں۔ آج سفر کرتے یہ ہمارے منزل کو فراموش کر بیٹھے ہیں اس عارضی مسافر کا وہ مستقبل سمجھنے والے۔ ادا ان مسافر ہر کی تاریکی میں ہی لیے آج بے سکونی اور افراتفری ہے۔ یقیناً یہ ان فطری قوانین سے دوری کی وجہ سے ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔ ترب کائنات کی یہ مقدس کتاب ہمارے اس سفر کی آسانی اور کامیابی کے لیے نازل کی گئی ہے۔ حسی سے ہم یہ کتاب پڑھ کر ضرور دہم ہو جائے ہیں نہیں ہم نے کیا پڑھا؟ کتاب نے کیا بتایا؟ بے شک



نئے امکانات کا شاعر

کاشی چڑھان

عکاس شعر

آر دو شاعری کے کلاسیک عہد تک شاعر کا ایک نام ہوتا قادر الکلام شاعر کے لیے محبوب سمجھا جاتا لیکن مصطفیٰ خاں شفیق صرف غزل کہتے تھے آر دو اور فارسی میں جبکہ میر سودا غالب مومن اور ذوق ایسے امراء ہیں جنہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ میر غزل میں بے مثال ٹھہرے سودا قصیدے کے شہر اور غزل پر اپنے غالب اور مومن نے غزل میں ہم کما اور ذوق کی پہچان قصیدہ ہی ہے گو کہ ذوق نے غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔

عہد بدلا ہے تو اُس کے ساتھ ناظر بھی بدل جاتا ہے۔ طرزِ احساس میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ہے۔ زندگی کے کیڑوں پر نئے طرزِ احساس سے پرانے ہی رنگوں کو اس کمال اور ہر مندی سے استعمال کیا جاتا ہے کہ زندگی اپنے تمام تر رنگوں اور جہات کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کاشی چوہان بھی ایک ایسی تخلیق کار ہے جس کے پاس زندگی کی ہر جہت ہے اور اس زندگی کا ناظر بن گیا ہے۔

کاشی نئے امکانات کا ایسا اور نیکل شاعر ہے جو خیال اور دُش دوں سطحوں پر ایک نئے عمارت سے

یہ کتاب پڑھنا سعادت ہے لیکن اس کے سنی اور شہوم سمجھ کر نہ پڑھنا اس سے مستفید نہ ہونے کے برابر زندگی کے کامیاب سفر کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اسے ہمیں تاکہ اپنی منزل حاصل ہو ورنہ ہم اس آرب کا جو سی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

سمندر کی لہریں

کرن شیر کراچی

سمندر کی لہریں تیری سے آگے بڑھتی ہیں اور ہم ان کے بڑھنے کا بڑی دیکھی اور جوت سے نظارہ کرتے ہیں جوں جوں وہ آگے بڑھتی ہیں ہمارے دلوں میں دنیا کی ایک لہریں اٹھتی ہے ان کے قریب آنے کا جوش ہوتا ہے چلا جاتا ہے۔ لہروں کا جوش ہماری توجہ اپنی جانب متغیر نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے کہ جوں جوں لہریں ہمارے قریب آتی ہیں ہمارے دل ہم جانتے ہیں غیر ارادی طور پر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ اس عجیب سی کشش کی وجہ سے ہم اپنی اپنی کاپی اور خوف کے طے ملے تاثرات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور ہر گھر میں ان سے کتنا ہی دور رہیں یہ دور تک پہنچا کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں اور جب یہ ہمارے جیروں کو چھو کر واپس لوٹتی ہیں تو ہمارا خوف ایک عجیب لطف میں بدل جاتا ہے۔ یہ اپنی واپسی کے نقشِ تجسس اور حسرت سے چھوڑ کر جاتی ہیں کہ گویا ہمیں اپنی طرف بلا کا ایک بہانہ آئی ہو۔ واقعی کتنی بے خوف کتنی شہر اور بے باک ہوتی ہیں سمندر کی لہریں۔

عبداللہ ربیعی، لاہور

کیا یہ ہے پاکستان؟

میرے وطن کے پیارے لوگو!.....! ابھی آپ نے تجدی کی کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے قتل و غارت خانے کے بارے میں سوچا ہے کہ ہم کیا تھے اور ہمیں کیا بنا دیا گیا ہے؟ بہت پریشان حال ٹیٹھن زدہ فرزندِ وطن کے بارے میں چلنے پھرتے انسانی ڈھانچے..... کام کچھ ہوتا ہے کرتے کچھ ہیں جانا دیکھیں طرف ہوتا ہے عزت کا کچھ طرف جاتے ہیں کچھ کچھ ہوتا ہے کچھ کچھ ہوتے ہیں۔ سوچنا کہ کیا ہم اپنی حالت بدل جائیں گے؟ حقیقت ہے جو قوم اپنی حالت خود نہیں بدلتی خدا بھی ان کی حالت نہیں بدلا۔ جسے اللہ ہم سے ناراض ہے۔ جیسے ہمارے اعمال ایسے ہی برے ہیں کہ ان کے ساتھ پاکستان اپنے حکمرانوں نے پوچھنا ہوں کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ کبھی کے بل ہمارا کریں کہ ہر گھر کی غائب پانی کے کٹ بھی ہمارا کریں کہ پانی غائب کیس کے بل پابندی سے ادا کریں کہ گیس غائب اور پھر عوام احتجاج نہ کر سکا کیسے؟ یہ دیکھنا اس قدر زیادہ ہو چکی ہے کہ ہر چیز کو خریدنے سے باہر ہوئی جارہی ہے حالانکہ ہر چیز ہمارے وطن میں پیدا ہوتی ہے پھل اور سبز یوں کی مثال لے کر انسان ہر ماہ کو چھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ بڑے مکھڑے جوان ڈگریاں اٹھائے مارے مارے پھر رہے ہیں انہیں جواب نہیں دینا وہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ حکومت آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضے پر قرضہ لیتی جارہی ہے صرف اپنی جیوریاں بھرنے کے لیے۔ آج ہر پاکستانی پ=66,500 روپے 66,500 روپے کو خانہ آفرقش ہے جو ہر عورت کی بیویوں میں چلا گیا اور ان کی حمایتوں کی نذر ہو گیا وہ ان سے کون بھول کرے گا؟ دوسرا ہر چیز پر ان کے سیکڑے سیکڑے دیکھ کر صوبائی لیگس صفا لیگس آہ..... ٹھکس لیگس..... ہر گھر آج کا انسان..... میرے وطن میں دنوں.....! اپنے حقوق کی لڑائی لڑنے کی اپنے اندر جرات پیدا کرو۔ آج بھی پاکستان تو مہرے ملک ہے ان حکمرانوں سے دلوں نہ کر کے تو ہماری آجیہدہ ملیں ہمارا کرپاں بکڑ کھال کریں گی۔ کیا یہ ہے پاکستان؟

خواب کی موجودگی کا پورا یقین ہے اس کے یہاں کسی میلان یا رجحان کی کا ڈر نہائی نظر نہیں آتی لیکن غزل اپنے آداب و انداز اور اسلوب کے ساتھ جتنی ہے۔

یہیں خواب دیکھنے کا ہنر مستقل جاننے سے آیا ہے وارادت حسن و عشق، ہجر وصال کا دلگداز بیان اس کی غزل میں جا بجا نظر آتا ہے۔

تہری آواز سن کر سوچتے ہیں کبھی ہوتا تھا یہ لہجہ ہمارا سادہ الفاظ و دلکش تشبیہات مانوس استعاروں میں زندگی سے جڑے تمام تر مسائل کا کشی نے تاثیر اور تاثر کی نقاشیں بیان کیا ہے۔ یہ نغفا قاری کو دیر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ سوز و گداز سادگی و اثر آفرینی تازہ کاری، فکری و نفسی میلانات کی نمائندہ اس کی غزل عہد موجود میں جتنی ہوئی انداز کی نو حد گیری کی خواہش کے تقصیر پر مرکوز نظر آتی ہے۔ عصری حیاتی شعور نے اسے ایک اور رقم کدے سے وابستہ کر دیا ہے جس میں آئسو بہانے کے ساتھ ساتھ اقتدار کے موٹی ریلے کی زبان کا لاری کا احساس اس کی نازک خیالی کے آئینے کو چھٹکانا چاہتا ہے۔

سڑکوں پہ جس کی عمر کتنی وہ بکھر گیا اچھا وہی رہا جو شرمشام گھر گیا اس دُخم کے طفیل ہی میرتا ہے اپنا ہیٹ بھوکے ہی ریں ریں گے جو یہ دُخم بکھر گیا

کاشی کی غزلیات میں فنِ تغزل اور بیہودہ بات چندی کے ساتھ گہرا اور فکر کا کاشی اظہار موجود ہے۔ روحانی کیفیت کے اظہار میں جو اشعار اس مجموعہ

کلام میں ملتے ہیں اُن میں سلاست، برکتی روانی اور تازگی ہے۔

ترے اطراف آوازیں ہیں تیری مرے اطراف سناٹا ہے مرا حال کیا پوچھتے ہو حال مرا میرے چہرے پہ ہی رقم ہے یہاں

تم کسی بھول میں نہیں رہتا یہ کبھی دُخم میرے اپنے تیں روشن حسین صبح کی ایک شام ہوتا چاہے کچھ اور اسے عشق کا انہام ہوتا چاہے "اور تم" کی غزلیات میں زندگی اور محبت سے جڑے مسائل اور ان مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات موجزن ملتے ہیں۔ کاشی چوہان کی غزل ایک شفاف آئینہ کی مثل ہے جس میں معاشرے اور زندگی کا کس صاف نظر آتا ہے۔ اُس نے کاشی شاعری نہیں کی بلکہ زندگی کو سمجھ کر کاشی تعمیر پیش کی ہے۔ ابہام سے اس کی شاعری کھول دور ہے۔

راستوں کا نصیب ہوتے ہیں کچھ مسافر عجیب ہوتے ہیں جن سے ملتا نہیں ہے دل اپنا کیوں ہمارے قریب ہوتے ہیں؟ کاروبار میں فرستوں کے بل کب کسی کو نصیب ہوتے ہیں "اور تم" کے مطالعے سے ایک بات واضح ہوگی کہ کاشی کی تمام شاعری ویدیکی اور ابہام سے

یاد ہے سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

کاشی کی غزل میں داستانِ حسن و عشق کے ساتھ ساتھ آدھ شوب زمانہ اور ساسی و دھاسی حالات کی شکست و ریخت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ گہرے مشاہدات اور ذوقی تجربات کا کس اُس کی شاعری کا حسن ہے۔

اب اور کیا ہے مرے پاس جو تمہیں سوچوں تمہارے نام تو کر دی ہے ہر خوشی میں نے مری کتاب ہے کاشی کتاب اہل نظر ورق ورق پہ بکھیری ہے روشنی میں نے کاشی کے اشعار میں تاثیر ہے اور یہ تاثیر چھائی کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا وہ ہے کہ اس کی شاعری عام و خاص کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

سارے موسم اُسی کے موسم ہیں دھوپ اُس کی سحر اسی کا ہے اب وہ دل میں رہے نہ رہے یہ عکاس نہ کر اُسی کا ہے

خامشی توڑنا ضروری ہے اب مرا بولنا ضروری ہے منزئیں ہی جا میں کی کاشی پر کوئی راستہ ضروری ہے

کاشی کے لوازمات شاعری عام فہم اور شاعرانہ حسن سے آراستہ ہیں۔ اُس کی شاعری میں زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ اُس کی سوجھیں عصر حاضر کی آہ و ہوا میں پھنپ رہی ہیں۔ وہ جس عہد میں سانس لے رہا ہے وہ اُس کے آئینہ شاعری میں بالکل واضح نظر آتا ہے۔ اُس کی شاعری وجدانی

شاعری ہے اور پوری طرح شہرت کے آب رنگ سے عزیں ہے۔

کفر کے شہر میں ایمان کبھی تم نے دیکھا کبھی ہے انسان کبھی اس میں اب جان بھی جا سکتی ہے عشق بھتا نہیں آسان کبھی عصری زندگی کا نہایت ہی گہرا شعور زندگی کی ٹوٹ پھوٹ ہزار ہا رنگوں کے باوجود ہے رنگی بستی بستی زندگی کے اجڑنے کے کئی شہزاد کاشی کی شاعری میں کثیر الہیات انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا جذبہ و احساس بھی مختلف انداز میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مری بستی میں اب انصاف ہوگا کہ ہاتھوں میں ترازو آگیا ہے اجالا سا یہاں دکھا ہے ہم نے نظر میں جب وہ جھنڈا آگیا ہے

رہیں قید کب تک جو ٹھکس نہ کرے تو مر جائیں گھٹ کر زمانے کے درے

وہ ہے وہ سایہ وہ چڑیاں کہاں ہیں؟ ہوا پونجھتی ہے یہ سوکے شجر سے کاشی چوہان کے ہاں ایک نیا منظر نامہ ایک خوبصورت شعری فضا اور ایک نئی قوتِ موشعری کا نکتہ کو ترتیب دیتی ہے۔ اس پر اس کا غنائی لب و لہجہ اُس کے خوبصورت خیالات کو depict کرتا ہے۔ کاشی کی غزل خوشامحیت کا آئینہ ہے۔

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار ادبی ذوق کے آئینہ دار

شاہن عباس..... غفران احمد سرسہ
عشق میں دہری شہقت کی ہے
حالت بھر میں ہجرت کی ہے
افضل گوہر..... روینہ بیگم گوہر خان
سوچا تھا اب کی بار کنارے پہ جاؤں گا
دریا بھی میرے ساتھ نہی ٹاؤں میں آ گیا
غنیہ شہناز کاظمی..... عابد شیر علی
باد کیا اس کی جلی کو رکھے
وہاں سے اپنا مکان جاتا ہے
امجد سراج..... رشوان کوثر لاہور
اجمل سراج ہم اسے بھولے ہوئے تو ہیں
کیا چاہے کیا کریں گے اگر یاد آ گیا
میر احمد لویہ..... غیاث الدین پشاور
اب تو کر کیجیے ساعت آپ قصہ عشق کا
آہ نکالے آئے ہیں ہم مختصر کرتے ہوئے
حسین جاوید..... طارق بصیر موات
کسی بھی دل میں ہمارے لیے جگہ نہ بنی
زمین اپنے لیے خاتمہ خدا نہ بنی
محسن اسرار..... شعیان کورہ کورہ
عجیب شخص تھا لوہ گیا میرا سب کچھ
معارفہ نہ لیا دیکھ بھال کرنے کا
ترسان چٹائی..... سلمان بھائی سیال
میں یونہی ہاتھ بوجھا رکھوں
چاہے کچھ ہاتھ نہ آئے میرے
سید زاہد حیدر..... نواب علی محمد
دل ہیں جانے کتنے خواب
وَن یا قبرستان ہے سائیں
محبت درد بان..... راحہ فیض ملتان
بات دل کی دل سے ہو جانی
سچ میں تم داغ لے آئے

نیل باغی..... ردوان ساہیوال
گر بڑے تو اٹھا کے چوم لیا
میں نے لفتوں کا احترام کیا
تہذیب جانی..... اور نقا علی بہلم
میری آنکھوں نے دو مقدس ہاتھ
یہ اندر راجھی روٹی ہے مجھے
کاشف مجید..... نو میرہ خان ملتان
گلاب جس کے لیے ہیں اسے خبر کروں میں
وہ دل بھی آئے کہ اس کی طرف سز کروں میں
عمران بڑی..... سہی کل بھور بن
کچھ کھل نہیں ہے دنیا میں
گویا یہ بات بھی ادھر کی ہے
فرخ اظہار..... معاذ خان انکب
زندگی کچھ دلوں کی ہے اور میں
کچھ دلوں سے بہت پریشان ہوں
تو قیرٹن..... فرزند شیر نورالائی
تو ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کے بتا
کیا مری بات میں اثر نہیں کچھ
اکبر مصدق..... مقصود بوج دادو
نیند میں گھٹکا رہا ہوں میں
خواب کی دمن بنادیا ہوں میں
انعام منڈی..... فریحہ پارک پیکہ جھنگ
دبے جلانے گئے یا دبے بجھائے گئے
ہر ایک رسم کا آغاز میرے گھر سے ہوا
وجہ ثانی..... فاطمہ بتول کراچی
یہ سوچ کر گھست سے ہم مسکرا دیے
تاکایوں نے جیت سے مسکرو سکا دیے
صفر ملال..... انجیلیا داؤد ہاڑی
لوگ اُس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

چڑھ گئی اس پہ تل نفرت کی
وہ جو اک تھا بھر محبت کا

دعا اس نے بھیجی ہے کچھ اس ادا سے
سدا خوش رہو تم ہماری بلا سے
کاشی کے ہاں مضمون آفرینی دفعہ خیال
اسلوب بیان اور اس پر بلا کی سادگی پر کمال پر نظر
آتی ہے۔ وہ نہ صرف بات کرنے کے ہنر سے آشنا
ہے بلکہ اس کے پاس کہنے کے لیے باتیں اور
مقتضیات تازہ موجود ہیں۔ وہ معاشرے کا ایک ذمہ
دار فرد اور حساس شخص کار ہے۔

گھر دلوں میں بیٹھے دلوں کو کیا خبر ان کی
وہ تجربے جو میں رہگروں میں ہوتے ہیں
کاشی چوہان میرے بھائی نے پورے
چاند کی اس چمکتی رات کی مقدس و پاکیزہ
ساعتوں میں اپنی تھیلیوں پر دُعاؤں کے چراغ
جلائے۔ خداوند کی بارگاہ میں درخواست گزار
ہوں کہ وہ تمہارے قلم کو مزید روانی، سوچ کو
وسعت اور چمکیں مزید علمی بصیرت سے
نوازے۔ تم جیہت جیو۔ (آمین!)

☆☆☆

کتاب تبصرہ

وہ شاعر حضرات جن کی خواہش ہے کہ
اُن کی کتابوں پر بھی تبصرہ شائع کیا جائے
اُن سے گزارش ہے کہ اپنی مطلوبہ کتاب کی
دو عدد جلدیں ماہنامہ ”چمکی کہانیاں“ کے
پتے پر ارسال کر دیں۔

بات گرد آدی کی ہے یارو!
آدی روز و شب بدلتا ہے

اک اک پوچھتا ہے مرا حال شہر میں
بے کار ہے یہ حال مگر تم کو اس سے کیا

تو پھر کیسے میں گھر میں بیٹھ جاتا
مرے اندر کوئی بے گھر تھا ایسا

قرص کرتا ہے درو یوں مجھ میں
جیسے جنگل میں مور ناچے ہے

اپنے پھولوں کو ٹمکرتا دیکھوں
اس قدر تاب کہاں ہے مجھ میں

عجیب شخص تھا جو کشف ہوا مجھ پر
مری نگاہ کو اک روز آنکھ کر کے

مجھ کو غم نے سنجال رکھا تھا
خوش ہوا تو خوشی سے ٹوٹ گیا

کاشی چوہان مصنف غزل کا فطری رجز آشنا اُس
کی مخصوص مزاحیہ کیفیت اور اُس کے بنیادی داعیات
سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے کلام میں متعدد
ایسے اشعار نظر سے گزرتے ہیں جو اس کے غزل
شناس ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

آپ کو کیا لگا اُن کی دین صاحب
ہم تو خود کو نظر نہیں آتے
کاشی کے دل میں دمل کا گھولا ہوا گلاب ہو یا
پھر بھر کا دھم اس کی شاعری پر کیفیت اور ہر موسم کو
سیراب کرتی ہے۔

علی زبیر..... اینٹہ مغل خاندان

ہے عجب عشق کا کیلنڈر بھی

مستقل ہجر کا سن آتا ہے

عباس تابش..... قیسرہ علی کراچی

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جاسکتا ہے

اب بھی جلتا شہر بچایا جاسکتا ہے

کاشف خستین غائر..... ایم سعید انور سعید لاہور

خیال و خواب میں آئے ہوئے سے لگتے ہیں

ہمیں یہ دن بھی بتائے ہوئے سے لگتے ہیں

ویسے ہوں پھول ہوں بادل ہوں یا پرندے ہوں

یہ سب ہوا کے ستارے ہوئے سے لگتے ہیں

ذوالفقار عادل..... فہد بیک قادری ہزارہ

ہمارے دل میں حوالے ہیں ساری یادوں کے

ورق ورق اسی دفتر سے ہو کے جاتا ہے

حتا تیموری..... عاصم خان نیازی میانوالی

کہتے ہیں تجھ کو لوگ مسکا مگر یہاں

اک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

کاشی چوہان..... تنویر فاطمہ ایبٹ آباد

چاند سے عشق کر لیا ہم نے

رات میں رنگ بھر لیا ہم نے

اس طرح بھی تمہاری لاج رکھی

ہر گناہ اپنے سر لیا ہم نے

لیاقت علی عاصم..... ملکائی راشدہ ٹنڈو محمد خان

بھری گلی سے گزرتے ہیں بے سرو سامان

ہمیں تو شرم ہی آتی ہے گھر بدلتے ہوئے

شاہین عباس..... صفیہ کریم چکوال

اک نقش ہو نہ پائے ادھر سے مرا ادھر

جیسا تمہیں ملا تھا میں ویسا جدا کرو

اکبر معصوم..... انزلہ تاج فیصل آباد

مجھ سے شکوہ تو ایسے کرتے ہو

جیسے میں زندگی بنانا ہوں

رومانہ روی..... عندلیب خان پشاور

عشق نے ایک عجب حال میں رکھا دل کو

ہم کو اپنی جہی نہ تھی کوئی خبر صحرا میں

یہ تو احساس کی ہے بات اسے کیسے کہوں؟

تکس قدر ہوتا پڑا خاک بسر صحرا میں

عباس تابش..... نالکدا کبڑ چچہ وطنی

اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے

کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے

اور اب ہے اس لیے افسوس اپنے ہونے کا

کسی کے ہو گئے ہوتے تو ہم نہیں ہوتے

اشرف جاوید..... نزو حبیب گل ہزارہ

ہوگا یہیں کہیں یہ پرندہ پڑا ہوا

پتوں کے ساتھ پر ہے اسی کا پڑا ہوا

دریا کی موج موج میں صحرا ہے گامزن

صحرا کی لہر لہر میں دریا پڑا ہوا

شا کر کندان..... نرمن خٹک جہلم

دیکھ، خلقت میں بہت حد سے زیادہ نہ گزر

یہ نہ ہو گونج اٹھے صوت سرائیل ابھی

شاہدہ حسن..... صولت مرزا دوا کینٹ

کھنکھڑی میں بھی کوئی نہ آس پاس ملا

صدائیں دے کے دل خوش گماں نے صبر کیا

رمزی آثم..... جہاں آراء لالہ موسیٰ

بروائے خاک نہیں آسمان ہے یہ بھی

کبھی کبھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی

میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں

کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی

نینا عادل..... اقرا قرملتان

وصل ہوتا ہے کیا ہجر کا آئینہ

میں تجھے ڈھونڈتی ہوں ترے روبرو

ان نگاہوں میں سمیٹیں اگر دو جہاں

ایک میں ہوں ادھر ہے ادھر ایک تو

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔

شاعر کے نام کے بغیر شعر شامل اشاعت نہیں کیا

جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

فاطمہ بیگم

جی کہانیاں میں خواب بے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا ٹکڑا ہوا لمحہ ہی تو ہے
جس جگہ شوق نے بنیاد رکھی رکی تھی

جی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تھریلر سلسلہ قسط نمبر 5

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایٹمیاتی اتحادی ملک نامی تونس سے شادی کی تھی۔ اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب جی باپ لاؤڈ ڈیوڈ نے اسے جائیداد سے مافی گرد یا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزار دی اور سرگنی لاؤڈ ڈیوڈ کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کرتا ہے جب کہ لاؤڈ ڈیوڈ کی اس جائیداد پر ایک بھری گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک چھوٹا بھی ہوتا ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی شیلی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس شیلی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت و آبرو گم جاتی ہے۔ حالات کا مار داؤد پاکستان ہائے باپ اختیار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاں میں سسر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ کی ایک بہن سے ہوئی ہے۔ وہی ہے جو اسے پاکستان میں لے کے لیے وڑ پٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی لہجیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے دریغوں کو لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوب صورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی جسے جو داؤد کو کوا بھی گنت ہے۔ اور ایک رشتے دار انٹلی خیر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود دہلی کائی ہے اور وہ خفیہ کاروبار میں مصروف ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راجہ کا ایک طویل خط ملا ہے، جسے داؤد نے نہیں سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو سب سمجھ کر اس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی یہ خوار راجہ نے سرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ او اب آگے بڑھتے:

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسی مجھ سے میری بہن کی شادی کیوں کرنا چاہتی ہیں، کیا فہمیدہ میری بہن نہیں ہے؟ کیا وہ ابوی جینی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ شخص دے سکتا ہے۔ اسی سوچ کے تحت میں نے اس سے کہا "اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چل کر ایک کپ چائے پی لیں۔"

"کیوں نہیں؟ آپ کی دعوت کو مگرنا حیران کن ہے، میں نے اس دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ آپ کو خاص اہمیت دے رہی ہے۔ پھر جتنی جان کے ہر شے دار کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں وہی تو ایک ہیں جنہوں نے میری خاطر سب سے لڑائی مول لی۔ ان کا احسان میں چکا نہیں سکتا۔" اس نے معصوم سے لہجے میں کہا۔ وہ کسی رخ سے مجھے ہیردین کا عادی نہیں لگتا تھا پھر عمر نے اسے ہیردین کا عادی کیوں کہا تھا۔

میں اسے لے کر نزدیکی رستورینٹ میں آیا۔ اسے رستورینٹ میں لوگ کم ہی آتے ہیں۔ شاید چیزوں کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ اس وقت بھی ہم لوگ نظر آ رہے تھے اس لیے میں اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ کوئے کی ایک خالی میز پر کچھ کرسیاں بڑھا چکا گیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ "کچھ کھائے کا ارادہ ہے؟ منگوا لوں؟"

"آپ مہمان ہیں آپ بل نہیں دیں گے تو منگوا سکتے ہیں؟" اس نے صاف جواب دیا۔

"مگر لے کر میں آیا ہوں اس لیے دل دیتا میری ذمہ داری ہے؟ آپ صرف آرڈر دیں گے۔" کہہ کر میں نے ہیرے کے کارٹارہ کیا۔ وہ دینو لے کر آیا۔ میں نے میوٹوں کی ایک باجر بولا "ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں بائیں گے؟"

"یقیناً آپ پوچھیں گے کہ عمر نے مجھے ہیردین کا عادی کیوں کہا تو سن لیں اس نے غلط نہیں کہا میں ہی نہیں میری بیوی بھی عادی تھی۔"

"مگر اب آپ نے اس سے نہایت حاصل کر لی۔"

"میں ہائی ٹیک ایک آگ کا دریا چاہتی تھی ہم نے پراکریا آپ قلیں دیکھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"میری کہانی بھی کسی فلم کی کہانی جیسی ہیں۔ اور میں بلا جھجک سنا دیتی ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں سنانے پر تیار ہوں کوئی سے میں نے شادی کی؟ کیوں میری عمر کا عادی بنا؟ کیوں جیل بنا کر آئی؟"

کسی سے کوئی راز کی بات معلوم کرنا ہوتا ہے اس کے دل میں جگہ بنانی پڑتی ہے اسی لیے میں نے اس کی کہانی سننے پر خود کو راضی کر لیا اور بات میں جواب بھی دے دیا۔

"تو سنیں میں ایک ایک بات جزیات کے ساتھ سنا دیتی ہوں۔ اس دن میں ڈیوٹی سے واپس آ رہا تھا مگر جیسے ہی گلی میں داخل ہوا ٹھٹک کر رہ گیا۔ میری نظریں اس پر جم گئیں۔ اس وقت میری کھلی ہوئی عمر تھی۔ ایسی عمر جو ستر سو پر آسانی ہے۔ لیکن امی کی بندشوں اور بے چارہ جانتیوں نے میرے اندر خجندگی پیدا کر دی تھی۔ میں نے بچپن سے سیدھے بڑھا ہے میں چھلانگ لگتی تھی اسی لیے تیرہ بات کو عقل کے میزان پر تولنے کی عادت تھی پھر میں نے ٹھٹک گیا تھا۔ کئی کے موڑ پر آتے ہی میری نگاہیں اس کار پر جم گئیں۔ کار میں روشنی تھی اندر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ کار کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور سرخ چٹڑیوں میں بیٹوں ایک دوسری نوخیز لڑکی بونٹ پر چکی ہوئی تھی لپ پوسٹ کی عثمانی روشنی میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی کسی ماڈلن

گھرانے کی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میرے خیال کی تائید کر رہے تھے۔ ایسے جدید تر اشی کے کپڑے اس گلی میں شاید ہی کوئی پہنتا ہو۔ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کا حسن گل اٹھا تھا۔ اس نے ایک لمبے کے لمبے میرے طرف دیکھا اور وہی لمحہ پر پتلی بن کر گر گیا تھا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا اور پہلی بابو کی منہ دیکھی لینے کے لئے چلا تھا۔

لڑکیاں میں نے ہزاروں دیکھی تھیں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔ ان کی نگاہوں کو کبیروں سے لپٹنے ہوتے بھی محسوس کیا تھا۔ مگر کسی رکاوٹیں کسی میں دیکھی نہیں لی ایک پولیس آفیسر کے پاس ان فالتو باتوں کے لئے وقت ہوتا تھا اب یہ۔ جب تک کاغذ میں رپائی کی گاہیں محاسبہ کرتی ہیں اور جب پولیس انسپکٹر یا توڑے داروں کے احساس نے مومن کو ذیادہ۔ تو وہاں مومن صاحب میرے دل میں ہو کر آئی تھی۔ کوئی بھی گورگدی ہی جی گیا تھا۔ بالکل کلی انداز تھا مگر ابھی تک دیکھی کی طرف دیکھی۔ میں بونٹ پر چکی لڑکی کے کھلے ہونے کو تک نہ دیکھتا تھا۔ بالکل دیکھ کر ہوا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی شاعروں نے جی لکھا ہے بال ہوتے ہی ہیں ناگن جیسے۔ ایک نظر میں ڈس لینے ہیں اس کے بال تو جوانی کے نظر کا موڑ کی طرح خم کھائے ہوئے تھے اور اپنے کھلے سیاہ تھے کہ اس تاریک سحر میں کوئی بھی مسافر اسے جھگ سکتا ہے۔ ہاتھیں سن کی قسمت میں اس کنواری زلفوں کی خوشبو کی گون خوش نصیب ان زلفوں کی چھائیوں میں رات بسر کرے گا۔ کسے زلفوں کی تیج نصیب ہوگی؟ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں ہوں۔ اب واپس رہے تو شاید کوشش کرتے۔

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کتنی ہی ٹھنڈی روٹ لگے۔ "ہئے۔"

"ہئی۔" میں نے با بعد امداد کے انداز میں کہا اور تقریباً دو تار ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس وقت مجھے کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً جیسا ایک پولیس انسپکٹر بچوں جیسی حرکت کرے گا یہ تجویب کی بات تھی مگر دل تو ہوتا ہی ہے عقل کا اندھا خور داغ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

"ذرا ہماری مدد کریں نا۔ ہاتھیں کیا خرابی ہو گئی ہے؟" کھڑکی سے مجھے دالی نے کہا۔

میں بونٹ پر چمک گیا۔ اسی وقت میری گردن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کھڑکی سے چلی کا بھر پور دارو تھا۔ میں تیرا کر گرا تھا اور میرے دھیرے میرے حساسوں کے چہرے گل ہو گئے تھے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ میرے سر پر ہارٹ تھی نہ بیان۔ میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ وہی لڑکی باغ میں تھکتے کاغذ سے کھڑکی کی تہ بیٹھے احساس ہوا کہ ایک جگہ سے مجھ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ چہرے کے ساتھ میرا سیدھی تہ تھا۔ سینے پر پھیلے چھوٹے چھوٹے گھونگھریالے بالوں میں پھنسی پانی کی یونہی سرسائی ہوئی گورگدی پیدا کر رہی تھی۔

میں نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور لڑکھڑا گیا۔ میرے دونوں ہیر کر کے پائینوں سے بندھے تھے۔

"کوشش کرنا فضول ہے؟" لڑکی نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "ہم نے فقط حفظ مقدم کے طور پر تمہارے ہی باغ دے دیے ہیں تاکہ تم کوئی حملہ نہ کر دو۔"

"ایسا کیوں۔ مجھے نہیں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میر میری جان میر ہم نے تمہیں شادی کے لئے لے لیا گیا ہے۔"

”آں اِشادی کے لئے؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”جی ہاں۔ ہم یہ تانا چاہتے ہیں کہ عورتیں کسی سے پیچھے نہیں ہیں وہ ہر کام کر سکتی ہیں جس پر تم مردوں کی اجارہ داری ہے۔“

”یہ تو سراغِ شرعِ مگر دی ہے۔“
 ”اں ہاں بیٹھہ مگر دی تھی لیکن ہم کھل کر تو سامنے آئے ہیں۔ تم مردوں کی طرح شفیعی جہری سے تو ذبح نہیں کرتے۔ اس نے ایک بات کو چاہا کہ کیا۔“

میں نے لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جوش و خروش بات سے لڑکی کا چہرہ تھما اٹھا تھا۔ گورے کھڑے پر جوش کی لالی نے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ پیشانی پر بڑے بلوں نے بھوکوں کو کڑوئی کمان بنادیا تھا۔ تراشیدہ ہونٹ کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ وہ تقریباً چوتھے کے انداز میں بول رہی تھی۔ ”تم مردوں نے الفاظ کے تھے سے عورت کو باندھ رکھا ہے۔ ہر درد میں عورت کی ہتھیار سے شکار ہوئی ہے۔ بیاد کی زنجیر پہنا کر انہیں قیدی بنایا گیا ہے۔ قیدیوں کو کھنڈی بھری پہنائی جاتی ہے کہ میں رس باندھا جاتا ہے۔ انہی چیزوں کو خوبصورت بنا کر کرے بنائے اور چوڑیوں کا نام دیا گیا ہے۔ بیڑی کی جگہ بالکل باندھ کر دیا گیا ہے۔ بھانڈے تو ڈال کر دے کی جگہ کر بیڑی کے زینے پر چوڑیوں کا نام دیا گیا ہے۔ کیا یہ لڑکی کی نشانی نہیں ہیں؟“
 ”یہ سارے زیور تو سہاگ کی نشانی ہیں اور سہاگ بنانے کے لئے عورت کی رضامندی لازمی ہے اسی لئے اسلام نے عورت کی رضامندی لینے کا حکم دیا ہے۔“
 ”عورت نے تم سے پہلے ہی ان تو تم مردوں نے اسے بھی رضامندی کہہ دیا۔ کسی بھی عورت کے دل میں جھاک کر دیکھا ہے کہ وہ راضی ہے یا نہیں! اس کے بھی تو خواب ہوتے ہیں۔“

”مختصر مادیہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔“ میں نے باتوں میں جھسا کر دھکی کرنا چاہی۔
 ”لیکن عورت کی چھوٹی سی غلطی کو شاذ و نادر معاف کیا جاتا ہے۔ اگر بلی غلطی غرض ہو جائے تو فوراً لات مار دی جاتی ہے۔ ذرا سی شکل میں نقص دیکھا اور لاکڑ کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں یہ دق زرد لڑکے کس منہ سے خوبصورت لڑکیوں کی لائیکہ کر رہے ہیں۔ میری بھلی جھیلے کا جرم بھی ہے کہ وہ لڑکیوں کے لئے کوئی رشتہ نہیں سمجھتا۔ اس سے تم شادی کرو گے تم۔ لڑکی کے لیے میرے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ تمہاری زندگی تمہاری اس شہرت کی طرح کالی بنا دے گی“ لڑکی نے میری شہرت کو اٹھا کر دکھایا۔ ”یہ تو تمہیں ڈکی میں ٹھونسنے کی وجہ سے کالی ہوئی ہے کہ تمہاری زندگی میرے ہاتھوں کالی ہو جائے گی۔“

لڑکی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار ہے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے اس بالکل لڑکی کے چنگل سے آزادی حاصل کروں۔ بھی دروازے کا پتہ کھلا اور ایک سالوئی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اکبر سے دن کی اس لڑکی کے لباس کو دیکھ کر میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے جلی میں کار کے اندر پیچھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی سدرت تھی۔ فٹ بال کی طرح لڑھکی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ اور اندر آئے ہی خسار کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

”ارے جیلز زبانی تو بلیانا۔“ گلاسٹونگ لگے تھے۔
 ”موٹی جیجے کھانے پینے کے علاوہ کچھ آتا ہے؟“ اسی لڑکی نے طنز کیا۔

”تو چپ رہ آصف کی بیٹی؟“ موٹی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”خدا کے لئے آصف اب کچھ نہ کہتا رہ نہ خود خواہ یہ کہ اس میدان جنگ بن جائے گا۔“ ہیلہ نے مجھ سے سوال جواب کرنے والی لڑکی سے کہا۔

”تم جس کام کے لئے کئی قیص وہ کہہ کر آئیں؟ مولوی کو لائی ہو؟“ آصف نے جیلہ سے پوچھا۔
 ”نہیں۔“
 ”کیوں؟“

”کیوں کہ بے جاہ مظلوم ہے؟“ اس نے میری جانب اشارہ کیا۔
 اس کی بات پر میں چونک گیا اور جیلہ کے چہرے کو سوالیہ انداز میں گھورنے لگا۔
 ”مگر یہ مظلوم نہیں ہوئے۔“ آصف غرائی۔

”مگر یہ مظلوم ہے۔“ ہیلہ بولی۔ ”تم بھی اس مظلوم کی اس خوبی سے آگاہ ہو کہ وہ ہر کسی کے پیٹ کی بات معلوم کر لیتی ہے۔ مصلوب ہے۔“ مصلوب جب ہم اس کے کھلے میں معلومات حاصل کرنے پہنچے تو پتا چلا کہ یہ شفاعت کا پتا نہیں ہے۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ یہ اطلاع میرے لئے بالکل نئی تھی۔ بچپن سے جسے میں اپنا پاپ کہتا آیا تھا۔ جس کی کو دیکھ کر دیکھ کر ہوتے میرا بچپن گزرا۔ جس نے اپنے خون پیسنے کی کمانی سے مجھے افسر بنادیا وہ میرا پاپ نہیں ہے۔ یہ اطلاع بالکل عجیب سی تھی۔

”اس کا پاپ کون ہے؟“ آصف نے پوچھا۔
 ”نہ کہہ سکتا اس کے پاپ کا نام نہ دے۔ اور وہ ہر کی میں رہتا ہے۔ دس سال سے وہ ہیں۔“
 ”اور ماں؟ کیا وہ عورت جو شفاعت کے ساتھ رہتی تھی وہ بھی اس کی ماں نہیں ہے؟“

”ہاں! ارا تھیل کی ماں کو کہہ دیں۔“
 ”بات سے نہیں پڑی۔“ آصف نے کہا۔
 ”مصدقہ نے ایک ایک جو مصلوب جمع کی ہیں اس کے مطابق ارا تھیل کی ماں کا نام نوران ہے۔ وہ لاہور کے موچی دروازے کے رہنے والی ہے۔ شفاعت کی بیوی بھی اسی جھلی ہے۔ دونوں میں بڑی دو تھی شادی کے بعد دونوں سہیلیاں بچھڑ گئیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملتان چلی گئی۔ اسی دوران میں نوران کا نکاح بھی ہو گیا۔ عمر عمرانی لڑکے سے اسے منسوب کیا گیا تھا۔ عمر کراچی میں رہتا تھا۔ نوکر پیشہ تھا۔ سال میں دو تین بار ہی آتا تھا۔ ایک بار وہ لاہور آیا تو اسے سسر سے ملے ان کے ان کے گھر بھی پہنچا مگر وہ گھر میں نہیں تھے۔ اور نوران اکیلی گئی۔ اکیلے گھر اور جنابی کا عمر نے فائدہ اٹھا چاہا۔ نوران نے شوہر کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ اس کے حیر بھاری ہو گئے تھے۔ یہ بیچر جب نوران کے سسرال پہنچی تو ان لوگوں نے آسمان سر ہاٹھا لیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ نوران بد کردار ہے۔ کسی اور کا گناہ مگر کے مصلوب رہی ہے۔ عمر باپ کے غصے کو جانتا تھا۔ اس نے باپ کے حکم پر نوران کو طلاق بیچ دی۔ دقت کالی گزر چکا تھا۔

ڈاکٹر کوں نے بہت اصرار کے باوجود خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً وہ اس مصلوب کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن پریشان بھی تھی۔ بچے کا کیا ہوگا؟ اس خیال سے نوران ہر دقت رونی رونی۔ اسی دوران میں

شفاقت کی بیوی کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کبھی ہاں نہیں بن سکے گی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس بچے کو کوئلے لیا۔ رات بیل یوں دیکھ رہے تھے۔
میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی کہانی سے میں خود ہی بے خبر تھا۔ جسے انتہا سب کچھ کیسے بیٹھا تھا وہ میرے کچھ بھی نہ تھے۔ ابھی خیالات کے گرد اب چکر ہی دے رہے تھے کہ مضمون کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ جیل سے مخاطب تھی۔ ”اگر یہ مظلوم ہے تو اس کی مدد فرمیں یہ فوراً مولوی کو بلاؤ۔“

”کیوں؟“ جیل سے پوچھا۔
”تم سے نکاح پڑھا یا جائے تاکہ تم اس کے زخم پر پھیا کر رکھ سکو۔“
”اے ہرے ہرے زور خوب بہرہ دے جا رہی ہو۔ ایسے لڑکے کو بے چارہ جیل کے گلے منڈر ہی ہو جس کے باپ کا ہی پائیل نہیں ہے۔“ صادق نے ہاتھ نہ خا کر کہا۔

”تو جب رہ مولیٰ کیا نازار چھپانے کے لئے جیل کے آگے کبھی نہیں اٹھائے گا۔“
”متعلق کی دم تو خود کر لے“ مجھے ہی ایسا شوہر مبارک۔“
دونوں عورت تھیں۔ ان کی جلیٹ عود آتی تھی۔ ساری ڈگریاں دھری رہ گئی تھیں۔ مردانہ پن کے دھجے ہوا ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نیچا کمانے کے لئے وہ بھجڑوں کی طرح لڑے جا رہی تھیں۔

”خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔“ جیل سے کہا۔
”اسے خاموش کر۔ اس مولیٰ کو چپ کر۔“ آصف کرچی۔
”خدا کے لئے صادق چپ ہو جاؤ۔“ جیل سے ہاتھ جوڑ دیئے۔
”ٹھیک ہے میں چپ ہو جاتی ہوں مگر اسے شادی کرنی ہوگی۔“
”ہاں ہاں میں شادی کروں گی۔“ بلاؤ مولوی کو۔“ آصف کرچی۔
”میں اچھی لے کر آتی ہوں۔ گردن سے پکڑ کر لاؤں گی۔“ صادق جھکے سے کھڑی ہوئی۔
”تم کو رہنا جیل اگر اس نے نہ کیا تو اس کی گردن تو دوں گی۔“ بکتے جھکتے صادق ہاں نکل گئی۔
وہ کچھ بہرہ دہر لیتی تو اس کے ساتھ ایک مولانا تھے۔ سیاہ روائی ڈو پٹی ٹوٹی، بغل میں رجسٹر، ہونٹ پاکی ان کی سے سرخ، اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئے۔ انھوں نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور پھر راتیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”اے میاں! کیوں کی شرافت ہے لڑکیوں کے سامنے صفائی پٹھے ہو۔“

”اے بڑھے یہ کیا کہیں جاسے گری نگہ دہی جاسے لے شرف اتا رہی۔“ صادق نے کہا۔
”کیا کری سر پر کسی چڑھ گئی ہے جو اس کے پیچہ بندے ہیں۔“ مولانا نے طنز کیا۔
”اے مولانا زیادہ ماتیں نہیں، نکاح شروع کرو۔“ آصف نے جھڑکا۔
”اے کہے پڑھا دو؟ آں۔ نکاح ہے کیوں کیل نہیں۔ گواہ لاؤ، دھن دو لے کولاؤ۔“ مولانا بولے۔
”گواہ یہ دونوں ہیں۔“ آصف نے جیل اور صادق کی جانب اشارہ کیا۔
”آں یہ گواہ ہیں؟ اے رہے دونوں عورتیں گواہی آدمی ہوتی ہے۔ سرد گواہ لاؤ۔“
”صادق! دو بندے پکڑ لا۔“ آصف نے حکم دیا۔

”نونا مولانا گواہ لے آئی۔“ صادق نے ایک کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”گواہ لیکن جیل سے پھر مزدوری کے لئے لائی ہیں۔“ ایک نے کھڑکے میں کہا۔
”گواہی تو تیرا مال ہی ہے۔“ صادق نے اس کی پیٹ پر چھل جھلیا۔ اس وقت پتہ نہیں چل رہا تھا کہ

یہی وہ مولیٰ ہے جو گوشت کا پہاڑ بن کر سرت پڑی رہتی تھی۔ اس وقت اس کی بھرتی دینی تھی۔ سخی خواہن کا زہن ان کے بکڑے تھور اور مولانا کے چہرے پر اڑی ہوا نکالنا کہ دونوں مزدوروں کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے جھنجھار ڈال دیا۔
مولانا نے خطبہ پڑھا اور نکاح ہو گیا۔ اس پورے ڈرامے میں میرا کردار بات کار ہا۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تیسری بار پوچھنے پر میں نے ”قبول ہے۔“ کہا تھا۔
نکاح کے فوراً بعد گواہ ان اور مولانا کو بیٹھے دے کر بھاگ دیا گیا۔
”اے تمہیں قیسم دھن ہو شو میرے ہاں میں کرنا۔“ صادق نے چھیڑا۔
”سنو مسٹر راتیل اب تم میرے شوہر ہو، میرے مجازی خدا مگر صرف نام کے۔ میرے مزاج کے نکلا کچھ بھی نہیں کر دو گے۔ مجھ سے پوچھتے بغیر ڈیوٹی نہیں بھیج جاؤ گے۔ جب تک میری مرضی نہ ہو میرے قریب ہی نہ آؤ گے۔ اہم بات چاہتے ہو۔“

”نونا مولانا گواہ لے آئی۔“ صادق نے ایک کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”گواہ لیکن جیل سے پھر مزدوری کے لئے لائی ہیں۔“ ایک نے کھڑکے میں کہا۔
”گواہی تو تیرا مال ہی ہے۔“ صادق نے اس کی پیٹ پر چھل جھلیا۔ اس وقت پتہ نہیں چل رہا تھا کہ

یہی وہ مولیٰ ہے جو گوشت کا پہاڑ بن کر سرت پڑی رہتی تھی۔ اس وقت اس کی بھرتی دینی تھی۔ سخی خواہن کا زہن ان کے بکڑے تھور اور مولانا کے چہرے پر اڑی ہوا نکالنا کہ دونوں مزدوروں کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے جھنجھار ڈال دیا۔
مولانا نے خطبہ پڑھا اور نکاح ہو گیا۔ اس پورے ڈرامے میں میرا کردار بات کار ہا۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تیسری بار پوچھنے پر میں نے ”قبول ہے۔“ کہا تھا۔
نکاح کے فوراً بعد گواہ ان اور مولانا کو بیٹھے دے کر بھاگ دیا گیا۔
”اے تمہیں قیسم دھن ہو شو میرے ہاں میں کرنا۔“ صادق نے چھیڑا۔
”سنو مسٹر راتیل اب تم میرے شوہر ہو، میرے مجازی خدا مگر صرف نام کے۔ میرے مزاج کے نکلا کچھ بھی نہیں کر دو گے۔ مجھ سے پوچھتے بغیر ڈیوٹی نہیں بھیج جاؤ گے۔ جب تک میری مرضی نہ ہو میرے قریب ہی نہ آؤ گے۔ اہم بات چاہتے ہو۔“

آزادی کی لوی دیکھی میرے حواسوں کو لوٹا نہ سکی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری کہانی اتنی پروردہ ہوگی میں ساحر سرے کے لئے گالی ہوں۔

”مسٹر رائٹ! آپ کو شاید میری باتوں سے دکھ پہنچا ہے۔“ گیارے میں روک کر صادق نے کہا۔

”اے!“ میں نے چونک کر کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

”کیسے فگر ہیں۔ میں سوچا ابھی بھی وہ ہو گیا۔ میں آصف کے عہد کو توڑنا چاہتی تھی۔ سو توڑ دیا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی مگر میں نے اسے مجبور کر دیا۔ میں نے جیل کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب رہا۔ ابھی ہم نے آپ کے منتقلی جو کہانی سنائی تھی وہ صد فیصد جھوٹ تھی۔ صرف آصف کو کسانے کے لئے سنائی گئی۔ آپ شفاعت صاحب سے بیٹے ہیں۔“

”کیا؟“ آصف اچھل پڑی۔

”ہاں وہ کہانی جھوٹی تھی۔۔۔۔۔۔ صرف تجھے بھولانے کے لئے لکھی تھی تاکہ تو جوش میں آجائے۔“

میرے چہرے پر شادیانی لوث آئی۔ ”اچھا۔۔۔۔۔۔ میں تو یہی طرح ڈٹ چکا تھا“ کون مراد کی گالی سے گام۔

”ہاں ہاں یہ گالی بھی تو عورت کے لئے منسوب ہے۔ فعل بد خود کریں سخت کریں شیطان پر۔“ آصف ہنسا اٹھی۔

”تمہاری یہی بات غلط ہے۔ ہر معاملہ کو تم عورت کی مظلومی کے چشمے سے دیکھتی ہو۔“ جیل نے سمجھا نا چاہا۔

”اور کیا؟ سارا ہی قصور مردوں کا ہوتا ہے عورت مظلوم ہے اس لئے اس پر الزام دھر دیتے ہیں۔ دیکھ لینا میں اسے کس طرح غلط ثابت کرتی ہوں۔ رائٹ کی زندگی بھر ان کا ردی تو کہتا۔“

”بی بی! تم بھول رہی ہو مرد جب چاہے عورت کو طلاق دے دے۔“

”ہاں ہاں اس کے علاوہ اور کئی کیا سکتے ہو جب دل بھر جائے طلاق دے دو۔ غلطی کا احساس ہو جائے تو بلا کو مگر حال کر اور حال عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے۔“

”حالا اس لئے کرانے کا حکم ہے کہ ان کی ہر مرد پشیمان رہے کہ اس کی بیوی کچھ دلوں کے لئے کسی دوسرے کی بھی ہو گئی۔“ میں نے سمجھا نا چاہا۔

”میرا داغ مت چاؤ۔ اب جاؤ جب میرا دل ہوگا جالوں گی۔“ آصف نے جھڑکا۔

جیلہ اور صادق نے آصف کی تائید کی۔ مجبوراً میں باہر نکل آیا۔ نکلے کے بعد باہر رک کر اس مکان کو بخیر و دیکھا تھا۔ اس مکان کا وہی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا کہ ان نفسانی مریضوں کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ ان کے خود پسندی کے خول کو کیسے توڑ دوں کیونکہ آصف کھینچے پھلے دیوہ ایک میل ہو کر میرے لئے احکا مہر تھا تھا باضابطہ نکل چکا تھا۔ وہ میری بیوی بن چکی تھی۔ اسے راہ راست پر لا نا میرا فرض تھا۔

میں ایک ہفتے سے آصف کو تلاش کر رہا تھا۔ اس مکان پر بھی کیا تھا جہاں مجھے لے جایا گیا تھا مگر وہ مکان خالی ملا تھا۔ لڑکیوں نے اسے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ایک انٹرنیٹ انجنیئر والے نے مکان دلویا تھا سی لئے مکان مالک بھی لڑکیوں کا پتا نہ بتا سکا۔

اس دن بھی میں تھانے میں بیٹھا آصف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کون کی کھینچ رہی تھی۔

”ہیلو!“ میں نے ریسپونڈر اٹھا رکھا۔

”میں لک گیا۔ جلدی آؤ پورے بارہ لاکھ لوٹ لئے۔“ دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”میں ابراہیم شاہ ہوں بھئی ابراہیم شاہ۔ جس اینڈ جیلری کا مالک۔“ وہ بے ربط انداز میں بولا۔

”آپ کلر ڈکریں میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے جس اینڈ جیلری کی نامی دیکھی تھی۔ کافی بڑی

دکان تھی۔ بڑی رات کی ان گنی جتنی دکانوں میں سے ایک تھی جس کے زیورات غیر ممالک میں بھی پسند کئے جاتے تھے۔ جڑاؤ زیورات بنانے میں اس کا کافی ہتھ پھیلے بیڑوں اخباروں میں پڑھا تھا کہ عرب کے ایک

ٹخنے نے پچیس لاکھ روپے کی منتقلی کر سی بنوائی تھی۔ ایسی تجو بہ روزگار کر سی تھی کہ لوگوں نے دانتوں تلے اٹھیاں دہائی تھیں۔

اس مشہور دکان میں پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی اٹھلی جنس کے کیڑے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے زمین پر دس

لو کے ٹیپے تھے۔ لڑکوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے ہٹائے جانے سے میں نے اندازہ لگایا

کہ یقیناً اٹھلی جنس دالے محرم پر ہی ہاتھ ڈالنے ہیں خاص کر خطرناک بھرموں پر۔ یہ بھی خطرناک ہوں گے۔

میں نے خطرناک کئے دیکھے تھے۔ جب تک وہ آزار دہنے ہیں خطرہ ہی خطرہ رہتا ہے مگر گلے میں چاڑھ

ہی ایسے خاموش ہو جاتے ہیں کو یا ازل کے شریف ہوں۔ لڑکوں کے چہرے بھی مصیبت کا پرتو تھے مگر مجھے ان پر رحم نہ آیا۔ میں نے سیدھے پوچھا۔ ”کیا بات کی؟“

”ان لوگوں نے ہمارے نام پر انٹرنس جھڑک دیا ہے۔“ اٹھلی جنس کے انصر نے کہا۔

میں نے مڑ کر لڑکوں کی جانب دیکھا پھر ابراہیم شاہ سے بولا۔ ”آپ داغ تھائیے۔“

ابراہیم شاہ نے تانا شروع کیا۔ ”آج صبح جب میں مکان پر پہنچا تو یہ لڑکے آئے۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں

بھی تھیں۔ ایک تو بہت خوبصورت تھی۔ گوری رنگت اور اونچا پورا قد۔ کھنکے بال سفید شلوار قمیض پہنتی تھی اور بالوں میں

کلپ لگائے ہوئے تھی۔“

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”میاں تم جا رہو یاور ذی جو تو رتوں کو بخیر دیکھ کر پورا پورا پاپ لیتے ہو۔“

ابراہیم شاہ بولے جا رہا تھا۔ ”اور دوسری لڑکی اکبر سے بدن کی تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں

تھیں۔ اس نے شلوار قمیض پہن کر تھی کہ کپڑوں کا رنگ گلابی تھا۔ اس نے ہائی بل کی سیڈل پہن کر تھی۔ اور

تیسری لڑکی ہماری بدن کی تھی۔ بہت بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے منہ میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو۔ بڑی

پاٹ دار آواز تھی۔“

میں چونک گیا اور جلدی سے بولا۔ ”کیسا اس کی ناک پر چھوٹا سا ساقا تھا؟“

”جی ہاں ساقا۔“ ابراہیم شاہ نے جواب دیا۔

”آپ آج پہچانتے ہیں؟“ اٹلی جنس افسر نے پوچھا۔

میرا دل کانپ اٹھا۔ اٹلی جنس والے جس کے پیچھے چڑھا میں اسے پال سے بھی پہچانتے ہیں۔ یقیناً یہ آصف صادق اور ریل گاڑیوں کے کھنڈے کوئی گہرا معاملہ ہے جیسا کہ میں نے کہا۔

”جی ہاں! ایک روز وہاں سرک پر تین لڑکیاں ایک لوجوان لڑکے کو لٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میری دماغت کے بعد وہ فرار ہو گئیں۔ مجھے ان پر شک ہوا تھا۔ مجھے ان کا حلیہ بھی ایسا ہی تھا۔ ہمیں مطلوب ہیں۔“ پھر میں نے ابراہیم شاد سے پوچھا۔ ”ان لڑکیوں نے کیا کیا تھا؟“

”جنتا سب آئے۔ پہلے لڑکی نے اپنا کارڈ دکھایا پھر انھوں نے کارڈ کو کرک میں چبک کیا۔ اٹلی جنس کا کارڈ تھا۔ ایک لڑکی نے کہا ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر ہیرے منگوا رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا تھا آپ خود چیک کر لیں۔ سارے ہیرے نکال بیٹے ہیں۔ ان لوگوں نے فائلوں کی چیکنگ شروع کر دی۔ اس خوبصورت لڑکی نے تجوری کھلائی۔ اندر سے ہیروں کی پوتی نکلائی اور اسے دیکھتے ہوئے بولی، ان کا گذشتہ؟..... میں نے کاغذات دکھائے تو وہی دن پر مجھے شبہ سے آگے چک کرنا ہوگا۔ میں نے کہا چیک کر لیں اور ان دیکھیں مگر وہ مانی کہنے لگی ہمارے ایسپرٹ جڑ کریں گے اسے پوتی کو دکھاتے دیکھ کر میں نے دکان سے باہر لے جانے سے منہ کھینچ دیا۔ میں نے پھر اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے رسید بنادی اور بولی ہمارے آدمی فائل دیکھ رہے ہیں ہم ابھی آج جاؤں گے اور چلنی کی صاحب بی بارہ لاکھ کے ہیرے لے گئی۔“ ابراہیم شاد رو نہ لگا۔

”ان لڑکیوں نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سب بدعاش ہیں۔“ جوش میں اس نے ایک لڑکے پر پھڑپھڑایا۔

”آرام سے آرام سے“ اٹلی جنس افسر نے روکا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان لڑکیوں نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ کچھ دنوں پہلے انھوں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا کہ ملک دو کم خدمت کے لئے جب وہیں سے سرشار لو جوان کی ضرورت ہے، انھیں جب خرچ بھی لگا دے۔ یہ لڑکے بے کاری میں وقت گزار رہے تھے اشتہار پڑھ کر پہنچے۔“ انھیں لڑکیوں نے بتایا کہ ان کا اٹلی جنس سے ہے اور وہ اوپر والے سے حکم سے ایک گارڈ بن رہی ہیں۔ اس جانناز گروپ میں سے افسروں کا تقرر ہوگا۔ ایسے خفیہ کام کے لئے کھلا اشتہار دینا نہیں جاسکتا اس لئے بند الفاظ کا اشتہار دیا گیا ہے اگر آپ نے حکومت کو مطمئن کر دیا تو آپ کی تنخواہ تیس ہزار روپے ملانہ ہوگی۔ لڑکے خوش ہو گئے۔ انھوں نے کھ میں بھی کچھ دے بتایا کیوں کہ رازداری شرط تھی۔ تمام ہارڈویک کے نام پر کچھ دنوں ان سے اچھل کو کر دیا اور آرمیڈ یا ڈاکا ڈالنے پہنچ گئے۔“

میں نے دل ہی دل میں افسد کی عقل کو داد دی۔ کتنی آسانی سے اس نے بارہ لاکھ کے ہیرے اٹھا لئے لیکن میں نے بھی عہد کر لیا کہ آصف کو ہیرے سہم کرنے دندوں گا۔ اگر وہ پاتال میں بھی مچھی ہوگی تو میں اسے باہر نکالوں گا کیوں کہ میں نے یہی سوچ رہا تھا۔

”آپ انھیں لے جائیں لیکن ہمیں بھی کچھ سوالات کرنے ہیں اس لیے ہم انھیں واپس لے لیں گے۔“ اٹلی جنس افسر کے کہنے پر ہیرے خیالات ٹھہر گئے۔

”جی ہاں ہے۔“ میں نے انھیں لے کر تھانے آگیا۔

تھانے پہنچنے کے بعد میرے دماغ پر آصف سوار تھی۔ میں اسے گرفتار کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کمال کا نام میرے ذہن میں نکلیا۔

کمال متاوی روزانے میں کراچی پر پورٹ تھا اس کے ذریعے میں نے کئی خبروں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا تھا۔ اس بار بھی میں نے اس کے ساتھ لڑکیاں ڈارڈا جانے کا سوچا اور اسے سن کر نہ لگا کہ کمال کو کیا توں کا شہر تھا فوراً ہی تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اسے منصوبہ سمجھا کر ویدہ لے لیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس خبر کو صحابہ لے۔

اسی دن میری ٹیلی ہوئی۔ افسران بالانے مجھے جوں کھنے کا وقت دیا کہ ان لڑکیوں کو گرفتار کر کے لے آؤں۔ میں نے اپنے منصوبے سے انھیں آگاہ کر دیا۔ منصوبہ اتنا جامع تھا کہ افسران بالانے بھی پہلی منصوبے کی توثیق کر دی۔

اگلے دن کے اخبار میں جرحی۔ ”جس اینڈ جوری میں لگے ہوئے خود کار کمرے نے دھوکے باز حسیناؤں کی تصویر اتار لی ہے۔ وہ تصویر اس وقت انکپلر رائل کے پاس ہے مگر انھوں نے ابھی تک کسی کو دکھائی نہیں ہے۔ اپنے افسران کو اس کی ہوا لگتے نہیں دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجرموں کو بھانا چاہتے ہیں۔“

میں جانتا تھا کہ ریجر آصف کی عقل کو مات دے دی کہ اسی لئے میں تھانے میں بھی گیا تھا۔ اپنے بچنے کے ہر آدمے میں بیٹھا تھا کہ آصف مجرم ہے۔ اور مجرم کو مات دے دی کہ اسی لئے میں تھانے میں بھی گیا تھا۔ اپنے بچنے کے ہر آدمے کو میرے گھر آئے گی۔ اس وقت میں اسی کا انتظار کر رہا تھا کہ میری نظر سرک کے کنارے کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ وہ میرے بچنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ خشک سالا کہ بولن ہے کیا آصف کا بندہ ہے؟ ابھی میں اسے جی سوجھا

ڈاکٹر عقیلہ نسیم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

مٹی کا سفر

شانع ہو گیا ہے

ایک ایسی مصنفہ جو میا بھی ہے اور تخلیق کار بھی.....

دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی مٹی کی

سونہی سوندھی خوشبو سے آباد

افسانے جوانی پر مثال آپ ہیں۔

کتاب ملنے کا پتہ

مثال پبلشرز

وریم سنٹر۔ پریس مارکٹ۔ امین پور بازار۔ فیصل آباد

(Contact No. 0300-6668284)

رہا تھا، کرفوں کا ہر چنچ اٹھا۔ میں نے اٹھ کرفوں دیکھ لیا۔ دوسری جانب سے کمال کی جانی پہچانی آواز آئی۔ ”تصور تمہارے پاس ہے؟“

”جی ہاں ہو تو دکھا دوں؟“

”میں نے ایڈمیرل ایڈ میر کی کتاب ہمارے کمرے میں رکھ دی۔“

”مجھے اسے سمجھاؤ کہ اس فرانس بالائی فٹاشین ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ عوام کو دھوکا دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اخبار سچی خبروں کے لئے ہوتا ہے۔“

”اسے ایک روز سنبا لیں۔“ میں نے فوراً ان کاٹ دی۔ اسی مڑی ہوا عمارت کے بڑے پھر چنچا۔ میں نے جھٹکے سے ریسورٹ اٹھا کر کہا۔ ”اب کیا ہے؟“

”تصور تمہارے پاس ہے؟“ میری مطلوبہ آواز آئی۔

”کیسے تو دکھا دوں۔“ میں نے کہا۔

”ہم آ رہے ہیں بیٹے پر ہی رہتا۔“

”مجھے یہ بھی خوب دہی۔ دھن خود چل کر دھماکے گھر آئے۔“

”بکواس نہیں۔“ دوسری جانب سے سلسلہ قطع ہو گیا۔

میں پھر کراہی کراہی کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر بعد ایک کارٹر گنٹ پر دی کہ میں نے جا کر گیت کھول دیا۔ کار اندر داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر گنٹ کی۔ پہلے آصف قاتری پھر جیل اور صادق۔

”آئیے اندر چل کر بیٹھیں۔“

”آصف بولی۔“ وقت نہیں ہے۔

”دن آتے تو دھماکے گھر آتے۔“ یہ عجیب بات ہے۔ میں نے معنوی بیار میرے لہجے میں کہا۔

”ملاقات نہیں۔“ آصف نے تھڑکا۔

”ملاقات کو تو سخت کر رہا ہے۔ ہم تو جیون ساتھی ہیں۔ جنم کا رشتہ ہے۔ تم چور ہو میں سپاہی۔ تم قانون شکن ہو اور میں قانون کا محافظ۔ اسی لئے تو مولانا نے ہم دونوں کو ایک دھڑ میں باندھا ہے۔“

”چیل چیل ماروں گی۔“ آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچھل پڑی اگر میں اسے سنبا لیں نہ لیتا تو گھر دو

پڑتی۔ پستول کے دھماکے نے اسے بھولوا دیا تھا۔

”سنو مشنر اپیل میرے آدمیوں نے اس بیٹے کو گھیر لیا ہے فوراً ان لڑکیوں کو میرے حوالے کر دو۔“ پستول

تھا ہے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

”کیوں بھائی۔ میری تو بوی ہے تمہاری کون ہے؟“ میں نے کمال اطمینان سے کہا۔

اس شخص نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار بھی نشانہ ہمارے سر پر لٹکا ہوا فالتو تھا۔

”میرے بھائی خواہ مخواہ کیوں میرے قیمتی فالوں کے دشمن ہو گئے ہو۔ تمہیں دھماکے کی آواز پر کوئی آنہ

جائے۔“

”مڑک کے دونوں سرے پر میرے آدی تعینات ہیں۔ ہر پانچویں سو سال تو جناب یہاں کوئی کسی کے

پھندے میں نہیں پڑتا۔“ آخرت بھائی چارے کا زمانہ کب لگ گیا۔

”ایسی بات ہے تو یہ لو۔“ کہتے ہوئے میں نے کمال پھرتی سے آصف کو کمرے میں دھکا دیا اور خود کو گراتے ہوئے لوٹ لگا جلا گیا۔ ”میں گرتے دیکھ کر آصف اور جیل نے بھی ہلڑ کے آڑی کی۔ پستول ہلاتا ہوا وہ شخص برآمدے کی جانب دوڑا تھا کہ میں نے سٹی بھادی لان کی جھاڑیوں کے پیچھے سے پولیس والے نکل آئے۔“

”خبردار پستول پینک دو دروازے کو لی مار دیں گے۔“ ایک پانی نے لگا مارا۔ اس شخص نے گھبرا کر پیچھے دیکھا

اور اس پر سختہ سا چڑھا گیا۔ آٹھ ٹائیں اس کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

”اسے بھڑائی لگا کر اندر لاؤ۔“ میں نے ایک پانی سے کہا۔

”میں..... ہم چارے ہیں۔“ آصف نے کہا۔

”میری جان! تم کہاں تھیں؟ جیسا ہوں کہ تعیناتی تمہارے لیے تو تھی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پھر پڑ بولنے والی صادق نے مجھے یوں دیکھا کہ باس رکش کرنا جتنی ہو سکتی تھی۔ جیل بھی خاموش تھی۔

”چلو۔“ میں نے اسے اندر دھکیلا۔ جیل اور صادق بھی ساتھ آگئے۔ میں نے فریج سے مٹھائی نکالی۔ ان

کے سامنے رکھی اور بولا۔ ”مہلت من بھٹا کر دتا کہ میں ایک کڑی خبر سناؤں۔“ تینوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کھاؤ؟“ میں دوڑا۔ ”اس دن تم حکم چلا رہے تھے آج میرا حکم مانو۔“

تینوں کا ہاتھ پکڑنے لگے۔ مٹھائی ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔ ”میری بیگم جان! اب بھڑائی بکنی لو۔“ پھر میں

نے سرعت سے پستول نکال لیا اور دروازے پر کھڑا۔ ”کل خان انھیں گرفتار کرلو۔“

دروازے پر کھڑے پولیس والوں نے اندر داخل ہو کر لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھڑائی لگا دی۔

تھانے کے ایک لاک میں وہ شخص بند تھا جس نے مجھ پر فائر کے قبا جگہ تینوں لڑکیاں ایک دوسرے

کمرے میں کھینچی تھیں ان لڑکیوں کو کھینچنے کی افران آگئے تھے۔ یہ معمولی لڑکیاں ایسا مصوم چہرہ اور رکوت

ایسے قابل غفلت! انھیں سب ہی ملاعت سے دیکھتے تھے۔ کئی افسروں نے لڑکیوں سے بیہوش کے بارے میں

پوچھا اس دوسرے قیدی کے بارے میں پوچھا لیکن انھوں نے اس بات سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس شخص کے

بارے میں تو خود مجھے بھی جس تھا کہ وہ کون ہے اور انھیں ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہی سوال اس

شخص سے بھی کیا تھا لیکن اس نے تو خاموش رہنے کی قسم کھائی تھی۔

اس وقت بھی میں اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا کہ تم کس لئے لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ تبھی اہلیاں

بٹنے کی آواز سنائی دی۔ سلوٹ کی آواز سننے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ آئی جی سلطان خان کے ساتھ ایک بھاری

بدن کا شخص تھا، وہ دونوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بھی سلوٹ کیا۔ وہ جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کیسا کتنا تیز لڑکیاں ہیں؟“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ساتھ والا شخص بڑی دھمکی سے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر بیٹھ لیا۔ دوسری جانب سے بولنے والے کا نام سننے

ہی اچھل پڑا۔ ”کیا..... تم..... شیر خان؟“

شیر خان کا نام سننے ہی آئی جی بھی چونک گئے۔ شیر خان ایک ایسا نام تھا جس سے پورے ملک کی پولیس

واقف تھی۔ وہ فضیلت کی دنیا کا تاج بادشاہ تھا۔

شیر خان پورے ملک کی پولیس کو طلب تھا۔ آئی جی نے ہاتھ بڑھا کر ریسورٹ تمام لیا اور بولے۔ ”کون ہو تم؟“

”میں شیر خان بول رہا ہوں۔ چودھری کو رہا کر دو۔“

”تم جیوئے ہو۔ شیر خان کا نام لے کر مجھے تم کا سیاق نہیں ہو سکتے۔“

”اگر تم نہیں چھوڑو گے تو ہم خود با کر اس کی۔ ابھی ایک نوجوان لڑکی آئے گی۔ وہ آکر اسے چھڑا لے جائے گی۔“

”دوسرے جانب سے رہے دیور کھدیا گیا۔“

”لکنا ہے کسی نے مذاق کیا ہے۔“ کہتے ہوئے انہی جی صاحب باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے اپنے دوست سے کہہ گئے تھے کہ وہ بیٹھے راؤ ٹنگا کر اسے لیتے جا جس کے۔ ہم بھی اس نون کال کو غنائی سمجھ رہے تھے کہ وہ لڑکی پہنچ گئی۔ وہ انہی جی صاحب کے ساتھ آنے والے شخص کی بیٹی گھنٹہ کی اس نے آتے ہی کہا۔ ”ڈیڈی چودھری کو چھوڑ دیجئے۔“

”تم ہوں تو ہو؟“

”جی ہاں! میں بدوش دواں کہہ رہی ہوں چودھری کو چھوڑ دیجئے۔ درندہ نہیں ہیجروٹ مار کر بلب توڑ دوں گی۔“

پانچس کیوں اس سے نکل بات کا کھرا اثر ہوا۔ انہی جی صاحب کے دوست کا چہرہ تارک ہو گیا۔ انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”اے ستوہوڑو۔“

انہی جی صاحب کے دوست کا حکم اسے ماننے کی کسی میں ہمت تھی پھر بھی قانون روک رہا تھا۔ ہمیں پس و پیش کرنا دیکھ کر انہی جی کے دوست نے ہتھول نکال لیا۔ ہم تیار نہ تھے اس نے چودھری کو گواہ کر لیا۔ چودھری کو گھنٹہ اپنے ساتھ لے گئی۔

ایک مجرم کی مدد کرنا جرم ہے۔ مجرم کتنا ہی بڑا فریو نہ ہو۔ قانون اسے معاف نہیں کرتا۔ انہی جی صاحب کے دوست عثمان نے مقدمہ قائم ہو گیا اور وہ گرفتار ہو گئے۔ اس میں شاہ پور چاکر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر

وہاں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے جیل جانے سے چھ پرکونی اثر نہیں ہوا۔ میں اپنی نچر شادیاں تھا۔ مجھے جو

کامیابی ملی کہ وہ معمولی دیکھی۔ اس کی بڑی واردات کے فرسوں کو گرفتار کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اخبارات نے پہلے صفحے پر تقریباً لکھی تھیں، مجھے ایک ڈین پولیس لکھا تھا کہ میں اپنے ذہن کی کچھ باتیں لکھنا نہیں پایا تھا۔

میرے سامنے عثمان صاحب کا ضل سوالیہ نشان بٹھا ہوا تھا۔ یہ بات صحیح تھی کہ وہ انہی جی کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بات پر قانون کھلی کر بیٹھے یہ بات سمجھ سے پرے تھی۔ پھر گھنٹہ کی بات بھل

تھی۔ وہ ایک فضول سا جملہ تھا کہ بلب توڑ دوں گی اس جملے میں اس کی کون سی بات تھی۔ جس نے اس میں اتنا بڑا اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس راؤ کو سمجھنے کے لئے میں ایک دن جیل پہنچ گیا۔ وہ بلی کلاس کے قیدی تھے۔ انھیں تمام

آسائشیں مہیا تھیں۔ ان سے ملاقات نہ کرنے کے لئے جیلر نے انک کے کال انعام کر دیا۔ میں نے ہوسلاوا کیا۔

”وننگ! آپ میرے افسر کے دوست ہیں۔“ میں کچھ دیر کے لیے رکھا دوسرا سس لے کر بولا۔ ”اس کی کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا بڑا اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ گھنٹہ کے جیلے میں اس کی کون سی بات پوشیدہ تھی جس نے آپ کو ملا دیا تھا۔“

عثمان صاحب خاموش تھے۔ ان کا چہرہ تارک ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر کچھ سوچ رہے تھے۔

”بولیے ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو قانون کی پھنسی پر آمادہ کر دیا؟“

”میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ بیٹے اس رقم کو مت کریدو۔ میرے ساتھ تم بھی رو پڑو گے۔ اس جیلے

میں ہم دونوں کے لئے ہتھیار تھی۔ میرے ساتھ تم بھی جاؤ جاوے۔“

”میں..... میں۔“ تو محسوس بہت پہلے پچھان لیا تھا۔ اس کی اتنا قریب آیا تھا۔ قیام غیر نہیں ہو۔ میرے عزیز

دوست کے بیٹے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گھنٹہ اور تم پھنسی پر لٹکا دینے جاؤ۔ اگر اس کی بات نہ مانا پھر بھی میں مجرم ٹھہرا دیا جاتا۔ کھرا ایسے بھی تھا۔ ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے آسان تباہی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔“ پھر انھوں

نے آہستہ آہستہ میرے ہونے لگے میں میری اپنی داستان سنا دی۔

میں خود نہیں جانتا تھا کہ میرا ہاتھ خون سے رنگا ہوا ہے۔ میں قتل مجھے سیاک جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ مجھے یہ قانون کی نظروں سے بچا ہوا ہوں کہ میری کج عادت کو معاف نہیں کرے گی۔ اسی خیال نے مجھے

بے چین کر دیا تھا اور مجھے گھنٹہ سے انسیت ہو گئی تھی۔ یوں ہی میرے بیان نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ انکی میں لکھی پر پورٹ نے ہی اسے بچا لیا تھا۔ میں نے رپورٹ میں گھنٹہ کا نام نہیں دیا تھا۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ انہی جی

کے دوست عثمان نے اسے مجرم ٹھہرا کر دیا تھا۔ یہی جی کے پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے فعل پر عذرت نہیں تھی۔ بلکہ گھنٹہ پر پیار رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے انکی ایک بات معلوم ہوئی کہ اب میں

اپنے طور پر گھنٹہ کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر تھانے پہنچی تھی۔ ملزم چودھری سے اس کا کیا

رشتہ تھا۔ تب معلوم ہوا کہ وہ گھنٹہ کی عادی ہے۔ یقیناً اس کی اسی کمزوری کا بھرم نے فائدہ اٹھایا تھا۔ چودھری کا قاتل بھی گھنٹہ کی فریو نہ تھی کہ وہ اس کا اقرار شیر خان نے بھی کیا تھا اور شیر خان کا ہاتھ

کھینچے تھے۔ میں نے یہ بات مجھے معلوم کی۔ اس بد بخت کے بچے سے گھنٹہ کو بھی نکالا جا سکتا تھا۔ جب وہ اس لٹ سے

بھٹکا رہا۔ اس کی

کالی دیویر کرنے کے بعد میں نے عثمان صاحب سے کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے گھنٹہ شیر خان کے گروہ سے وابستہ ہے؟“

”نہیں۔ یہ غلط ہے۔ کسی اور نے شیر خان کے نام کا فائدہ اٹھایا ہو گا۔“

”آپ کو کیسے پتا ہے؟“

”مجھے؟“ وہ سب کچھ سمجھنے لگے۔ انہی جی نے انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

”میں ہر بات پر نظر رکھتا ہوں۔“

”کیا اس بات پر بھی آپ کی نظر ہے کہ گھنٹہ غشیات کی عادی ہے۔“

”اے! وہ غشیات کی عادی ہے؟“

”ہاں! اسے رات کاغ سے لگی ہے۔ اسی لٹے اسے شیر خان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔“

”اسے کسی طرح بچا لو۔ اگر وہ مرنے لگی تو میں بھی نہیں بچاؤں گا۔ اسے ہٹا دے۔ یہ چلانے کے لئے ہی میں نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ میں اس کا علاج کرواؤں گا۔“ کہتے ہوئے میں اٹھ گیا۔

اسی دن میں گھنٹہ کو لے کر راجیل ٹیکسٹ پینچا۔ ڈاکٹر راجیل کا شمار ملک کے معروف نفسیات معالج میں ہوتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اسے اس لعنت سے چھٹکارا دے دیں گے۔

گفتہ کروان کے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں پھر نشات فروخوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار میرا اعزاز جارحانہ تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اپنے علاقے سے نشات فروخوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ میری کارروائی سے نشات فروخوں میں افراتفری پھیل گئی۔ میرے اس اقدام سے میرے ہی ڈپارٹمنٹ کے کئی افسران ناراض ہو گئے تھے۔ یہ روایتیں کئی کئی دیگر ڈپارٹمنٹس اور افسران کے بھی مشابہت سے رہے تھے۔

☆.....☆

اس روز بھی میں ایک بڑی چمچی پر ہاتھ ڈال کر لوٹا تھا کہ ڈاکٹر راجل گھبرائے ہوئے آئے۔ "میری پوتی" ہائے میری پوتی۔ "وہ بچے رونا لٹا غلط میں ہو لے۔"
"کیا ہوا آپ کی پوتی کو؟" میں نے پوچھا۔
"اُسے کئی آنکھ اکر گیا ہائے میری پوتی۔"
"ڈاکٹر صاحب یہ کراچی ہے ایسا واقعہ تو عام بات ہو گئی ہے۔ جب لوگ مادہ پرست بنیں گے تو یہی ہوگا۔"
"ڈوٹو وائے تلاش کرو" وہ کراہے۔
"عمر کیا ہو گی؟"

"تیرہ سال۔ میرے مرحوم بیٹے ہو چکی وہی تو ایک نشانی ہے۔"
"اللہ پر ہر دوسرے تھیں۔ میں ابھی اسے قانون کو لارٹ کرنا ہوں۔ نام کیا تھا؟"
"فہمیدہ نازی۔" باب کا نام فرحت حسین اور..... اور وہ پچھولوں ایسی نازک ہے ہائے میری پوتی۔"
میں نے سہمی کو امیں بانی پلانے کا حکم دیا اور افسران بالا سے رابطہ کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کے پیچھے شہر خان کا ہاتھ ہو گا۔ اسے خبر ملی ہو گی کہ گفتہ اسی ٹیک میں ہے وہ ڈاکٹر کے ذریعے اسے انوار کا رانا جانتا ہو گا تا کہ کچھ پر بازو ڈال سکے۔ میں نے کاشیوں کو اس کے اسپتال پہنچ دیا۔ ڈاکٹر کو بھی کئی کئی کے بعد واپس بھیج دیا۔

دس گز گر پکے تھے نازی کا پتا نہ چلا۔ وہ کہاں ہے کس کے قفسے میں ہے اس کی خبر نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر وہ خاموش رہے۔ ادا سی ان کے چہرے کا تیز بن چکی تھی وہ سکرانا بھول گئے تھے مگر اب وہ مجھ سے پوتی کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا انہیں تیرا اچکا ہے۔ گفتہ کی حالت بھی اب سدھرنے لگی تھی۔ وہ پہلے ایسی ڈی۔ سی ایک بجلی کا قفسہ نہیں کرتی تھی۔ جب بھی جاتا وہ پر سکون تھی۔ پہلے نئے کی طلب اسے یہ چین کیے رہتی۔ وہ رات میں بھی جاگتی رہتی تھی اب اسے نیند آنے لگی تھی۔
اس دن جب میں پہنچا تو وہ دوسری تھی۔ میرے پکانے پر وہ اٹھ گئی تھی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر مجھ سے کہتے ہی وہ نشہ بھی اوروٹی۔ "رائل ایک سکرٹ کے پاؤ گے؟" نئے کی طلب یہ چین کیے دے رہی ہے۔
میں نے کیکٹ کٹال کر بڑھا دی۔ اسے ایک سکرٹ کٹال کر سلا گیا اور ڈی کو تیل پر رکھتے ہوئے

بولی۔ "سارے سکرٹ میں سرہ کپاں لیکن مجھ تو راحت ہے گی۔"
نیل پر دو کی شیشی اٹھ پڑی تھی اب وہ سکرٹ کٹال بھیج رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ مجھے کیکٹ اٹھانے دیکھ کر وہ بولی۔ "پلیز ایک اور سکرٹ۔"
میں نے ڈی بڑھا دی۔ اس نے کیکٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پلیز رائل مجھے ایک ٹھنڈی بوتل لا دو۔"

میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ خستہ نشانی تھی۔ میرے ہاتھ سے بوتل لے کر چمکیاں لینے لگی۔ مجھے تھانے پہنچنا تھا۔ اس لیے اٹھ گیا۔ جاہر آکر بائیک اسٹارٹ کی اور تھانے کی جانب چل پڑا۔ کچھ دیر گزرا تھا کہ میری بائیک کے سامنے ایک ہیرو گئی آگیا۔ اسے تھانے کے لئے میں نے پوری کوشش کی اس کو شش میں بائیک قبرستان کے گیٹ سے ٹکرائے ٹکرائے گئی۔ غصے میں ابلتا ہوا میں مڑا لیکن وہ ہیرو گئی تھانہ تھا۔ یعنی ٹھنڈی میرے علاقے میں نہیں تھا وہ نہ ہی ہیرو گئیوں کو اس طرح جمع ہونے دیتا۔

کچھ سی ٹی تو مجھے حیرت ہوئی تھی غریب آباد پہلے سے سن اسکوئر تک ہیرو گئیوں کی جنت نظر آتی تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہر وقت جمع نظر آتے تھے۔ چھوٹی نظر آتی تھی چار پانچ کی ٹولی میں بیٹھے نظر آتے۔ سب کا چہرہ ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک ہیرو گئی پتیا پتیا اس کے دھوئے سے لطف لیتے۔ یہ نظارہ میری طرح افسران بالا بھی دیکھتے ہوں۔ برابر میں ہی رہائشی ریجنز کا ہیڈ کوارٹر ہے ان جانناڑوں پر اس کا اثر کیا پڑے گا کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت نہ کی ہوگی۔ مگر اس دن میں باگل ہوا تھا۔ دروی میرے جسم پر تھی۔ وہی دروی جسے زینت بن کر تے وقت ہم کھاتے ہیں کہ چیم کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ اس دروی کی لانج رکھنا ضروری تھی۔ میں نے قبرستان کے گیٹ پر پنی مارشل والی دکان سے ایک ڈڑا اٹھایا اور ان بد بختوں پر پل پڑا۔ دو جاگرو ڈکے پڑے تو پنی نے انکھٹے ہوئے سر کو اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ اپنے بھائے کو یا بھوت دیکھ لیا ہو۔ بھگدڑ دیکھ کر سنارنی فرنٹ کے آفس سے کچھ لوگ نکل آئے۔ میں نے انہیں اشارے سے بلایا۔ وہ نزدیک آکر کھڑے ہو گئے۔

"کیا نام ہے؟" میں نے ایک سے پوچھا۔
"دوایہ سنگ۔"

"مجھے سب کچھ نہیں آتی تمہارے علاقے میں یہ گندگی پھیلی ہے۔"

"سر، ہم تو خود پریشان ہیں لیکن کیا کریں آپ لوگ انہیں چھوٹ دے رہی ہے۔ مائیکل صاحب نے کئی بار حکام بالا سے شکایت کی اور پھر اسے ڈیوٹی آگیا مگر کچھ سنا ہے۔"

"نکل سے یہاں کوئی نہ پھنسے۔" میں نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جاتا تھا کیا کیا جھگڑائیں جھوٹیں سکھ۔ وہ بے چارے کچھ بھی نہیں کر سکتے یہ لعنت اتنی آسانی سے تو ختم ہو گئی۔

تھانے پہنچ کر میں نے ڈی سے سگرت نکالی اور ہونڈوں میں پھنسا کر تیلی جلائی۔ دو چار ش لیتے ہی منہ کا مزہ و جب ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دو کا اثر سگرت میں بھی آگیا ہے۔ اگلے سگرت تھا جبجوری میں اسے ہی پیتا پڑا۔ سگرت ختم ہوتے ہی میرا سر پکڑنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے نیلے نیلے دائرے ناچنے لگے اور میں نے ٹھیل پر سر رکھ دیا۔

"ہے سر، اوشو۔" چھڑی کی جھونپ نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا اور سامنے کھڑے فٹس کو دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ میں نے پی عارف مین کوڑے تھے۔

میں نے کوڑے ہونے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ میرے پیروں میں جان نہیں ہے میں لڑکھڑا گیا اور کرسی کے ساتھ فرش پر گر گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے بیدے کے نزدیک ایک پہلی بیٹھا تھا۔

”مجھے کیا ہو گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”آپ نے ہیرن کی پٹی رکھی۔ جس کے لئے شام میں آپ نے عشی مگر میں مار پیٹ بھی کی تھی۔ اب آپ لائن حاضریں۔“

”میں۔ میں نے ہیرن کی پٹی؟“
 ”ہاں آپ نے“ ایس بی صاحب نے خود پکڑا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ میرا داغ ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ میں ایسی غلطی شے کر ہا تھا لگا ہی نہیں سکتا تھا میرا کیا کیوں ہوا؟ میں نے تو دوا میں جیکل سگریٹ کی تھی اور وہ دوا ڈاکٹر بنی پکلیس کی ضرورت ڈاکٹر کو دھوکا دے گا۔
 میں نے باکٹ میں تھوڑا سا سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر سگریٹ نہ تھی میں نے سپاہی سے کہا۔ ”بھاک کر ایک پکٹ سگریٹ لے لو۔“

”لیجئے بیچئے۔“ اس نے سگریٹ نکال کر بڑھائی۔ میں نے سگریٹ تمام لی پیلاش لیتے ہی مجھے بالکل دیا ہی مزہ لگا جیسے میں وہاں بنی پکلیس میں بیٹھا سگریٹ کی رہا ہوں۔ میں نے حیرت سے سگریٹ کو دیکھا۔ وہی میرا براڑ تھا۔ میں سوچنے لگا پھر مزہ کیوں بدلا بدلا سا ہے۔ لگتا ہے منہ میں دوا کا ذائقہ باقی ہے۔ سگریٹ کی کر میں لیٹ گیا۔ مجھ پر غور دلی چھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں دنیا دہانیا سے بے خبر ہونے لگا۔

میری آنکھ رات کے دس بجے کھلی۔ جھوک پیاس مچ چکی تھی۔ صرف سگریٹ کی طلب تھی۔ میں نے اسٹول کی جانب دیکھا۔ وہاں ہنوز بیٹھا تھا۔ میں نے بھرا کر ایک سگریٹ طلب کی جو اس نے فوراً پیش کر دی۔ مجھے پھر دیا ہی مزہ ملا لیکن اس بار وہ مزہ نہیں لگا۔ عجیب سے سرور کا احساس ہوا۔ میں پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں اس سپاہی کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ میرے قاتلے کا ایس آئی تو قیق آ گیا۔ اس نے خلاف توقع سلام کیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے حسد کرتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ لائن حاضریں کر دیا تھا۔ اس بار مجھے لائن حاضریں کیا گیا تو وہ بیچ کیا ضرور میرا فرق اڑانے آیا ہوگا۔

”کوہ ستر ایل کسی طبیعت ہے۔ مجھ تو خبر ہی نہ تھی کہ نشات کے خلاف ہم چلانے والا ہی نشات کا عادی ہے۔“ اس کی زہریلی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی پھر بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ ڈال سے پتا چکا ہے تو حقیقت کھودیتا ہے۔ میں اس وقت تڑپ رہا تھا۔ اس لئے بھی خاموش رہ گیا۔

”مجھے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا“ کسے تلاش کر رہے ہو؟“
 ”آگ مار ڈالتا۔“ میں نے دھجے لکھے میں کہا۔
 ”گمارڈ؟ تم کیا وی آئی بی ہو جو تمہیں گمارڈ لے گا۔ شکر کرو کہ ایس بی صاحب کو رحم آ گیا اور انہوں نے تمہیں ہسپتال بھیج دیا جسے ملا ہے کہ تمہیں مگر پہنچا دوں۔“

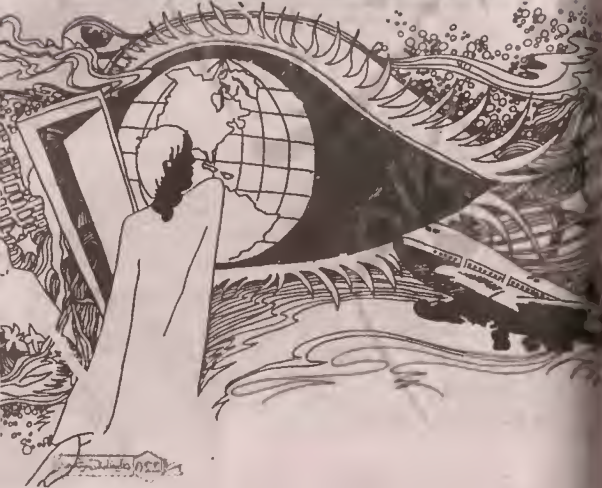
”مگر وہ سپاہی؟“
 ”تم کس سپاہی کی بات کر رہے ہو۔ ٹھہرو میں تم سے پوچھتا ہوں۔“

شازی سعید منٹل

تاشقین

حزینہ مدنی کا خیال
 عالم رنگ و دھماکا سے گزر
 کوئی قیمت نہیں بیانی کی

حیرت، تجسس، ہراس اور ستاروں سے جڑے بہت خاص طیلے کی عالمیوں کو



آگے کا احوال جاننے کے لیے
 آئندہ ماہ شمارہ جون میں پانچویں قسط ملاحظہ فرمائیں

”دیکھنا تاشون! مجھے لگتا ہے“ نافوق الغیرت اور تو ہم پر حق ان دونوں میں فرق عام لوگوں کو محسوس کرنا مشکل ہوتا ہوگا۔“ ”نہی نے بڑے سچے کی بات کی تھی۔“

”تم نے ٹھیک کہا مگر یہاں بات صرف اور صرف علم کی ہی آ جاتی ہے، ہم اس بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور مرے تو دیک تو ہم پر حق کا شکار رہتے ہیں۔ میں تمہیں صرف جاہل نہیں ایسے ایسے بڑے لکھے اخصاس کے بارے میں اگر بتاؤں تو تم تیراں رہ جاؤ گے۔ یورپ جو تہذیب و تمدن کا بڑا اثر ہے، شاید کہ بنائے تاریخ شاید کہ سب سے زیادہ تو ہم پر حق کا شکار ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ایک امریکن پرو فیٹرڈ انٹر ایڈورڈ ایچ کاولین نے اسے کمر ہار اپنے تین ساتھیوں کو کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے دوران ان کے ایک مہمان نے جو ریاضی دان تھا، کچھ ٹھنک کر کہا تو اس نے خود بخود اختیاراً طور پر کچھ کھانا کھا کر بائیں شانے کی طرف پھینک دیا اور پھر شام کو کٹاں کی میز پر اس کے تیسرے مہمان نے جو کہ ایک فلسفی تھا کہنا کیا کہ وہ مرین کیلئے ہوئے بیک گلوں کے لیے نیلے پے پتھر کرتا ہے اور پھر بعد میں جب وہ فارغ ہو کر جمع ہوئے تو پرو فیٹرڈ انٹر ایڈورڈ نے اپنے تینوں دوستوں سے ان کے ان توہات کا ذکر کیا تینوں نے حتیٰ طور پر اسے بتایا کہ ہم سب اس عام انسانی کمزوری سے برا نہیں ہیں۔ یہ 1944ء کی بات ہے اس کے بعد ڈاکٹر ایڈورڈ کاولین نے توہات کے سلسلے میں کافی چھان بین کی اس کی نعم کے چار حاضرین میں سے ایک لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ لوگوں کے عام توہات کے نظریات معلوم کیے۔ پہلے تو سائنس دانوں نے تقریباً چار ہزار توہات مختلف قسموں میں تقسیم کیا اس کے بعد آدھوں کو مگر نچنہ متعقد ہیں اور دھلے یقین میں انھوں نے تسلیم کیا۔ یہ آخری قسم ان لوگوں کی تھی جو خود توہات پر اعتقاد نہیں رکھتے مگر کھانے کی میز پر 13 افراد میں پندرہ نہیں کرتے تھے یا مگروں کی سیرمی کے پیچھے سے گزرنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ اس ہمہ گیر تحقیق سے بہت سی عجیب باتیں معلوم ہوئی ہیں مثلاً دو لوگ دو دنیاؤں میں رہتے ہیں ایک ٹھیک سائنسی دوسری غیر تحقیقی اور توہانی، 30 لاکھ لوگ ایسے ہیں جو یقین سے کہہ سکیں کہ وہ تو ہم پر حق نہیں ہیں مگر انھوں میں سے زیادہ تو ہم پر حق کا شکار ہوئی ہیں اس کے بعد سب سے زیادہ تو ہم پر حق تاش اور جوئے ہاوت ہیں ہندو تو سب سے زیادہ تو ہم پر حق ہے۔ جتنی توہم کی وقت اسکی تھی مگر اب نئے دور کے افراد کی حالت پہلے جیسی نہیں رہی امریکن سب سے زیادہ ہوئے ٹوٹے ٹوٹے باز ہوئے ہیں بلکہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ امریکن سب سے زیادہ ہوئے ٹوٹے ٹوٹے لوگوں پر یقین کرتے ہیں مثلاً آج بھی وہ کیسک چاندی کا کھل پرا ناؤ ہڈی کا ٹکڑا اور کچھ نہیں تو خرکوش کا پیر ہی کھاتی اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا اب بھی تو ہم پر حق سے آ بار ہے۔۔۔ بہر حال یہ سب بار بار سے دور دنیاؤں سے جڑے خیال اور عقیدتیں ہیں جن کو پہلے مادے اور جوہر کی غامبی حالت کے قابل حضرات کہتے ہیں اور جب ان سے سابقہ پڑتا تو ہے پھر یہ ضرور اداری دینا یا یقین خود دلانی ہے۔“

”تاشون!۔۔۔! میں نے تمہیں شاید بتایا تھا، جب میں رائے کے سلسلے میں پریشان حال! دھڑک رہا تھا تو مجھے ایک صاحب نے کسی بزدل کے بارے میں بتایا تھا۔ ان بزدل سے ملاقات کے دوران میری ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کو کھدائی کی کڑاں کا مکان کی شبیہاتی قوت کے زیر اثر آ گیا ہے جو کھانے دار میں اس کے کھر میں رہنے آ یا اس کا ذہنی سکون میں چھوٹا اور وہ دوسری دنیا کی اس مکان میں ہاں انتہائی خوف میں رہا اس میں رہا اس صورت حال کے بعد وہ اپنا مکان چھوٹا چھوٹا مگر مکان بہت بدم ہو چکا تھا کوئی کابک نہیں ملتا تھا

اور اگر ملتا تو مکان کوٹ کے بارے میں اس کو پہلے ہی سے پتہ چل جاتا تھا۔ بقول اس شخص کے ”میرے مکان کے سارے کمرے حیرت انگیز طور پر سرورہتے تھے اور ایک کمرہ تو ایسا تھا کہ اس میں جو شخص بھی داخل ہوتا اس کو بڑی طور پر کس آن دھکی قوت کی موجودگی کا احساس ستانے لگا اور اس کمرے میں سونے والے کو کسی رات کے وقت جھپٹے کوٹ کرے سے باہر لا کر ڈنگ دیا کرتا اور ڈنگ کے طور پر اس کی کوئی دیکھائی پڑی چلی ضرور توڑی جاتی تاکہ وہ اس کمرے میں دوبارہ سونے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہاں ایک سوال میرے ذہن میں اٹھ رہا ہے۔“

”وہ کیا؟“ ”مونا جلدی سے بولی تھی۔“

”وہ یہ ہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ یہاں پاکستان و ہندوستان یا ایشیائی ممالک کے لوگ ہی اس طرح کی چیزوں کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ان میں حقیقت بھی نہیں ہوتی صرف وہم ہوتا ہے لیکن کیا یورپ اور مغربی ممالک میں بھی مکان اور آسپ کا چوٹی داس کا ساتھ ہے؟“

”اچھی کم علمی کا نام کرو۔“ تاشون نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میرے دوست! یورپ اور مغربی ممالک تو توہات اور حقیقت کے پکر میں ہم سے زیادہ جھپٹے ہوئے ہیں۔ اگر میں تمہیں یورپ اور مغربی دنیا کی توہم پر حق کے قصے سنانے لگ جاؤں تو تمہیں حیرت کے شدید پھٹکے لگیں گے۔“

”لیکن میں سمجھتا ہوں جو حقیقت بھی ہے جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوا۔“ تاشون نے ان کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”جی بالکل اصل کیسریجی ہوتے ہیں اور پھر ان مکان کا تو آسپ یا کسی اور شیطانی قوت سے بچانے کے لیے وہی طریقے اپناتے جاتے ہیں جو کہ زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔“

”مثلاً؟“ ”نہی نے فوراً ہی سوال کیا تھا۔“

”مثلاً! ابھی بعض ملکوں میں مکانوں کی بنیادوں میں سے ٹن کیے جاتے ہیں تاکہ مکان دولت سے خالی نہ رہے مکان کی آخری اینٹ لگانے کے ساتھ منور کے درخت باورچی خانے کے ساتھ یا مکان کی چوٹی کے قریب لگاتے جاتے ہیں منور کا درخت یا پھر اندر حلیہ کیا جاتا ہے اور زمانہ قدیم سے یورپ میں اس کھر میں اس لیے لگایا جاتا ہے کہ کھر کو قندق سے محفوظ رکھتا ہے اس کے علاوہ قدیم روایوں سے بھی جڑا رسم و رواج ہیں جن میں کھر کے دالان یا پڑوسی کو کھر کی دیوئی دینا سے منسوب کر کے تھے اور کھر کے دروازے اور کٹے کو قدیم اطالوی دیوتا جانوس سے منسوب کرتے تھے جو دروازوں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ اگر چاہ روم اور اس کی قدیم رکیں صرف یا دیس بن چکی ہیں تاہم رومی کھر کو اس قدر مقدس سمجھتے تھے کہ اسے ایک معبد یا گھر یلو عبادت گاہ کا درجہ دیتے تھے۔ قدیم انگلستان میں رومن کھر چھوٹا بطور تختہ دیتے تھے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ وہ کھر اور درجی خانہ کی تھی۔“

”اور وہین قدیم زمانے میں بھی کھر کی مالگن اور باورچی خانے کی حکومت مسلط تھی؟“ ”نہی نے حیرت کا اظہار کیا۔“

”جی بالکل۔“ تاشون نے کہا۔ ”کھر کی مملکت کا تختہ“ اور جی خانہ“ شروع سے قائم رہا ہے۔ قدیم زمانے میں باورچی خانے کو کھر کے وسط میں بنایا جاتا تھا۔ یوں کی کٹاکی کے لیے چھنی بنائی جاتی تھی۔ اس وقت آگ اور چوٹے لوگ اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ ایک شخص صرف اس لیے لازم رکھا جاتا تھا کہ آگ کبھی بجھے نہ دے اور اگر کبھی مرتبہ اپنی اپنی تلخ کھر بنالینا تھا تو وہ اپنے کھر میں پہلی بار آگ جلانے کے لیے اسی خاندانی اور قدیم چوچے سے آگ یاد ہوتا ہوا انگارہ لے کر جاتا تھا۔ اس طرح خاندانی زندگی کا تسلسل درسل

اس جلی رہنے والی آگ کے ذریعے برقرار رکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ممالک میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ گھر کے چولے میں جلنے والی آگ کو مقدس دیتا یا کا تحفہ حاصل ہے اور اور میں تو بعض علاقوں میں آج بھی چولے کی آگ کی حفاظت کرنے والے مقدس دیتا یا کی عزت کی جاتی ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ دیتا یاں قدر غصے والا ہے کہ اگر حفاظت نہ کی تو وہ ناراضگی میں گھر میں آگ لگا سکتا ہے اور وہ گھر کا عالم یہ ہے کہ گھر میں لوگ کوئی تصویر اگر بغیر کسی وجہ کے گرا جائے تو اسے موت کی دھمکا دیا جاتا ہے تاہم اس وارننگ کا اطلاق عموماً عامی تصویر ہوتا ہے۔ سفر کی پدید آمدن کے بعد تو اسے ایک آئینے سے متعلق بھی ہے۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ گھر میں موت واقع ہو جائے کی صورت میں گھر میں موجود تمام آئینے اس خوف سے ڈھک دیئے جاتے ہیں کہ کہیں روح آئینے میں اپنا عکس نہ دیکھ لے ایسا ہونے کی صورت وہ دوسری دنیا تک طویل سفر میں وفات کی غرض سے خاندان کے کسی اور فرد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں آئینے کا ٹوٹ جانا ناسات سال کے لیے بد قسمتی لاتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی کسی اگر گھر میں آجائے تو چڑیلوں اور شیطانی دھمکیوں میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ کچھ لوگ گھر کی چھت پر براہمن لگا دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح گھر کو آگ لگنے سے محفوظ رہتا ہے اور کچھ لوگ اپنے گھر کو آئیب سے بچانے کے لیے درخت لگا کر اس کے چاروں طرف سفید پھول لگا دیتے ہیں کیونکہ اس اعزاز میں درخت اور پھول لگانے سے گھر کو چاند کی دیوی آئی سس کا تحفہ حاصل ہو جاتا ہے یا پھر گھر میں سنہرے یا نارنجی پھول لگا کر گھر کو سورج دیتا یا تحفہ میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عقیدوں اور باتوں میں حقیقت بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں توہمات کی دنیا آباد ہے وہاں شیطانی قوتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں جیسا کہ شاکر علی صاحب نے بتایا۔ ”تاہم ان کے پس منظر کے تسلسل میں ایک مرتبہ پھر صحابہ کے سنگا پورہ اور مکان کی مثال پیش کی تھی۔

”کسی گھر میں غیر مرئی یا شیطانی قوت کی موجودگی سے خطر کا کوئی اور بات نہیں کیونکہ ایسی قوتیں ”زومانی“ جیسا کہ نادی غرض ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایسے بھی پرانے زمانے کے لوگ گھروں میں ایسی چیزیں ضرور رکھا کرتے تھے جن میں موجودگی شیطانی قوتوں کو گھر میں آنے سے روکتی تھیں مثلاً گھوڑے کی نعل کر کے دروازے پر لگانے میں بھی خیال کارفرما ہوتا ہے کیونکہ نعل کو بے کیا قوت ختماتی جاوٹی قوت و خصوصیات کے ساتھ ساتھ اہل دولت کی بھی خصوصیات رکھتی ہے اس طرح یہ نعل صرف تحفہ بلکہ خوش بختی بھی لاتا ہے۔ گھر تبدیل کرتے وقت عموماً نئے گھر میں سب سے پہلے نمک لاکر رکھا جاتا ہے کیونکہ نمک شیطانی قوتوں کے خلاف زومانی نکالتا کام کرتا ہے۔ گھر کو شیطانی قوتوں سے محفوظ اور برکتوں خوشیوں سے ہمکنار کرنے کے لیے زمانہ قدیم سے یہ سلسلہ چلا رہا ہے اور چل رہا ہے۔“

”ابن کثیر فرمایا آپ نے ”شاہ علی نے کہا۔ ”مگر اس کے علاوہ ایک چیز ہے جو ہمارے گھروں میں رہنے والے کیوں کو زومانی اور جسامتی نقصان پہنچا دیتی ہے اور یہی موت پہنچا سکتی ہے اور جسے بہت عرصے تک گھر میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ جب سے اس گھر میں شفٹ ہوئے ہیں تب سے ان کے ساتھ مسائل چل رہے ہیں اور جب اسے گھر کی عزت سمجھتے ہیں بہت دور ہو جاتی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز اور حقیقت کچھ اور ہوتی کی۔“

”وہ چیز کیا ہے؟“ زلفی نے کچھ سمجھتے سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”چاؤ..... کالا چاؤ.....“ تاہم ان نے گھر سے لہجہ میں کہا تھا۔

”ہاں گھروں میں موجود شیطانی قوتوں کے علاوہ گھروں میں رہنے والے کیوں کو بھی شیطانی مقاصد کا ڈھار بنایا جاتا ہے ایسا کسی دشمن کی بنا پر یا دیگر وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔“ شاکر علی نے کہا تھا۔ ”کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے میرے پاس جو افریقی سیاہ فام ملازم ہنڈرک ہے اس کے گھر کی دھوڑ میں اس کا بچا بھر کر بھیجی ہیں اور اس سیاہ فام لڑکے ہنڈرک کو میں بڑی ناگفتہ بہ حالت میں اپنے گھر لے کر آیا تھا اور پھر چند روز اس کی حالت میں مدھار آتا کیا لیکن اب بھی وہ اس واقعہ کو نہیں بھولا اور کسی بھی قوت پر ایک دورہ مار پڑتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کیا بھکاپ کے جیساہ گزرا ہے اس پر؟“ تاہم ان نے شاکر علی سے پوچھا۔

”ہاں ہم سب تو اس گھر سے بھرے ہوئے نکل آئے تھے لیکن ہنڈرک کا کاتر بھی پورا خاندان شدید متاثر ہوا۔“

”میں اس کے ساتھ افریقی چلا گیا کہ شاید اسے تباہ شدہ گھر کو دیکھ کر اسے سکون آجائے۔“

”ہوا کیا تھا اس کے ساتھ؟“ زلفی نے پوچھا۔

”آپ سب کے افریقی کے چاروں گروں کا کارستانی؟“ شاکر علی نے کہا۔

”ایک ماہانہ ضرور میں گئے۔“ زلفی نے کہا جبکہ چاروں گروں نے انہماک میں سر ہلایا تھا۔

”ہنڈرک نے بتایا تھا کہ وہ کسی گھت میں رہتے تھے ان کے ساتھ ان کی ایک فریڈی شدہ خالہ بھی رہتی تھی۔ وہ مریضوں کے اعٹھے سے حج کے چھتی تھی اور ان کی بہت مدد کرتی تھی ایک دن وہ اس کی دامن ناگ میں شدید درد اٹھا جو بڑھتا ہی گئی کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی لیکن اس نے پھر بھی لاشی کے سہارے اعٹھے سے حج کرنا اور چیتنا چھوڑے۔ وہ حج نکل جاتی اور شام چلے واپس آئی۔ ہنڈرک کی والدہ نے اپنی بہن کی حالت کے پیش نظر اسے روکا لیکن اس نے اسرار کیا کہ وہ ماضی دور کے کسی گھر میں رہتی ہے اس کا فرض ہے کہ ان کے لیے کچھ کرے۔ فرخاں نے کام جاری رکھا لیکن اس کی والدہ روزانہ ٹھک خراب ہونا شروع ہو گئی اور پھر کچھتے ہی دیکھتے دوسری ناگ بھی خراب ہو گئی یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئی اس کی ماں اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاتی رہی لیکن کوئی قاعدہ تو تھا۔ وہ دن بدن کمزور اور لاغر ہوتی چلی گئی تھی کہ وہ اپنے بستر سے بھی نکل سکتی تھی اور پھر اس کی خالہ ایک دن موت کی دوا دیں میں مل گئی تھی۔“

”ہنڈرک کا اس کی موت میں رہتا تھا اس کے برابر وہ ایک ہندو مت میں رہتا تھا وہ ہنڈرک کی ماں کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ ”آپ کی بہن کی موت جاوٹی وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ میں نے خود ایک چاروگر ڈاکٹر کو آپ کے راستے میں کالے جاوٹی پر پڑا دیں کرتے دیکھا تھا۔ آپ کی بہن جو بھی اس پر سے گزری ہوگی جاوٹ نے اپنا کام کر دیا اور وہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے بعد مر گئی۔“

”میری ماں اور باپ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔“ ہنڈرک نے غصہ کی سانس لے کر کہا تھا۔ ”وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ پڑیا میں ایسا کیا ہو سکتا ہے جو اس چاروگر ڈاکٹر نے فون کی کسی؟ اس ہندوستانی رام نے بتایا کہ اس پڑیا میں آپ کی بہن کے بال اور ناخن ہوں گے افریقی میں چاروگر ڈاکٹر نے اسے کامیادہ لے کر کرتے ہیں اور تحفہ عملیات کر کے وہ جاوٹی پڑیا تیار کرتے ہیں۔ پڑیا جس شخص کے لیے ہوئی ہے اس کے راستے میں فون کرتے ہیں۔ جس پر سے وہ گزرتا ہے اور بیماری کی حالت میں مر

رکنے والے تھے۔ فارما ہاؤس کے فرانسسیسی درجنوں سے چھن کر آئے والی چاند کی روشنی میں ماحول خاصا پر اسرار سا ہوا تھا۔ وہاں چوکانی دیر سے در پچھو گئے کھڑے تھے سب کے ساتھ آ کر بیٹھ چکی تھی عمر کا بی دیر سے اس گفت پیک کو کھولنے کے چکر میں تھا۔ دلی کوئی ایک جیس تھا کہ اس گفت پیک چل گیا ہے اور کس نے بھیجا ہے جو ہوا پر اسرار سا تھک رہا تھا۔

موند گب کے لیے کالی بٹالائی تھی۔ ہنگی سنگی رنگ چاندنی رات میں بھاپ اڑاتی کافی اس پر تکلف خیانت کا ایک خوبصورت اختتام معلوم دیتی تھی۔ شاکر علی عمر کو کچھ پورے قصے سنا رہے تھے۔ دلی اندر سے ناشون کا گفت پیک اٹھا لیا تھا۔ ”خواتین و حضرات میں اس کو کھولے لگا ہوں۔“ دلی نے آیا واپس ہلنے پر اعلان کرتے ہوئے پکٹ کھول ڈالا تھا۔ پکٹ میں سے نکلنے والی چیز نے ان سب کو طرہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

”مجھے یہ تھا وہ مجھے ایسا ہی کچھ سمجھ سکتی ہے۔“ ناشون نے کہا تھا۔
 ”تمہارا اشارہ دل شکاری طرف تو نہیں؟“ دلی نے پوچھا تھا۔
 ”ہاں! وہ ہی ہے مجھے بلیاویہ چھیڑ رہی ہے منکون اسے داس نہیں آ رہا ہے۔“ یہ بات سن کر رانیہ کے چہرے پر اترتی پریشانی کی جھلک دیکھ کر ناشون نے فوراً ہی بات کا رخ موڑ دیا تھا۔ ”دو بے دکن بھی اگر باذوق ہو تو کچھ عجیبی کاغذ بھی ایک ہوتا ہے۔ کیوں شاکر صاحب؟“ ناشون نے شاکر کی کئی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا تو وہ بھی زیر لب مسکرا دیتے تھے۔

”اگر بے دکن بھی چاندنی رات اور آبی کس کا مجسمہ۔“ ناشون نے پکٹ میں سے ایک چھوٹا سا مجسمہ نکال کر میز پر رکھا تھا۔ وہ ایک دیوی کا مجسمہ تھا ایک عظیم الشان دیوی کا مجسمہ جسے قدیم مصر کے لوگوں نے آبی کس کا نام دیا تھا۔ وہ چاند سے منسوب تھی۔ سوچا چاند کی دیوی کہا لاتی تھی۔ ہزاروں سال قبل مصریوں نے اسے آبی کس کا نام دیا تھا اور ان کی دیر مانی میں کس نے سوچا چاند کی دیوی کی صورت کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔
 رلوگ اس کی پرستش مقدس مقام میں کرتے تھے جہاں فاختاں سے ان کو بیکتر ضرورت کے جانے تھے اور ساتھ ہی نفس پرستی کے انتہائی شرمناک ناقابل بیان ذرا سے کیلے جاتے تھے۔ مصریوں کی آبی کس اور فاختی قوم کی عصبورت کا عاشق ایک دیوتا عدوس مانا جاتا تھا اور لوگ ہر سال اس دیوتا کی افسانوی موت کا نام کرتے تھے کیونکہ وہ اس دیوتا کو عالم انسانیت کا نجات دہندہ تسلیم کرتے تھے۔ جب وہ جلوں کی شکل میں عصبورت دیوی کے معبود کی طرف جاتے تھے تو خود کو انتہائی وحشتناک جوش میں غرق کر لیتے تھے اور یہ شدہ دیوی کے علم میں اپنے جیسوں اور فخریوں سے شکی کر لیا کرتے تھے اور اس طرح خون بہایا جاتا کہ اب مہدی یا کرنے کے بعد بھی یہ دیوی ان کے عقیدے کے مطابق مزید خون کی پیاسا ہے اور اگر ایک مناسب وقت پر اور مناسب مقام پر ضروری تیاریوں کے ساتھ اپنی تریں در بے کا جاوگر جاوے گا تو وہ شخص کی مراد الفاظ جن میں سے ہر ایک لفظ کیارہ حروف رکھتا ہے ایک خاص ترتیب سے دوسرے ادا کرے تو یہی دیوی چشم زدن میں تمہارے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی اور اپنے مجرور حسن و جمال کی دستھوں کے ساتھ ایک نئی قربانی طلب کرے گی۔“

اس وقت ناشون کی اس بات کی تائید میں مونگا اور شاکر علی نے اپنے سر ہلا دیے تھے۔ دلی کو جب کہ خیالات اور دش خیال طرز فکر نے دلا انسان تھا مگر اس وقت ناشون کے بیان کے آدھی آدھی کے سمجھے اور اس کی تاریخ کے سلسلے میں کی پس و پیش کا شکار نہ ہوا تھا بلکہ اسے آبی کس کی خوفناک پوشیدہ حقیقت کا مکمل یقین تھا۔

”لیکن کیا یہ فکر کی بات نہیں ہے کہ یہ مجسمہ تمہیں سبب شیانے کیوں بھیجا ہے؟“ دلی نے فکر یہ انداز میں ناشون سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں! کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔“ ناشون نے مگر اس سبب لیتے ہوئے کہا تھا۔ ”بس! وہ دوسرے ہی یاد دلا رہی ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں اور تمہاری شہنشاہ ہوں۔“ ناشون نے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کہی تھی کہ تقریباً سب ہی اس پر ہنس پڑے تھے۔

”میں شیانے آپ کو کچھ یاد دلایا ہو یا نہ دلایا ہو مجھے تو اپنا معاملہ اپنی حالت یاد آ رہی ہے۔ وہ چاند گہن اور میں.....“ رانیہ نے تشویش بھرے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”صرف چاند گہن سے کچھ نہیں ہوتا ہماری! آپ کو یاد ہے؟“ ناشون نے آپ کو بتایا تھا کہ جب آپ کی پیدائش ہوئی آپ انہوں پر چند خاص سترے ایک جگہ بیچے تھے اور اس بارسل شیا جادو کا جو عمل کرے گی وہ ان دونوں خاص ستاروں میں سرخ اور زحل کے ایک برج میں بیچ ہونے پر ہی زور دیا ہوگا۔ اس کے بغیر سبب کار عمل پورا نہیں ہوگا اور وہ اجتماع ٹھیک ایک سال بعد آئے گا لہذا ابھی آپ فکر نہ کریں بلکہ اب کچھ بھی نہ کیجیے گا۔“ ناشون نے مسکراتے ہوئے رانیہ کو دیکھی تھی۔

”ناشون.....! یہ چاند گہن والی بات تو سمجھ آ گئی ہے مگر یہ سرخ اور زحل کا معاملہ کیا ہے؟“ عمر نے حسب سابق اپنی بات میں اضافہ کیا تھا۔ ”آپ کو لوگوں کو یہ معلوم ہی ہے کہ میرا نقلیات کا علم بہت ہی رنگ خورد ہے اب کچھ کچھ معلومات حاصل ہوئی جاری ہیں! چند کتابیں بھی لے کر آیا ہوں جو مزید مطالعہ میں لیکن ظاہر ہے غم سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ جلد سمجھ جاتی ہیں۔“ عمر نے ایک تھک چکی ہانڈ کی گئی۔

”دیکھو عمر.....! علم نجوم ایک قدیم آرٹ ہے لیکن اکثر لوگ اسے قیاس آرائی پر ہی علم کہتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اگر آپ اس قدیم آرٹ تسلیم تو دنیا حیات اور علم نجوم کو بالکل نظر انداز کر دیں گے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ آپ ذوقی طور پر لطیفہ سے فطرتی مادی کی کینکڑ ناخن میں بنیادوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ ان کا حقائق اور چند دھار پرستی اور ضروری سے فطرتی حقائق سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ اس اور دوسرے تمام ستروں کی صحیح پوزیشن کے کسی زائچے کی تیاری ممکن ہے لیکن اس کی تیاری میں ایک ایسا علم ہے جس کی سالہا سال سے تعلیم جاری ہے اور زائچہ قدیم سے یہ علم جلا رہا ہے۔ دراصل اس کی صحیح فروغ ہی صحیح معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ زمانہ قدیم میں ایک عمر تک اس علم کے رازوں کی سخت حفاظت کی گئی لیکن جب مصر کی قدیم تہذیب نے بی بیوٹا اور کلدانیوں کا زوال شروع ہوا تو ان کے علم کے قواعد بیان اور اہل روم ایک چاہتے یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی تہذیب اور عربی روشنی کے لوگ اس علم پر یقین کرنے لگے۔ آسٹرو لوجی علم نجوم کا یونانی لفظ ہے۔ آسٹرو لفظ ستارے اور لوجی کے معنی ہیں۔ بنیاد انسانی ستاروں کے بنیاد۔ ہمارے پاس اس کے دوسرے ہیں ایک عالم بیت یعنی علم کثیف اور علم نجوم یعنی علم لطیف۔ یہ اجرام فلكی کی حرکات اور ان کے مقامات کی دریافت کرتا ہے اور دوسرا اس کے روحانی پہلو کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد عرب نے اس میں بڑی مہارت پیدا کی۔ اہل روم اس سے علم نجوم کے قواعد اور پراپ لائے تھے۔ بہت سے مشہور نجومیوں نے اپنی یقین کو گویوں کی بدولت شہرت حاصل کی مثلاً جونکن ہجرتوں نے ابتدائی قوائیم میں سرب کے ٹپش آفندرسیمون ہجرت ہرانی ایک عظیم نجم نگار تھا۔ یہ جرم کارڈن ایک محتاج تھا اور طاہر لطیف کا طریقہ کار پہلا نجومی جونکن طاہر سٹارہ علم نجوم سائنس کی طرح ایک

علم ہے انسان کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی اخلاقی اور ذہنی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشتا ہے اور مستقبل کے لیے ایک مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔ راستوں کی دشواریوں سے آگاہ کرتا ہے اور آپ کو حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مریخ اور زحل اس کے دو بڑے اہم ستارے ہیں جن کا میں نے رانیہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے جس میں زحل شخص اکبر ہے لیکن مریخ کو بھی اکثر شخص ہی مانا جاتا ہے جبکہ اس کے اثرات اچھے بھی ہو سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اور رانیہ کے پیدائشی ستاروں کے اجتماع میں مریخ اور زحل شامل ہیں یہ اس وقت ایک ہی برج میں تھے۔ سیل شیا کو اپنا جادوئی عمل پورا کرنے کے لیے رانیہ کی بطور نجی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ جب جب یہ وقت آئے گا تب ہی وہ اپنا یہ کام کر سکے گی۔ مریخ ایک آتش کوکب ہے نہ اچھے میں موجود بارہ گھروں کا چکر تقریباً ڈیڑھ سال سے دو سال میں پورا کرتا ہے۔ قدیم تاریخ میں مریخ کو آبی بروج کا حاکم سیارہ کہا جاتا تھا یہ آبی بروج سرطان، دلو، حوت ہیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مریخ کی اچھی طاقتیں اس کی شیطانی طاقتوں سے بڑھ سکتی ہیں کیونکہ بانی آگ کو شہنشاہ کرتا ہے لیکن بعد میں ماہرین نجوم نے اسے ایک آتش کوکب قرار دیا اور آتش بروج کا حاکم یعنی حمل، عقرب کا حاکم سیارہ قرار دیا۔ بارہ بروج میں سے کچھ خاص بروج ہیں جہاں مریخ خاص خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے مثلاً مریخ جب برج حمل پر ابتدائی دس درجات پر پہنچتا ہے تو وہ اعتماد، قوت، طاقت، جرأت، بے باکی، عالی ظرفی، جنس مخالف کے لیے کشش دیتا ہے جب مریخ جواز کے 10 سے 20 درجات پر پہنچتا ہے تو وہ محنت کش اور ایسی زندگی دیتا ہے جس میں جدوجہد کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ برج اسد 20 ویں درجے پر مریخ کی فطرت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں وہ امن سے محبت کرنے، دوستی اور محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مریخ برج عقرب کے 10 درجے پر پہنچتا ہے تو لاقانونیت، جھگڑا، فساد کرنے والا، قاتل، ڈاکو، غارت گر بن جاتا ہے۔ مریخ جب برج جدی کے 10 سے 20 درجے پر پہنچتا ہے تو اس میں ایک غم ناک سنجیدگی آ جاتی ہے یہاں وہ ناممکنات کے پیچھے بھاگنے والا بن جاتا ہے یعنی ایسا انسان ہمیشہ خود کو دھوکہ دے گا اور ہمیشہ مایوس اور ناامید رہے گا۔ مریخ برج حوت کے 20 سے 30 درجے پر پہنچتا ہے تو عاشقوں کا بھیس بدل لیتا ہے، دیومالائی قصوں میں مریخ کو زہرہ کا عاشق بتایا گیا ہے۔ مریخ کی ایسی پوزیشن میں پیدا ہونے والا شخص جنس مخالف سے بے اندازہ محبت کرنے والا، جھگڑوں سے بچنے والا اور زندگی میں توازن قائم رکھنے والا ہوگا جبکہ سرطان کے 22 ویں درجے پر پہنچتا ہے تو وہ وبال میں آ جاتا ہے۔ (علم نجوم کی ایک اصطلاح ہے وبال میں آ جانا۔) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اچھے کاموں کے لیے مریخ کی قوت کمزور ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریخ کی اس پوزیشن کے تحت پیدا ہونے والے آدمی میں ہمت و جرأت، الواعز، استحکام کا فقدان ہوگا۔ وہ اپنے ارادوں میں کسی انجانی خوفزدگی کا شکار رہے گا جس کا نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ مریخ ماضی پرست نہیں ہوتا اس کے لیے ماضی مچکا ہے، زانچہ پیدائش میں مریخ کی اچھی پوزیشن آپ کو ماضی کے مقابلے میں حال اور مستقبل کو اہمیت دینے والا بناتی ہے۔ نئے آغاز نئے کاموں کی خواہش پیدا کرتی ہے اور وہ قوت عمل دیتی ہے جو ہمیں مشکلات سے بچاتی ہے۔“

حیرت، اسرار، تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

سلیم فاروقی

آتشِ جہنم

شاعر کا خیال

سو پیاں تھے پیسہ گلوب جیپری بیار کی لے ہم نے
سو تیرازو تھے دل میں جب ہم نے قس آقا زکریا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی کمرزشت اس کے دل میں تھا کہ کبھی نہ لڑے ہاتھ ہاتھ ملے

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شہید محبت کرتے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جاتے والے۔ ارسلان بگھڑا لالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت بھدرا اور سوچ بگر کر فیصلہ کرنے والا عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سند میں لاف نہیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشدی لالچ پر سند کی برکے لے جاتے ہیں۔ ستر کے دوران ان کا راشدی لالچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ لائسنس یافتہ اس کے ساتھیوں سے بھڑک اٹھتا ہے۔ فتنہ راشدی لالچ میں اس کی لالچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دو مگن آئیر فون آتے ہیں جن سے اعزاز ہوتا ہے کہ فتنہ کی برے جرائم پیشہ گروہ کا آکر رہے ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے بگھڑا فوٹو لے کر دھوئے ہیں اور ان کا دھول بھائیوں سے خالص ہوتا ہے۔

(اب آگے لاہڑیا ہے۔)
وہ خاموشی سے میری شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کالر پکڑ کر اٹھایا۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن اس کا دایاں ہاتھ بے جان حالت میں پیلو میں جھول رہا تھا۔ اس کا شانہ بری طرح اڑھڑ گیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرے غیر ملکی گلیاں کا دایاں ہاتھ بھی موڑ سانسنگ کی جین سے بے کار ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کھانسی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہوگی۔

میں نے جس غیر ملکی کو کھڑا کیا تھا وہ بھی آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”میراثم عباس حکمتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو تعاقب کس ملک سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہتا ہے یا تیری گردن تو دوڑوں؟“ اس نے اپنے ہتھکنڈے نما ہاتھ کا بڑا دم بڑھا کر ہوتے کہا۔

مجھے ایسا کہ جیسے میری گردن کی ہڈی اب کسی بھی لمبوت سے ابل کر باہر جا کر گئی۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے لیکن اس مرد نے میری گردن پکڑ کر مجھے اتارے بس کر دیا تھا کہ میں اپنے ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہیں تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھار ہاتھا۔ میں نے دیکھا اس رسلان کے چہرے پر مجھ بے بسی اور کرب ہے۔

اس نے چیخ کر کہا۔ ”میرے بھائی کو چھوڑ دو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر سائیکل کی چینن بھی ہاتھ سے کھینچنے لگا۔

”اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔“ سانس کی آمد و رفت دوبارہ معمول پر آئی تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھے دوبارہ زندگی ملی ہو۔

”اب یہ بائیک کی چینن اور ریلاور مجھے دو۔“ اس نے اس رسلان کو حکم دیا۔

گردن پر دباؤ کم ہوتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر اپنی دائیں ہتھ پوری قوت سے کھینچنے کے بہت میں مادی۔

اس نے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ میری گردن اس کی گرفت سے نکل گئی۔ میں نے گھوم کر سمجھے کہ سر پہ پوری قوت سے اس پر بیخ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے حیرت تو اس کی سخت جانی پڑی اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے اس بھر پور گھونٹے سے اس کی گھوڑی چیخ مچ گئی ہوتی۔

دوسرے ہی لمحے اس کے شانے پر موٹر سائیکل کی چینن کا بھر پور وار ہوا۔ وہ کرب ناک انداز میں کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا اس رسلان نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ خون کا پھیرا اٹھالیا تھا۔ اس پر اس وقت کو یا جنوں کو اٹھالیا تھا۔ اس نے سمجھے کہ دوسرے شانے پر بھی بھر پور وار کیا تو وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح ترچے لگا۔

”اس کے دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے ہیں۔“ اس رسلان نے راشد سے کہا۔ ”اب آپ پولیس کو بلائیں اور ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں۔“

اسی وقت اس کے دونوں چوکیدار کمرے میں داخل ہوئے۔ راشد نے دھاڑ کر پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں سر گئے تھے؟“

”صاحب..... ان لوگوں نے امیر خان کو اندر بھیجنے کے بعد مجھ سے پا چاک حملہ کیا اور میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔“ چوکیدار نے لگا۔

”میں آپ لوگوں کو ان کے بارے میں اطلاع دے کر باہر نکلا تو کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کیا اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔“ دوسرے چوکیدار نے کہا۔ قابائیں اس کا نام امیر خان تھا۔

ابراہیم زبیر نے کسی کی آواز کی گئی۔ میں سمجھا کہ پولیس آ چکی ہے۔ راشد نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔

کمرے میں پولیس انسپکٹر کے پیچھے پیچھے تین کاٹشیل بھی تھے۔ اس کے علاوہ اس ایجنسی کے کارڈز بھی تھے جنہیں راشد نے طلب کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر شاید راشد کو پکچھا تھا۔ اس نے راشد سے ہاتھ لایا اور ایک نظر ان زخمی حملہ آوروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”راشد صاحب! کون ہیں یہ لوگ؟“

”میں نہیں جانتا۔“ راشد نے جواب دیا۔ ”میرے چوکیدار کو بے ہوش کرنے کے بعد زبردستی اندر داخل ہوئے تھے۔“ اس رسلان نے اس دوران موٹر سائیکل کی چینن اپنی کمرے باغھ کر اسے شرت کے پیچھے چھپا لیا تھا۔

”لیکن ان کی یہ حالت کیسے ہوئی؟“ انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا پھر وہ سکورٹی ایجنسی کے گارڈ کی طرف مڑا۔

”کیا ان کا یہ حال آپ لوگوں نے کیا ہے؟“

”ہر آدھی آپ کے ساتھ ہی پہنچے ہیں۔“ ایک گارڈ بولا۔

”ان کا یہ حال میں نے اور اس رسلان نے کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

انسپکٹر نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہاں میری موجودگی کا طلم نہ ہو۔ ”آپ کی تعریف؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا دوست عمران ہے۔“ راشد نے تعارف کرایا۔ ”اور یہ اس کا بھائی اس رسلان ہے۔ یہ دونوں ملاقات کے لیے میرے پاس آئے تھے کہ حملہ آور گھر میں گھس آئے۔“

”یہ سب کے سب کچھ بھی ہوں گے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی ہاں! ان چاروں کے پاس ریلاورز تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور آپ دونوں نے اس کے باوجود ان کا یہ خطرہ کر دیا؟“ انسپکٹر کے لیے جس حیرت سے زیادہ نظر تھا۔

”کیا تم آپس میں پھولوں کے بارے میں جانتے؟“ اس رسلان نے کہا۔ ”آپ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے کی بجائے یہ کس بحث میں الجھ گئے ہیں؟“

”ان چاروں کو گرفتار کرو۔“ انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”عمران صاحب! آپ لوگوں کو بھی پولیس اسٹیشن چنانا پڑے گا۔“

”وہ کس خوشی میں؟“ اس رسلان نے ترش لہجے میں پوچھا۔

”مجھے آپ لوگوں کے بیانات سے یقین نہیں ہو گا۔“ انسپکٹر نے سر دھجے میں کہا۔ ”ان لوگوں کا سیدھیکل چیک اپ کرانا ہو گا۔ ان کے جسموں پر شدید ضربات کے نشان ہیں۔ کسی بھی شہری کو قتل نہیں پہنچنا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے۔“

”چاہے کوئی اس شہری کا سر جسم سے علیحدہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لے؟“ اس رسلان کے لیے جس طنز تھا۔

”ڈرنا دھیان سے بات کر رہو؟.....“ انسپکٹر کا لہجہ درست ہو گیا۔ ”میرا نام اکرم خان ہے اور علاقے کے بڑے بڑے بد معاش میرے نام سے کانپتے ہیں۔“

”تو پھر ان لوگوں کو لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ یہاں کس کے کہنے پر آئے تھے؟“

”راشد صاحب!.....“ انپکٹر نے کہا۔ ”اچھے مہمانوں کو سمجھائیے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”ورنہ ہم تو لوگوں کو زبردستی بھی لے جاسکتے ہیں۔“

”میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا؟“ راشد بھڑکیا۔ ”کہ آپ میرے گھر میں بیٹھ کر میرے ہی مہمانوں کی توہین کریں؟“

”راشد صاحب! تمہارے تو آپ کو بھی چلنا پڑے گا۔“ انپکٹر نے مرو لہجے میں کہا۔

”آپ جلیں میں تمہارے پہنچنا ہوں۔“ راشد نے کہا۔

”آپ لوگوں کو کوئی میرے ساتھ حقانے چلنا پڑے گا۔“ انپکٹر نے کہا۔

”چلیے میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

ارسلان نے اپنی جیب سے تیل فون نکالا اور کسی کانبرش کرنے کے بعد بولا۔ ”یار ناصر! میں اس وقت سبھا کے ایک دوست کے گھر ہوں۔“ پھر اس نے مختصراً ناصر کو اس واردات کے بارے میں بتایا اور بولا۔ ”یہ انپکٹر صاحب! میں بیان لینے کے لیے تمہارے لے جا رہے ہیں تو ذرا انکل سے بات کرو..... جھامو موجود ہیں..... بااں میری بات کرنا.....“ وہ چند لمحوں تک تیل فون کا کان لے لگا لگا کر رہا۔

”او بھائی!.....“ انپکٹر نے کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا فالتو نام نہیں ہوتا کہ.....“

اس کا جملہ ادھر وارہ کیا۔ ارسلان نے کہا۔ ”السلام علیکم! انکل.....! میں ناصر بول رہا ہوں..... میں اس وقت..... اچھا ناصر بتا چکا ہے۔“ پھر انپکٹر کی طرف گھوما اور اس کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھ کر بولا۔ ”یہ کوئی انپکٹر اکرم خان ہیں بہت دیکھ پولیس آفیسر ہیں علاقے کے بڑے مسائل ان کے نام سے کاہتے ہیں انکل انکل.....! یہ تو مجھے انہوں نے خود بتایا ہے۔“ پھر اس نے تیل فون انپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ”بیچے انپکٹر صاحب بات کریں گے۔“

”اوئے یہ کیا کہناں ہے؟ تو سیدی طرح تمہارے چلتا ہے یا..... میرے پاس تیرے ماسوں اور چاچوں سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔“

”آپ بات تو کریں۔“ ارسلان نے کہا۔ ”یہ آپ کے بھی نامی ہیں۔“

انپکٹر نے تیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”بیلو۔“ انپکٹر اکرم خان اسپیکنگ..... جی..... میں سر..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ..... دوسری طرف آپ ہیں..... میں سر..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ..... اوکے سر.....“

دوسری طرف سے شاید سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ انپکٹر تیل فون ہاتھ میں پکڑے گا کہ کھڑا تھا بھرہ آہستہ بولا۔ ”جناب عالی۔“ آپ پہلے بتاتے کلاں پڑی آئی جی صاحب ہیں۔ سوری سر! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ڈی آئی جی کرشنر کے بیٹھے ہیں۔ درانی صاحب بہت ہی سخت گیر آفیسر ہیں۔ وہ..... نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“

”میں سوچ رہا ہوں ہے کہ ان کا پولیس آفیسر کتنا فرض شناس ہے۔“ ارسلان نے مٹری لہجے میں

کہا۔ ”اس کی فرض شناسی کا عالم یہ ہے کہ اس نے ذہنی ٹریننگ کو ابھی تک طبی امداد کے لیے اسپتال بھی نہیں بھیجوا یا ہے۔“

”ان کا خون بہہ رہا ہے انپکٹر۔“ میں نے کہا۔ ”اگر اس میں سے کوئی مر گیا تو اس کی ذمے دار پولیس ہوگی۔“

”آپ فکر مت کریں جناب عالی!.....“ انپکٹر نے کہا۔ ”میں اپنے فرائض سے واقف ہوں۔ ان لوگوں کو پہلے اسپتال میں بھیجواؤں گا۔“

اس وقت تک اس کے ہاتھ ان چاروں افراد کو پولیس موبائل میں منتقل کر چکے تھے۔

انپکٹر بھی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آپ لوگوں کے پاس جب بھی وقت ہو تمہارے آکر اپنے جانات قلم بند ضرور کرادیں اور ہاں وہ کالہ ضرب لیتے آئیے گا جس سے آپ لوگوں نے انہیں ڈھکیا ہے۔“

”ہم لوگ بغیر ہاتھوں کے تو پولیس اسٹیشن نہیں آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو انہیں ہاتھوں سے ڈھکیا ہے۔“

انپکٹر نے حیرت سے مجھ اور ارسلان کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں اور باہر نکل گیا۔

”یہ ناصر تمہارا کون سا دوست ہے ارسلان؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے بھی بتایا ہی نہیں کر ڈی آئی جی کرشنر کا بیٹا تمہارا دوست ہے؟“

”اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ میرے تمام دوست اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈی آئی جی کرشنر میں کیا گلگھر کشم اور ڈی کے ایک میجر جنرل کے بیٹے سے بھی میری دوستی ہے۔“

”سوری یار.....! راشد نے کہا۔ ”میری وجہ سے تم لوگوں کو ایک مرتبہ بھر تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں اس کے لیے شرمندہ.....“

”اب زیادہ بکواس مت کریا.....!“ میں نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں یہ تو بات کہ انکل اور آئی جی کہاں ہیں؟“

”ای اور بابا آج کل لاہور میں ہیں ورنہ تیرا خیال ہے کہ گھر میں اتنی دھماچوکڑی اور ہنگامے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتے؟“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”او کے یا بھڑ ملاقات ہوگی اور میری خواہش ہے کہ یہ ملاقات خوش گوار ماحول میں ہو۔ میں اتنی جلدی تم سے رخصت نہ ہوتا لیکن مجھے ابھی پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے۔“

”راشد بھائی! آپ اکیلے کیوں جا رہے ہیں؟ ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“ ارسلان نے کہا۔

”اے نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں کچھ لوگوں سے میری بھی شناسائی ہے۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو میں تم لوگوں کو حوضت ضرور دوں گا۔“

راشد نے جس بیگور بنی کپڑی کی خدمات حاصل کی تھیں وہ لوگ گھوم بھر کے اس کے نکلنے کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں راشد سے رخصت ہوا تو اس کے بارے میں بہت نگر مند تھا۔ یہ کون لوگ تھے جو اس کے پیچھے پڑ گئے

تھے؟ راشد کی بوٹس کے ذریعے یہ جاننا ضرور قانونی کام نہ جانے کب سے ہو رہے تھے؟ غمی تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کام میں راشد صاحب بھی میرے ساتھ ملوث ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر میں ان کی بوٹ کیسے استعمال کر سکتا ہوں؟

ارسلان بھی اپنی سوچوں میں گم تھا۔

”ارسلان.....!“ میں نے بس کہہا۔ ”تمہارا مخصوص ہتھیار مجھے اچھا لگا۔“

”آپ بایک کی چین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ واقعی بہت خوف ناک اور ہلکے ہتھار ہے۔“ پھر میں چونک کر بولا۔ ”میں تو

تمہیں عام سائیکل سیدھا سارا بڑا کہتا تھا، تم نے فائنک کہاں سے لے لے لی؟“

”جب آپ لکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں لکھ سکتا؟“ ارسلان بس کہہ لیا۔

میں نے کئی سال پہلے کرانے کا ایک کلب جوں کا تو تھا، متعدد شخص خوفزدہ رکھتا تھا۔ مجھے لڑائی پھڑائی سے

کبھی دیکھی نہیں رہی تھی۔ ہاں یہ بتانا چلوں کہ میں جو کام بھی کرتا ہوں اسے پوری توجہ سے کرتا ہوں۔ مگر انے

کے تمام کورسز پر بھی میں نے بہت محنت کی تھی، مجھے بھی بڑی باقاعدگی سے پٹرنگ و توش کے آدابوں کے

ایوانے لکھ کر پتھروں پر لکھ کر دیا تھا۔ ”کیا بات ہے عمران؟ مجھے تم خاصے پریشان لگ رہے ہو؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے ابو۔“ میں نے کہا۔ ”بس میں بہت تھک رہا ہوں۔“

حقیقت بھی یہی تھی میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے کھانا بھی اٹا سیدھا کھا لیا اور اپنے بیڈروم

میں چلا گیا۔

میں سوئے کی کوشش کرتا رہا لیکن کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے درد کر یہی خیال آ رہا تھا کہ غمی کے

تمام ناجائز کاموں کے لیے راشد کی بوٹ استعمال ہو رہی تھیں۔ وہ تو بہت آسانی سے سارا الزام راشد پر دھر

دے گا۔ مجھے تو یہ علم نہیں تھا کہ شہیدی کو کون؟ راشد کے رویے سے البتہ یہ ضرور ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ شہیدی کو

جاتا ہے۔ ان ہی خیالات میں جانے تک مجھے نیند آ گئی۔

اچانک کمرے کے مجھے سمجھو کر چکا دیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ارسلان کھڑا تھا۔ اس کے

چہرے پر وہ انیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بہت بولٹا ہوا تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا ارسلان؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”بھیا..... او..... راشد بھائی.....“

”کیا ہوا راشد کو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”راشد بھائی کا سر ڈر ہو گیا۔“

”کیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پلٹر سیدھا کر دیا ہو۔ ”کیا کہہ رہے ہو

تم؟“ میں نے ہڈیائی لہجے میں پوچھا۔ ”راشد کل سب کو بالکل ٹھیک تھا۔“ میں خرد کوئی غلط فہمی ہوئی

ہے۔“

”نہیں بھیا.....!“ ارسلان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی کی خبروں سے

معلوم ہوا ہے۔ میں نے مزید کنفرم کرنے کے لیے راشد بھائی کے کمرے کی طرف دھاوا دی۔ ”میں نے کچھ

نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ راشد بھائی کو آج صبح اس وقت لکھا گیا کہ اب وہ بھگ۔“

”اے کس نے قتل کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے کاروباری حریف تو تھے لیکن اہمال تو وہی لوگ مجھے اس کے ذمے دار لگ رہے ہیں نہیں

کل ہم نے پولیس کے حوالے کیا تھا۔“

میں جلدی سے اٹھا۔ بہت جگت میں تھم مڑھو یا اور کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔

لاؤنج میں ایذا کی وارشات اس قدر اتر رہے تھے۔

میں باہر کی طرف بڑھا تو ای نے کہا۔ ”عمران.....! بیٹا.....! ناشتا تو کر لو۔“

”مجھے بالکل ہوک نہیں ہے ای.....!“ میں نے کہا۔ پھر ان سے پوچھا۔ ”یہ ارسلان کہاں گیا؟“

”وہ بھی ابھی اچھی بایک پر نہیں نکلا ہے۔“ ابو نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی لکائی اور سیدھا راسٹہ کے کمرے پہنچ گیا۔ وہاں کپڑے بدل کر پولیس کا ایک پاسی بیٹھا تھا۔ میں نے

اندراجے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بتایا۔ ”اندراجے نہیں ہے راشد صاحب کا سر ڈر ہو گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اندراجے کے لازم تو ہوں؟“

”ان سب کو پولیس تیار کرنے لگی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھ کر پوچھا۔

”یہ تو آپ کو پولیس اسٹیشن جا کر یہ معلوم ہو گا۔“ اس نے سر دھجے میں کہا۔

میں نے اپنی گاڑی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

اسٹیکو اکرم خان حسب معمول علاقہ گشت پر تھا۔ پولیس اسٹیشن میں صرف دو سپاہی دروہوں میں اور دو آ دی

سادہ لباس میں موجود تھے۔ ان کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی پولیس کا تشکیل ہیں۔ ان چار کے

علاوہ ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔

مجھے اس نے انتہائی رنج سے دیکھا اور دشت لہجے میں بولا۔ ”فرماؤ کس سے ملنا ہے؟“

”کیا تربیت کے ساتھ ساتھ تمہیں اس اکڑ انداز میں بولنے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ مجھے گور کے پہلے سے زیادہ رکشت لہجے میں بولا۔

”مطلب یہ کہ تم لوگ عام انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتے؟“

”اوئے..... زیادہ بتی پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر کہہ لیا۔ ”کام کیا ہے؟“

”مجھے اسپیکر وکر مہمان سے ملنا ہے۔“ میں نے بھی دشت لہجے میں کہا۔

”وہ اس علاقہ وقت گشت پر ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کیا منتری نے آپ کو بتایا نہیں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے انداز میرے لیے تیر سمجھو۔ ”اس سے کہو کہ وہ پولیس

اسٹیشن پہنچے۔“

میرے پر اعتماد لیجئے میں ہیڈ مقرر کچھ گھبرا گیا لیکن آدمی کما کما قہاں لے کر وہاں اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور بولا۔ ”جب آپ کو معلوم ہے تو مجھے یہ کیا پوچھ رہے ہیں کہ صاحب کہاں ہے؟“
”اے ابھی اور اسی وقت بلاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں نام سے پوچھ رہا ہوں ہاں بلاتے ہی یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے اے یہاں بلاؤ۔“

”تم ہو کون؟“ وہ اچانک بلند آواز میں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا انہیں خان کی گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہیڈ مقرر کا کمرہ سامنے ہی تھا اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا میرے پاس پہنچا اور بولا۔ ”مزر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے۔“

”آپ کمرے کی بات کر رہے ہیں آپ کا ہیڈ مقرر نے تو مجھے کوکری تک نہیں دی۔“ میں نے کہا۔

”سہجی آپ..... تو بتایا ہی نہیں کہ آپ.....“

”بس کرو اے.....“ انہیں نے اس کی بات کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ ”مزر آپ میرے ساتھ

آئیں۔“

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے پہلے مجھے کرسی پیش کی پھر خود بیٹھا۔ عام پولیس اسٹیشن کے برعکس اس کا کمرہ آزاد آراستہ تھا۔ ٹیبل بھی جدید طرز کی اور یو لوگ جیٹر بھی خاصی قیمتی تھی۔ کمرے میں لیور کوئلہ سوئچ بٹ بھی موجود تھا۔

میں نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”واہ انسپٹر صاحب! آپ کا آفس تو بہت شاندار ہے۔ لگتا ہے سرکار اب پولیس پہ بھی خرچ کرنے لگی ہے۔“

”ارے نہیں صاحب.....“ اس نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تو میں ذاتی طور پر کیا ہے اپنی جیب سے۔“

”آپ کی جیب میں تو ماشاء اللہ بہت برکت ہے۔“ میں نے طنز سے لیجھ میں کہا۔ ”آپ کی گاڑی بھی پندرہ سو لاکھ لکھ روپے سے کم نہیں ہوگی۔“

”مزر..... وہ تو میں نے بیک سے لیز پر لی ہے۔“

”دیر کی گئی.....“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی افلاحت بھی تقریباً بیس سو ہزار تو ہوگی۔“ میں نے اچانک درخت لیجھ میں پوچھا۔ ”آپ نے راشد کے ملازمین کو کیوں گرفتار کیا ہے؟“

”میں نے انہیں شامل تفتیش کیا ہے۔“ انسپٹر بھی شیدہ ہو گیا۔ ”دیکھیے، تفتیش کا ہمارا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ سر ڈارورڈ کیتھون کے کیسوں میں عام طور پر گھریلو ملازمین بھی ملوث ہوتے ہیں۔“

”راشد کا مزر میرے خیال میں گھر سے باہر زد کی پارک کے نزدیک وہاں ہے جو اس کے گھر سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا؟“

”جی ہاں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن گھر کا کوئی بھی ملازم قاتل کو سہ دے سکتا ہے کہ مقتول اس وقت کہاں ہے؟“

”آپ نے راشد کے والدین کو اطلاع دے دی ہے؟“ میں نے انسپٹر سے پوچھا۔

”جی ہاں انہیں تو مزر کے فوراً بعد اطلاع دے دی گئی۔ وہ دو گھنٹے میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ویسے کچھ معلوم ہوا کہ راشد کے قاتل کون لوگ تھے؟“

”اس واقعے کا کوئی شہیدی ابھی سامنے نہیں آیا۔ پولیس اسٹیشن پر صرف ایک ٹیلی فون موصول ہوا تھا کہ ڈینس ٹیئر ایک پبلک پارک کے پاس ایک مزر رہو گیا ہے۔ ہم لوگ موقع پر پہنچے تو راشد کی ڈیوٹی باؤی وہاں موجود تھی۔ اس کے سینے پر کھانکھانک گولیوں کا پورا برست مارا گیا ہے۔“

”ویسے میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ راشد کے تمام ملازمین بہت پرانے تھے۔ میں بھی انہیں راشد کے گھر میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ان پر ہاتھ زور لگایا کر کے گا۔“

انسپٹر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میرے تیل فون کی کتل بجی گئی۔ ”اگر یہ ارباب کا نام تھا۔ میں نے شن بتا کر تیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ”السلام علیکم اچھی ابو؟“

”معران بیٹا.....“ ابو کی آواز میں گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔ ”فورا گھر پہنچو۔“

”خبر یہ تو ہے ابو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس تم فوراً گھر پہنچو۔“ ابونے بولا ہی آدمی آواز میں کھلا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

انسپٹر انہیں خان بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں اٹھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ”خبر یہ تو ہے جناب؟“

”ہاں خبر یہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں راشد کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو مجھے ضرور انعام کیجیے گا۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

پھر میں انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا۔

ابو اور امی لاؤنج روم میں موجود تھے۔ ابو کی حالت بہت اتر تھی۔ میں نے تشریف لے کر پوچھا۔ ”کیا ہوا ابو! خبر یہ تو ہے؟“

ابو مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگے۔

”ابو.....! بھئیے تباہ کیا بات ہے؟“ میں امی سے مخاطب ہوا۔ ”امی!..... آپ ہی بتائیں؟“

امی کی حالت تو پہلے ہی تباہ تھی ان کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں ابو بال بھرے ہوئے تھے۔ میں نے بھی انہیں اس طے میں نہیں دیکھا تھا۔

”آپ لوگ بولنے کیوں نہیں؟“ میں نے بیانی انداز میں کہا۔ ”آزم خرہ کیا ہے؟“

اسی وقت عدنان بھاگتا ہوا آگیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ”بھیا.....! وہ لوگ شائستہ باجی کو لے گئے.....“

”کون شائستہ کو لے گیا؟“ ہم کچھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔

”ہاں بیٹا.....“ ابونے متحیل کر کہا۔ ”انہوں نے پہلے چوکیدار کو بے ہوش کر کے ہاتھ باندھ کر نکلے

ہوئے اندر آئے اور تمہارے اور ارسلان کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران خانساں نے مزاحمت کی کوشش کی تو ان لوگوں نے انہیں گتے بٹ مار سکے۔ ابھی بے ہوش کر دیا۔“

”میں اس سے ایک نے شائستہ باجی کا ہاتھ پکڑا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں نے انہیں چھڑانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے میرے سر پر بھی کھانکھانک گولیوں کا پورا برست مار دیا۔“

دھکا دیا اور شائستہ باجی کو کھینچے ہوئے باہر لے گئے۔
 ”کون لوگ تھے وہ؟“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”کس کی اتنی جرات ہوئی کہ ہمارے گھر کی طرف میزبانی آگھ
 سے بھی دیکھ سکے؟“

”وہ جانتے جاتے کہہ گئے ہیں کہ جب تک اسرمان اور تم خود کو ان کے حوالے نہیں کرو گے وہ شائستہ کو نہیں
 چھوڑیں گے۔“

”کس کے حوالے کریں؟“ میں نے پھر چیخ کر کہا۔ ”انہوں نے کوئی پتہ تو بتایا ہوگا؟ کوئی نام تو بتایا
 ہوگا؟“

”میں نے پوچھا۔“
 ”وہ کہیں شہید کا نام لے رہے تھے۔“ ابو نے کہا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ وہ خود ہم سے رابطہ کریں گے۔ تم
 دونوں کے علاوہ انہیں ہم سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا ہے۔“

”اب کیا ہو گا بیٹا؟“ امی نے بری طرح بکلتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ میری پھول سی بچی کے ساتھ نہ جانے کیا
 سلوک کریں گے؟“

”خوش رہیں امی!“ میں نے کہا۔ ”وہ لوگ کچھ بھی نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا لیکن مجھے اپنے الفاظ خود
 بھی کھوکھلا کر رہے تھے۔ ”اسرمان کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ان ہی لوگوں کے پیچھے گیا ہے۔“ امی نے روتے ہوئے کہا۔
 ”کیا؟“ میں بوکھلا کر پوچھا۔ ”وہ ان کے پیچھے کیسے چلا گیا؟“

”جب وہ گر پڑا تو ان لوگوں کو یہاں سے نکلے ہوئے مشکل سے دو منٹ ہوئے ہوں گے۔ وہ اس وقت
 اپنی بائیک پران کے پیچھے روانہ ہو گیا۔“

”اسرمان بھی انتہائی درجے کا قاتل اور جڈہ باقی ہے۔“ میں نے ہنسنے لگا۔ ”ان کے پیچھے جانے کی کیا
 ضرورت تھی؟“

”بیٹا!..... تم اس کا مزاج جانتے تو ہو۔“ امی نے کہا۔ ”یہ بھی جانتے ہو کہ وہ شائستہ پر جان چڑھتا ہے۔ وہ
 بھلا ہماری بات مانتا؟“

”آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟“ میں نے کہا۔
 ”ہاں میں نے بعد میں پولیس کو ٹیلی فون پر انعام کر دیا تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔“

”اب میں اس اسرمان کو کہاں ڈھونڈوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔ اس کی وجہ سے تو دہری پریشانی
 کھڑی ہوئی تھی۔ اس اسرمان جڈہ بات میں نہ جانے کیا کر بیٹھتا؟

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف میرے بہترین دوست کا مرڈر ہو گیا تھا۔
 اس کے والدین بھی اب تک کراچی پہنچے نہیں ہوئے گئے۔ دوسری طرف میری پھول سی بہن ان درندوں کے قبضے

میں تھی اور اب مصیبت یہ تھی کہ اسرمان بھی ان لوگوں کے تعاقب میں گیا تھا۔ کئی دفعہ گاڑی تک گیا
 پھر واپس آ گیا۔

دروازے پر پولیس کی موٹاں دین آ کر رہی اور اس میں سے ایک سب انسپکٹر اور چار سپاہی نکلے جیسے
 آغوا کشندگان ابھی تک گھر میں موجود ہوں اور وہ ان کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان لوگوں نے یوں بند ویش

قام کر رکھی تھی جیسے مجاز جنگ رفوچی دشمنوں کی گھات میں آگے بڑھتے ہیں۔

”کون ہے؟ کہاں ہے؟“ سب انسپکٹر نے یوں پوچھا جیسے مجرم اس کے سامنے یا کہیں موجود ہے۔
 ”آپ تو انہوں میں پہنچ گئے آفیسر؟“ میں نے طنز سے کہہ دیا۔ ”آپ کی سروس تو لا جواب ہے۔“

”آپ مجھ پر طنز فرما رہے ہیں؟“ سب انسپکٹر نے درشت کہہ دیا۔
 ”میں تو آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔ واردات کو صرف ایک گھنٹہ چار گھنٹہ مٹا کر رہے ہیں اور آپ اسے

مختصر وقت میں چلے آئے؟“
 ”ہم کوئی فائرنگ نہیں بیٹھے ہیں۔“ سب انسپکٹر نے تنہی سے کہا۔ ”ہمارے پاس صرف دو موٹا سلیں

ہیں اور قاتل کی فہرست بھی کم ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”اب اس بات سے ڈو آگیا کچھ لے گئے ہیں؟“
 ”ڈو آگیا میرے گھر کی عزت لے گئے ہیں میری بہن کو لے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا عمر بھی مقرر کی؟“
 ”تیس سال؟“ ابو نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ جوان العزاد اور باغ ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔
 ”تو پھر؟“ میں نے کہا۔ ”وہ کہیں گم نہیں ہوئی ہے کہ راستہ ڈھونڈ کر گھر آ جائے گی۔“ میں نے طنز سے کہہ

دیا۔
 ”کسی لڑکے کا چکر بھی تو ہو سکتا ہے؟“ سب انسپکٹر کیوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے سر دھکے میں پوچھا۔
 ”میرا مطلب ہے کہ اس نے کسی کے ساتھ کرنا پڑے انوکھا ڈراما رچایا ہو۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”آج

کل کی لڑکیاں.....“
 ”بکواس بند کرو۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔ ”تم قہقہے کر رہے ہو یا ہماری عزت پر کچھ اچھا رہے ہو؟“

”اڈو آرام سے اٹھو۔“ سب انسپکٹر نے اسلی لے کر پوچھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی خود ہی گھر سے
 بھاگی ہو اور تم لوگ اپنی عزت بچانے کے لیے اسے اغوا بنا کر پھینک کر رہے ہو؟“

میں نے آگے بڑھ کر اپنا ایک انسپکٹر کا کر بیان پکڑ لیا اور اس کے چہرے پر دوسرے ہاتھ سے پھرمارنے ہی
 والا تھا کہ ابو نے جھٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ ”ہوش سے کام لو عمر!..... ایہ تم کیا کر رہے ہو؟“

میں نے جھٹکنے سے اس کا بیان چھوڑ دیا۔
 سب انسپکٹر غصہ ہانک لے کر بولے۔ ”گھر غرق کر لو اسے..... میں اس سے قاتل لے جا کر پوچھ گچھ

کروں گا۔ بہت کڑی چٹائی ہے اسے۔ بڑی جان بانی ہوئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو کتنا عزت دار ہے؟“
 ”اچھے بیٹے کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں آفیسر!.....“ ابو نے کہا۔ ”میں غلطی ہوئی جاتی ہے۔“

”آپ سچے میں بولو بڑو کرو۔“ سب انسپکٹر نے انہیں جھڑک دیا۔ ”انسان غلطی کرتا ہے تو اسے سزا ہی
 ملتی ہے۔“ سب انسپکٹر کے چہرے پر رنج و غصہ تھی۔ ”حوالات کی ہوا کھانے کا تو غلطیاں کرنا معمول جانتے گا۔“

”ابو!..... آپ کے پاس اسرمان کے دوست کا ممبر کارڈ ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بیٹا!..... اس کے دوستوں سے براہ کرم ایک حلق؟“ ابو نے کہا۔ ”ہاں! سچ وہ جانے سے پہلے اپنے کسی دوست

سے بات کو کر رہا تھا شاید اس نے ناصر ہی کا نام لیا تھا۔ ناصر کی کال لیڈر لائن پر آئی تھی۔" بولنے کہا۔ "ہاں اس کا نمبر شاید اب بھی محفوظ ہو؟"

"او بھائی!....." سب انکپٹر نے کہا۔ "جلدی کر ہمارے پاس زیادہ نام نہیں ہے۔"

عدنان ٹیلی فون سیٹ میں غبر کھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھیا..... لیڈر لائن پر ج سے صرف تین کا نمبر ریسو ہوئی ہیں۔"

"تم ان تینوں پر بڑائی کر دو اور ناصر کو تفصیل سے سب کچھ بتا دو۔ اس کا سیل نمبر بھی لینے کی کوشش کرنا۔"

"او..... تو خود چلے گیا کچھ جھڑپی پہنا کر لے جاؤں؟ کسی باوردی پولیس افسر پر ہاتھ اٹھانے کی سزا معلوم ہے کچھ؟"

"چلو۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ ہماری پولیس کتنی فرض شناس ہے؟" پھر میں عدنان سے بولا۔ "تم ناصر کو ٹیلی فون کر دو اور سب کچھ بتا دو۔" یہ کہہ کر میں پولیس کی مہربان دینی کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے سپاہیوں نے یوں گھیر لیا جیسے انہوں نے کوئی انتہائی خوف ناک قسم کا اشتہاری ملوم پکڑ لیا ہے۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ سب ایک راشد کے والدین ہیں اور سے کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔ ایسے موقع پر میرا ان کے پاس ہونا بہت ضروری تھا لیکن یہ "فرض شناس" افسر مجھے پولیس اسٹیشن لے جا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں سیل فون پر راشد کے ڈیڈی سے بات کر لوں اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دوں ورنہ یہ ہی سمجھے کہ میں جان بوجھ کر راشد کی تدفین میں نہیں آیا۔

میں نے جب سے سیل فون نکالنے کی کوشش کی لیکن میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا اور ان میں سے ایک انتہائی اگڑے لکچے میں بولا۔ "پنے ہاتھوں کا قابو نہ رکھو اور خاموشی سے بیٹھا رہو۔"

ان میں سے ایک نے میری شرٹ کا کالر پکڑا اور دوسرے نے میری بیجوں کی تلاش کے کران میں سے میرا پرس ڈونٹنگ کارڈز نوڈلڈر سرگٹ کا پکٹ اور میرا قیمتی سیل فون نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے بھنا کر بولا۔

جواب میں میری دائیں جانب بیٹھے ہوئے پولیس والے نے میری گردن پر ایک ہاتھ جما دیا اور بولا۔ "آرام سے بیٹھا اور گھومنا بند کرو۔"

زندگی میں کسی میری اتنی ذلت نہیں ہوئی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان سب پولیس والوں کی گردنیں توڑ دوں لیکن میں نے بہت مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے اتنی دفعہ میرے منادوں گردن پر چھڑ ہمارے کہ میرے ممبر کا پتا دلبریز ہو گیا۔

میں نے سچہ کر کہا۔ "اب اگر کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔ قانون کے احترام کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"اچھا..... ایک پولیس والے نے مڑے یہ لکچے میں کہا اور میرے منہ پر چھڑ مارا لیکن میں نے اس کا ہاتھ معذبوٹی سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنا زور دیا کہ چھڑ مارا اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت سوبائس پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ مجھ سے مار کھانے والے نے مجھے دین کے دروازے کی طرف دھکا دیا اور پیچھے سے ایک زوردار لٹ میری گردن پر جڑ دی۔

میں اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اووندے منہ فرش پر جا کر۔ فرش پر گرنے سے میری ناک اور ایک گال زخمی ہو گیا۔

"یہ قرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا مجی....." مار کھانے والے سپاہی نے سب انکپٹر سے کہا۔ "اس نے مجھ پہ حملہ کر کے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"مے جھکڑی لگا دو اور لاگ اپ میں بند کر دو۔ میں ابھی اس کی ساری گرمی نکالا ہوں اس کی تو....." سب انکپٹر نے وزنی کی ایک گال لٹھا کہتے ہوئے کہا۔

ان لوگوں نے مجھے جھکڑی تو تھیں لیکن ان کی باتوں اور گھونٹوں سے مجھے مارنے ہوئے لاگ اپ تک لائے اور اس کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دیکھ لیا۔

"اچھی تو کچھ آرام کر لے۔" سب انکپٹر نے کہا۔ "مجھ سے تو میں رات کو نٹوں گا۔"

حالات میں اس وقت دفر اور اجود سوئے، ہوا اپنے لباس اور چہروں سے عادی جرم گرم رہے تھے۔ ان کا اطمینان دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات ان کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد وہ دونوں کسک کسک میرے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "جہیں کس جرم میں لائے ہیں یہ لوگ؟"

"انٹوں تو مجھے یہ عی ہے کہ میں نے سوائے ایک جرم کے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" میں نے تلخ لکچے میں کہا۔ "میں نے پولیس کے سب انکپٹر کا گریبان پکڑ لیا تھا اور ابھی پولیس اسٹیشن آئے ہوئے ایک سپاہی کو چپا ہے۔"

"یہ کام تو تم نے بہت نیک کیا ہے لیکن اس کے بدلے میں یہ لوگ تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔"

"دیکھا جائے گا....."

"وہی تم اپنے کپڑوں اور چہرے سے تو شریف آدمی لگ رہے ہو۔" دوسرا حلالی بولا۔ "پولیس سے مار پٹنے کی بابت کیوں کہتی؟"

میں نے مختصر سے بتایا کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں جان بوجھ کر ہاں دیا لیکن باتوں میں لگا رہا تھا تا کہ میرے ذہن میں شائستہ کے بارے میں راشد کی تدفین کے بارے میں کوئی خیال نہ نہ۔

اجا ک سلاخوں کے پاس مجھے عدنان کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ ستاہو تھا اور وہ برسوں کا پتلا لگد ہا تھا۔

"کیا ہوا عدنان.....؟" میں نے پوچھا۔

"ناصر بھائی تو کسی برس ٹرپ پر سگرا گئے ہوئے ہیں اور ان کے والد اس آباد میں ہیں۔ میں نے ٹیلی فون پر یہ سوکر نے والے لزام سے بہت کہا کہ مجھے ناصر بھائی ان کے والد کا سیل نمبر دیکھیں وہ کسی صورت نہیں مانا۔" پھر وہ پرتوش لکچے میں بولا۔ "سب کیا ہو گیا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" اور تم بھی بہت ہارو کہ تو اب وادری ان کو کون سنبا لے گا؟" پھر میں چونک کر

بولاً۔ ”اور سلاخ کہاں ہے؟“

”اور سلاخ بھائی تو انہی تک واپس ہی نہیں آئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کا سبب پھر لاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ان کا سبب فون آف ہے۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں گزشتہ آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”چل بھئی اب جا۔۔۔“ سنتری نے سلاخوں کے پاس آکر عدنان سے کہا۔ ”صاحب آگیا تو میری مصیبت آجائے گی۔“

”اس ایک منٹ اور۔۔۔“ عدنان نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ”راشد بھائی کے ڈیڑی اور ای لاہور سے آگئے ہیں۔ میں نے انہیں بھی فون کر دیا ہے۔ اب اور ای راشد بھائی کی تدفین میں جارہے ہیں۔“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”بھیا! آپ پریشان مت ہوں۔ ابو نے اپنے جانے والے افراد کو ٹیلی فون کیے ہیں۔ ابھی تو وہی دیر میں یہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے۔“

سنتری نے اسے ایک مرتبہ پھر کوا تو وہاں سے چلا گیا۔

”اب بھائی!۔۔۔“ ارات سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“ حوالا تین میں سے ایک بولا۔ ”مات کو سب انسپکٹر فزڈگری استعمال کرتا ہے اور اس کا ایک خاص آڈیو محمد علی خان اس میں ماہر ہے وہ تو پورا پلا پلا سا ساڑ ہے۔“

”دیکھا جائے گا۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے ایک دفعہ پھر نگہرات اور امدادیوں نے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے شائد کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی؟ ان خالوں نے اس کے ساتھ ہی سلاخ کیا ہوگا؟ اس کے ساتھ ہی مجھے اور سلاخ کی لنگری نہ جانے وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟ کہیں وہ ان جرائم پیشہ افراد سے ایسا کیسی نہ بھڑ گیا ہو؟ وہ خاصا جذباتی تھا اور بات بات پر آپ سے باہر ہو جاتا تھا یہ تو پھر اس کی لاڈلی بہن کا حال تھا۔

میں اب دوسرے حوالا تین سے بات نہیں بھی کر رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن جب میری طرف سے انہیں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ کہتے ہیں کہ جب مصیبت آتی ہے تو اپنے ساتھ اور بہت سی مصیبتیں لے کر آتی ہے۔ راشد کے کل پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا میں کیسا بے مروت دوست تھا کہ اپنے دوست کی آخری رسومات میں شرکت بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے یہاں آئے گی کتنے روپیچے تھے اب تک تو راشد کی تدفین بھی ہوگئی ہوگی۔ ان ہی خیالات میں گم نہ جانے کہ میری آنکھ لگ گئی۔ آتی ہوئی سردیوں کا موسم تھا اور لاک اپ کے سلاخوں والے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔

میں فیندے جھوٹے میں ایک طرف لڑکا تو میری آنکھ کل گئی۔ کمرے میں بہت ہی مدوق سی روشنی والا ایک بلب روشن تھا جو اس سین زدہ کمرے کی تاریکی دور کرنے میں ناکام تھا۔ پولیس والوں نے تو میرے ہاتھ سے گزری تھی اتار لی تھی جس سے مجھے دقت کا اندازہ ہو سکا لیکن پولیس انجین کے سکوت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رات خاصی بیت چکی ہے۔

اب تک تاریک کارڈرو میں ہماری جوتوں کی دھمک سنائی دی پھر کوئی بہت ہی طرح کھانسا۔ قدموں کی آہٹ سلاخوں والے دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ سلاخوں کے پیچھے مجھے ایک سنتری کا منہ چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے کچھ دھڑکے والے ایک اور سنتری تھا۔

ان لوگوں نے پرشور انداز میں لاک اپ کا دروازہ کھولا تو دوسرے دونوں حوالا تین جو گہری نیند میں تھے بڑبڑا کر اٹھ کھڑے۔

دونوں سنتریوں میں سے ایک سنتری اندر آگیا اور اس نے بہت بھرتی سے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور دلفری آواز میں بولا۔ ”چل بھئی تجھے ذرا باہر کی سیر کرالائیں۔ جب سے آیا ہے اسی طرح بیٹھا جمول رہا ہے۔“

اس نے ہتھکڑی میں بندھی ہوئی زنجیر کا سرا بہت بے دردی سے کھینچا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زمین پر ایک ہی زاویے سے بیٹھ رہنے کی وجہ سے میرے پیڑ اکڑ کر رہ گئے تھے۔ اس نے مجھے کھینچا تو میں سنبھلنے سنبھلنے بھگی پڑا۔

میں نے گزشتہ رات کو انسائیڈ ہاکھانا کھا نا کھا یا تھا۔ اس کے بعد سے ایک کھیل بھی اڑ کر میرے من میں نہیں گئی تھی۔ وہاں رکھا ہوا پانی کا کٹکا بھی اتنا غلیظ تھا کہ اس سے پانی پیچے ہوئے کٹھے کراہت محسوس ہوئی کہ اس لیے میں نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ میں بھوک سے تو خراب حال تھا۔ یہاں اب جب سے ملحق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

وہ لوگ مجھے کھینچتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گئے۔ اس کا کراہاؤالات سے خاصے فاصلے پر تھا۔

وہاں تو اس وقت گویا دن تھا وال کلاک پر میری نظر پڑی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس میں ایک نیا رہا تھا۔

ایس ایچ او کے کمرے میں بھارت بھارت کے ٹی وی ڈیسی تھے۔ ان میں پھر پٹران کے کواہن تھے وہ تین وہی تھے جنہیں میں نے ان کے کالے کالوں کی وجہ سے پہچانا۔ ان کے منہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی کسی جرم کے انزام میں مل کر پھانسی دلائے گئے ہوں۔

ایس ایچ او بھدے کا قہقہہ صورت آدی تھا۔ وہ اس وقت دروی کی بجائے شلوار قمیص میں تھا۔

سنتری نے مجھے اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔

”یہ کون ہے بھئی؟“

”یہ عمران ہے سیر۔۔۔“

”اچھا اچھا یہ دوسرا ہے جس نے پولیس کے ایک انسپٹر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور پھر فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کے ایک ایسا لڑکا زخمی کر دیا؟“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بھئی بڑی چلبی چڑھی ہوئی ہے تجھ پر تو کیا پولیس کو بھی اپنا ناکوئی کھریلو لازم سمجھتا ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تو شکل سے تو مجھے خریف آدی لگا ہے؟“ اس نے مسکھتے خیر لہجے میں کہا۔

”فکل پمٹ جا میں جتنا پیو مانی۔۔۔“ وہاں بیٹھے ہوئے ایک آڈی نے خوشامدی انداز میں کہا۔ ”فکل

سے بھو لے بھالے نظر نہ والے سی تو ڈسے بھرم ہوتے ہیں۔“

میں نے گھر کو بولنے والے کی طرف دیکھا وہ مجھے ہی سے پولیس کا تہذیب رکھتا تھا۔

”مجھے ایک گلاس پانی مل جائے گا؟“ میں نے تجحف آواز میں کہا۔

”پانی کیوں پتر؟“ میں اس اچھوٹے لڑکے کے ہنسنے پر حیرت محسوس کرتا ہوں۔ ”میرے پاس کتنی باتیں ہیں۔“ پھر وہ رات ہی پولیس والوں کے انداز میں بولا۔ ”مجھے اپنے جرم کا اعتراف بھی ہے؟“ ہم اپنی جان جو کسم میں ڈال کر دن رات تم لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں اور تم میری لوگوں پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟“

”میری بین انگوٹھی ہے سر۔“ میں نے کہا۔ ”وہ اس آئی ڈی تیش کرنے کی بجائے ہم ہی سے ایسا سلوک کر رہا تھا جیسے اس واردات کے ذمہ دار ہم ہی ہوں۔“

”پولیس کی تیش کا ایک انگڑا ہوتا ہے اب تم ہمارے کہنے پر تو نہیں چل سکتے؟“ میں اس اچھوٹے لڑکے کو دھمکا رہا تھا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

چاہیے ہے۔“

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس آئی ڈی تیش کی بین کو بدل چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

تو برائے نام راسخا تھا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کہا: لاکھایا۔ اس دوران میں اس نے احمد دین سے چائے بھی منگائی تھی۔ وہ اپنے خیال میں مجھ پر نوکریٹ کر رہا تھا۔ آخر اس پچاس لاکھ میں اس کا حصہ بھی تو ہوگا۔ کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں عادی سگریٹ نوش تو نہیں تھا مگر اس کے بعد اس سگریٹ نوشی کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت تو سگریٹ بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میرے جسم میں گویا بے توانائی آگئی تھی جسے میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ میں نے سگریٹ ختم کی تو اس نے مسکرا کر کہا: ”اب آپ کمرٹی فون کریں اور کیش منگائیں۔“ میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اؤ میں سمجھا“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”آج کل کمرش میں اتنا کیش کون رکھتا ہے؟ پھر ایسا کریں آپ چیک منگا لیں اور میں آپ کے سونے کا پتیل بندوبست کر دوں گا۔ آرام سے سوئیں، صبح چیک کیش ہوئی ہے آپ کمر جا سکتے ہیں۔“

”یہ جرم باز کیا سرکاری خزانے میں مل جائے گا؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے جرم باز تو سرکاری خزانے میں ہی جاتا ہے۔“

”آپ لوگ..... میرا مطلب ہے کہ اس اناج اور صاحب مجھے اس کی رسید دیں گے؟“

”کیوں نہیں دیں گے جناب؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”صاحب آپ کو بئی رسید دیں گے۔“

”کرم علی صاحب“ آپ مجھے کوئی چھاپی ہوئی والا بھروسہ ہے؟ میں نے پوچھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے تمام جرمائے کورٹ کے ذریعے سرکاری خزانے میں جاتے ہیں۔ اس اناج اور صاحب جرم باز لگانے والے کون ہوتے ہیں؟ ان کا کام تو صرف کورٹ میں پکس نہیں کرنے کا ہے۔ باقی کا کام کورٹ ہے؟“

”عمران صاحب“ ہم آپ کو کورٹ پھری کے پکری سے توجہ دیا جاتے ہیں۔ وہاں ہفتوں تو تاریخ پڑے گی۔ کورٹ کا خرچہ ہوگا، وکیل کے اخراجات ہوں گے۔ آپ صرف آدمی ہیں آپ کا شقی وقت بھی ضائع ہوگا اس لیے۔“

”مردی۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس قسم کے کسی بھی جرمائے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

کرم علی نے فیرت سے مجھے دیکھا۔ ”گوپا! انکار ہے؟“

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ پولیس قانونی کارروائی کرے اور مجھے کورٹ میں پیش کر دے۔“

”آپ جرم باز نہیں دیں گے؟“ کرم علی کا لہجہ بدل گیا۔

”میں رشوت نہیں دوں گا.....“ میں نے کہا۔ ”رشوت کو جرمائے کا نام نہیں دیں۔“

”احمد دین.....“ کرم علی نے پتھلا کر بانگ لگائی۔ ”اسے صاحب کے پاس لے چلو۔“

احمد دین نے میری ہتھکڑی کی زنجیر کوئی کی گول سے کھلی اور اس مرتبہ بہت انسانیت سے مجھے اس اناج اور کے کمرے میں لے گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کرم علی کی مجھ سے ڈیل ہو چکی ہے۔ میں کھانا کھا چکا تھا چائے اور سگریٹ بھی پی چکا تھا اس لیے اس کی نظروں میں محزون تھا۔

میں دوبارہ اس اناج اور کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسی سب انسپٹر کے ساتھ بیٹھا تھا مجھے گرفتار کر کے لایا

تھا۔

”جی عمران صاحب! ہمیں اناج اور نے کہا۔“ بات سمجھ میں آگئی آپ کے؟“

”نہیں سرجی۔“ کرم علی نے کہا۔ ”اس نے کوئی بھی بات ہمارے اسے لگا کر دیا ہے۔“

”جی ایسا کریں.....“ ہمیں اناج اور نے کہا۔ ”جرمائے کی رقم کمرے میں کر دیں۔“

”تمیں لاکھ.....“ میں نے پوچھا تو اس اناج اور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمیں لاکھ تو دور کی بات ہے نہیں تو اس سلسلے میں تمیں روپے بھی نہیں دوں گا۔“

”تو خود کو بھینسا کیے ہو اے؟“ ہمیں اناج اور گرج کر بولا۔ ”نڈر علی.....“ اس نے سب انسپٹر سے کہا۔

”ذرا اس سہان داری کی ایک جھلک دکھا دو۔ ایک ہی رات میں اس کی سب ہتھکڑی نکل جائے گی۔“

ہمیں آئی نے مجھے یوں دیکھا جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میں کتنا تنہا درواخت کر سکتا ہوں پھر اس نے کرم علی سے کہا۔ ”ذرا احمد خان کو بھیج دو۔“

احمد خان شاید وہی آدمی تھا جس کا ذکر حوالا میں نے بھی کیا تھا۔ کرم علی خاموشی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لہجہ دار ”میں نے دن کا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دھوکا دینے کی کوشش کی اور جسم کے اوپر ہی صبر فرمیں۔ شاید وہ کس میں اس نے صاحب کے کمرے میں آنے کے لیے پہنچی تھی۔ اسے غالباً تیندے بچکا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور میں خند کا غبار تھا۔

اس نے مذہب انداز میں کہا۔ ”کشم جناب عالی۔“

”احمد خان.....“ ہمیں آئی نے کہا۔ ”ذرا اس بندے کی اور بالنگ کرنا ہے۔“

”اس سے کچھ اگلا ہے سر؟“ احمد خان نے یوں پوچھا جیسے ملکیت گاڑی دیکھ کر پوچھتے ہیں کس کی سروس کرانی ہے یا پھر انجن میں کوئی فائل ہے؟

”تمہاں داری شروع کر میں ابھی آ کر اس سے خوب کچھ اگلاؤں گا۔“

احمد خان نے ایک میرے بال پکڑ لے اور آئیں دو دروازہ جھکا کر بولا۔ ”جیل بھی..... ذرا تیری سروس کر دیں۔“ وہ مجھے اسی حالت میں سمجھتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں عجیب و غریب ساز و سامان تھا۔ اس میں پانی کی ادھی اور مری ہوئی بالیاں تھیں ڈھڑے سے تھوڑے جیسے اور عجیب و غریب قسم کے گھڑی کے کھانچے تھے۔

”احمد دین.....“ احمد خان نے کہا۔ ”پہلے اسے ذرا الٹا لٹکا دو۔“

احمد خان نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر باندھی اور پانچ لکڑی کے ٹکڑے لپٹا لیے۔ میں ”ام“ سے فرش پر گر پڑا۔ اس کا دوسرا ایک چوٹی میں لگا ہوا تھا۔ احمد دین نے میری ہتھکڑی کھول کر اس کا سر اٹھنے کی کوشش کی اور بہت آہستہ میرے سر پر ہتھکڑی لٹکا دیا۔ اس نے زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر مجھے طعنے کر دیا اور

رک کر دوسرا ایک ایک میں باندھ دیا۔

احمد خان نے اپنی قمیض اتار کے وہاں بھی باندھ دی۔ کوئی پچاس پچاس سے سگریٹ اور سامان کھال کر اطمینان سے دبا رہی کرسی پر بیٹھا اور سگریٹ سلا کر اس کا گہرا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”یاز تمہے مجھے پدم آرہا ہے تو صاحب کی بات مان جا تو فائدہ میں رہے گا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے یوں افسردگی سے سر ہلایا جیسے اسے پہلے پر بہت افسوس ہوا ہو۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، جی، جیسی تیری مرضی، جب تک میں سگریٹ ختم کروں تو کوئی فیصلہ کر لے گا اچھا ہے۔ میں یوں بھی سو رہا تھا لوگ جانتے ہیں کہ جب میں سگریٹ ختم ہوں تو غصہ دگنا ہو جاتا ہے۔“
وہ بکواس کرتا رہا اور میں خاموشی سے ستارہ بامٹھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کا تمام خون میرے سر میں جمع ہو گیا ہو اور ابھی خود بخود ہی میرے کانوں اور ناک سے ٹپکنے لگا۔
احمد خان نے سگریٹ ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا چہرہ میرے نزدیک آ کر بولا۔ ”میں تجھ سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ ہاں یا نہیں؟“
”نہیں.....“ میں نے کہا۔

اس نے زانٹے سے میرے چہرے پر چھڑرید کر دیا۔ میں پینڈولم کی طرح جمبول ہوا کرے کے دوسرے سر کے طرف کیا اور دوبارہ آیتو پھر اس نے مجھے زوردار پھڑرید کر دیا۔
وہ شاید مجھے پندرہ منٹ تک جھلاتا رہا اور پھڑرہا رہا۔ میرے دونوں کان سن ہو کر رہ گئے تھے۔ کانوں میں ساکن سا مٹی اور تھوڑی سی اور شاید میری ناک سے خون بھی بہنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چہرے سے زہن پر جو کچھ گرا رہا ہے وہ وہینہ ہے یا خون؟
جب احمد خان نے دیکھا کہ میں اس کا یہ حربہ برداشت کر گیا ہوں تو اس نے احمد دین کو حکم دیا کہ اسے کھول

33۔
مجھ سے کہ بل کڑا ہونے کا تجربہ تھا۔ میں روزانہ صبح آدھے گھنٹے تک سر کے بل کڑا ہوتا تھا پھر چونک کے لیے نکل جاتا تھا۔ شام کو باقاعدگی سے جم جاتا تھا اس لیے مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن اتنی جتنی مونی چینی کسی عام آدمی کو ہوتی۔

میں ٹریش پر بیٹھا تو زان سے برقرار نہ رکھ سکا اور اندھے منہ کر گیا۔ احمد دین نے میرے پاؤں کھولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اب تو وہ میرے ہاتھ بھی پٹ پٹ رہے جا کر باندھ رہا تھا۔
میرے ہاتھ باندھنے کے بعد احمد خان نے ایک بائی آٹھائی اور میرے سر پر اوٹھادی۔ بائی کے کنارے میرے شانوں پر تک گئے۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں زوردار دھماکہ ہوا جس کی میری طرح اچھل پڑا اور ایک دھماکہ ہوا تو میری سمجھ میں آیا کہ احمد خان یا احمد دین باہر سے بائی پر کسی عسکری چیز یا ڈبے سے خریش لگا رہے تھے۔ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ جیسے گد باندھنا میں ہمیشہ کے لیے بہرہ ہو جاؤں گا.....

”ہاں، ہمیں اب تجھے کوئی عقل آئی؟“ احمد خان نے کہا۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا جو میری نظروں میں وہندلار ہوا تھا پھر اذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔
مجھے دوبارہ ہوش آیا تو احمد خان موت کے فرشتے کی طرح کمرے میں موجود تھا۔ اب اسپیکٹر بھی وہاں آ گیا تھا۔

”اسے تجھے پر باندھ دو.....“ سب اسپیکر غرا کر بولا۔ ”جب میں اس کے جسم پر جگہ جگہ کرے گا کہ اس پہ تنک چمک چمک کر تو اس کی ساری خوداری تک کرے سے نکل جائے گی۔“

احمد خان نے مجھے بلے اور تکی ایک میز پر باندھ دیا۔ اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا کہ میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”غصہ دھا احمد خان.....“ سب اسپیکر نے کہا۔ ”پہلے اس کے جسم سے کپڑے اتار لو۔“

احمد خان نے دوبارہ مجھے کھولا اور ٹکوں میں مجھے بازو اور ہتھکڑیاں جسم سے کپڑے اتارنے ہی میرا سارا اعصاب چکر ہو گیا۔ کسی کی عزت نفس پر حملہ کرنے کا سب سے خوفناک طریقہ یہ ہے کہ اسے بے لباس کر دیا جائے۔
اس نے مجھے اسی حالت میں باندھ دیا۔

”ارے جان تو خوب بنارہی ہے تو نے؟“ سب اسپیکر نے کہا۔

”یہ جان میں نے اپنی حلال کی روزی سے بنائی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تیری طرح رشوت لے کر اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاکو ڈال کر اپنے پیٹ کا دوزخ بن کر رہا ہے۔“

مجھے اس وقت مملکت سے کام لینا چاہیے تھا لیکن بے لباس ہونے کے بعد مجھے اپنے ذہن پر بھی اتنی نہیں رہا تھا۔ میں جو کہ موٹیج پر تھا اسے نہ رانا بھی کر رہا تھا۔

احمد دین نے وہاں رہی ہوئی میز سے ایک استراٹھا اور ایس آئی کوڈے دیا۔ اس نے استرے میں نیلا بیڈ فٹ کیا اور اس سے میرے سینے پر لٹکا سا جگہ لگا دیا۔ میرے سینے سے پیٹ تک کراس کی شکل میں ایک گلیہ سرخ گئی۔ دوسری گلیہ سرخ کراس نے ضرب لگا کر نشان بنادیا۔ تیسری گلیہ اس نے میرے سینے سے پیٹ تک کی طرف تھپتی تھی اور احمد خان سے بولا۔ ”اب ذرا اس کے زخموں پر تنک چمک چمک.....“

اچانک احمد خان نے میرے زخموں پر تنک چمک دیا۔ میرے حلق سے بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے زعفران تنک چمک بھگد بھگد دھا اس تنک کو تھکوں سے تل بھی رہا تھا۔

”بولو.....“ سب اسپیکر نے کہا۔ ”سب اب کی آفر قبول کرتے ہو یا نہیں؟“

میں ٹھٹھا حال سا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پر جکا ہوا پوچھ رہا تھا..... ”صاحب کی آفر.....“

میں نے اچانک اس کے منہ پر تھوک دیا۔

جواب میں اس نے میرے منہ پر زوردار پھڑرید مار لیکن اس نے میرے چہرے پر اتنے تھپڑ مارے تھے کہ میرے دونوں کان سن ہو گئے تھے۔

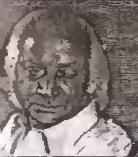
”اب میں تیرے جسم کے نیچے سے پرچے لگاؤں گا اور وہ غم اتنے گہرے ہوں گے کہ تو چیخ چیخ کر صاحب کی آفر قبول کرنے کا وعدہ کرے گا۔“

اس نے استرے میں ایک نیلا بیڈ لٹ کیا اور اس پر لٹا کر بائیں طرف بڑھا۔

یہ تجسس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

آب انہیں ڈھونڈ



میرا شہر ان دنوں پھر بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ لوڈ شیڈنگ کے بہانے شہریوں کو گھنٹوں اور بعض علاقوں میں دنوں عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اس نام نہاد ”لوڈ شیڈنگ“ میں عام آدمی بیس کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کراچی کے مختلف پارک اور کھیلوں کے میدان رات رات بھر سرج لائٹس کی خیرہ کن روشنیوں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں نہ صرف رات بھر جلتی رہتی ہیں بلکہ سارا سارا دن لاکھوں بلب روشن رہتے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹس کا بھی یہی حال ہے۔ شادی ہال اور لان بعد نور بنے رہتے ہیں۔ کوئی تقریب ہو یا نہ ہو آرائشی جہازیں اور تیز روشنیاں عام آدمی کو احساس کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ پھول بیچنے والوں کے چھوٹے چھوٹے کیمپوں میں ہزار ہزار وائٹ کے کئی کئی بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے دکاندار عموماً کے ای ایس سی کی ٹی بجٹ سے ناجائز کنکشن لیتے ہیں پھر کراچی کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں پوری پوری بستیوں میں کنڈ اسٹم کا نظام رائج ہے اور یہ کے ای ایس سی کے بدعنوان اہلکاروں کی ٹی بجٹ سے چل رہا ہے۔

ریڈیو ٹی وی اور ذرائع ابلاغ پر توانائی بچانے کی مہم پر کروڑوں روپے صرف کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ اُلٹے ٹٹلے ہیں۔ آخر توانائی کا یہ بحران صرف عام آدمی ہی کے لیے کیوں ہے؟ ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف وہ علاقے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہزاروں طالب علم محض اس وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ رات میں کام کرنے والے بیشتر افراد روزی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مگر یہ اور جس کی شدت سے بے شمار مریض جاں کنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ صورت حال کی اس سنگینی کا ذمے دار کون ہے؟ کے ای ایس سی کے بڑوں سے یہ سوال کون کرے کہ لوڈ شیڈنگ کا اثر مخصوص علاقے پر کیوں نہیں پڑتا؟ بجلی کی شکایات کے مراکز بھی موجود ہیں مگر ان کے فونز ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ متعلقہ افراد فون کا ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔ کسی ستم طریقے ہے کہ اس بین الاقوامی شہر میں جہاں چھوٹے بڑے اداروں کے پاس بھی بجلی فون کی بیس بیس لائٹیں ہیں وہاں ایک اہم ادارے کے پاس صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شکایت لکھانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے ٹرٹھایا جاتا ہے اور ایسے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے کہ جب کے ای ایس سی والوں کا ”ادور ٹائم“ بن سکے۔ نفسیاتی کے اس دور میں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے۔ یہاں ہر کام وعدہ فردا پر مال دیا جاتا ہے اور عام آدمی سوچا رہا جاتا ہے کہ آئے عشاق، مجھے وعدہ فردا لے کر آؤں گے۔

آب انہیں ڈھونڈ چرائی زرخ زیا لے کر

سہ ماہی ٹائمز نے 1994ء میں ”ڈیٹیرا“ لکھی کہانیاں لکھیں کہ ان کے لیے تیار کیا تھا۔ ذرا سچے گلیہ لایے آج کے درکاروں کا نہیں ہے۔